JAF & CO.
Plot # 43/4, Q-2, Block-B
PECHS Near Jheel Park
Karachi

شہلا

(ایک معاشرتی ناول)

رئیس احمد جعفری

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
چوک انار کلی لاہور

—— "جس روز سے تم گئے ہو وہ باہر نہیں نکلیں، کھانا چھوٹ گیا ہے، ہنسنا بھول گئیں، ہر وقت آہیں، ہر وقت رونا، وہ پھول سا چہرہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا، وہ حسن کی مورت خاک میں مل گئی"، ——

شہلا

(ناول)

زخمِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت : چہارم ۱۹۶۸ء

قیمت : ۲۵ روپے

باہتمام شیخ نیاز احمد پرنٹر

علمی پرنٹنگ پریس ۲۱ ہسپتال روڈ لاہور میں چھپا

مقامِ اشاعت

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

ادبی مارکیٹ چوک انارکلی لاہور

انتساب !

—— اپنے دوست اور بھائی - !

عبدالحمید انصاری مالک روزنامہ "انقلاب"

بمبئی کے نام —— !

جن کے خلوص، اصول پروری اور دوست

نوازی کو میں زندگی بھر نہ بھول سکوں گا !

•

کوئی امید بر نہیں آتی

کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی

کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی

موت آتی ہے پر نہیں آتی ، !

•

•

"—— ایک اخبار میں آپ کا ذکر پڑھا آپ کی شادی
کا ذکر، آپ کی زندگی کے نئے دور کا ذکر ——
آپ دیکھتے ہیں تا میرا سانس اکھڑ چکا ہے کیا مرنے
سے پہلے معافی کے دو بول میرے کان سن سکیں گے؟
—— کیا آپ مایوس کر دیں گے مجھے؟"

•

غمِ بے چارگی

اے برق تڑپنے میں ہمیں ہیں ترے ساتھی
اے ابر ترے ساتھ جو گریاں ہیں تو ہم ہیں

(۱)

وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ کس شہر کا رہنے والا ہے؟ کس لیے فرید پور میں اس نے اقامت اختیار کی؟ یہ وہ سوالات تھے جن کا جواب ندیم کے وسیع حلقۂ احباب میں کسی کے پاس نہیں تھا،

وہ ایک مسافر کی طرح فرید پور آیا، ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا، ایک روز اخبار میں رابن کمپنی کی طرف سے منیجر کی ضرورت کا اشتہار شائع ہوا، فوراً ایک درخواست ٹائپ کی اور بھیج دی، ہفتہ بھر بعد انٹرویو کا خط آگیا، مسٹر ایڈورڈ، کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر تھے، تمام امیدواروں میں ندیم ہی پر ان کی نظر انتخاب پڑی، اعلان کردہ تنخواہ سے زیادہ پر اس کا تقرر عمل میں آگیا، منیجر کی کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے اپنے اخلاق، ملنساری، برتاؤ اور حسن سلوک سے نہ صرف سارے دفتر کو مسحور کر لیا بلکہ شہر کے کاروباری، صنعتی، اور اونچے طبقہ کو بھی گرویدہ کر لیا، وہ محفل سونی تھی جس میں ندیم نہ ہو، کسی روز کلب میں وہ اگر دیر سے پہنچتا، تو سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی، شہر میں کوئی تقریب ہو، مجلس ہو، مشاعرہ ہو، جلسہ ہو، اجتماع ہو، ممکن نہ تھا کہ ندیم کو اصرار اور خلوص کے ساتھ دعوت نہ دی جاتی۔ بہت مختصر مدت میں، فرید پور جیسے صنعتی اور کاروباری شہر کے نمایاں اور ممتاز افراد میں شمار ہونے لگا، اس کے حلقۂ احباب میں جہاں سیٹھ اور ساہوکار تھے وہاں حکام

اور عمائد شہر بھی تھے. جہاں پہنچ جانا ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا. سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا، مسٹر ایڈورڈ کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کمپنی کے سیاہ و سفید کا ندیم کو مالک بنا دیا تھا، ان کا کام صرف اہم ترین کاغذات پر دستخط کرنا تھا. ورنہ سارے کام ندیم ہی سرانجام دیتا تھا، وہ بہت خوش تھے کہ ندیم کی صورت میں انھیں قوت بازو میسر آ گیا ہے جس نے سارا بوجھ اپنے دوش ناتواں پر اٹھا لیا ہے، پہلے وہ زیادہ تر فرید پور ہی میں رہتے تھے، اب جب چاہتے لندن پرواز کر جاتے اور مہینوں آنے کا نام نہ لیتے، کیا مجال ہے اس کے فیصلہ میں ایڈورڈ صاحب نے کبھی ردو بدل کیا ہو۔

ندیم اپنے دفتر میں میز پہ جھکا کام کر رہا تھا کہ دروازہ کھول کر مسٹر ایڈورڈ نے جھانکا اور وہیں کھڑے کھڑے پوچھا،

"مسٹر ندیم کیا میں آ سکتا ہوں ؟"

ندیم اٹھ کھڑا ہوا.

"تشریف لائیے مسٹر ایڈورڈ، !"

مسٹر ایڈورڈ تشریف لائے اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے، کہنے لگے۔

"مسٹر ندیم آپ مجھ سے دو تین مرتبہ اسٹینو ٹائپسٹ کے لیے کہہ چکے ہیں ......

ندیم نے فوراً کہا،

جی ہاں مسٹر ایڈورڈ میں نے آپ سے کئی مرتبہ کہا ہے، مگر آپ نے توجہ نہ کی۔

——— مسٹر ایڈورڈ نے مسکراتے ہوئے ایک موٹا سا سگار نکالا اور اس کی نوک کھرچتے ہوئے کہا،

"میں نے آپ کے لیے اسٹینو ٹائپسٹ کا انتظام کر دیا ہے، مجھے اُمید ہے مس شہلا آپ کو بھی میری طرح اپنی مستعدی اور فرض شناسی سے خوش رکھیں گی، ———"

مس شہلا کا نام سنکر ندیم کے چہرے کا رنگ بدل گیا، ناگواری کی ایک لہر سی اٹھتی

ہوئی محسوس ہوئی، لیکن بہت جلد اپنی اس کیفیت پر وہ غالب آگیا۔

مسٹر ایڈورڈ وہ تو آپ کی ————

مسٹر ایڈورڈ نے بات نہ پوری ہونے دی۔

"جی ہاں بات یہ ہے کہ میری اسٹینو ٹائپسٹ مس کیتھرائن تھیں، وہ چھٹی پر اپنے لنبا گور باپ کی تیمار داری کے لیے گئی تھیں، اب چونکہ بیچارے کا انتقال ہو چکا ہے، لہٰذا واپس آرہی ہیں، وہ بہر حال مستقل ملازم ہیں انہیں جواب نہیں دیا جا سکتا، مس شہلا کا تقرر عارضی تھا، انہیں اب سبکدوش ہونا پڑے گا ————

ندیم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا،

جی ہاں پھر مجبوری ہے انھیں سبکدوش کر دیں، بس ————

مسٹر ایڈورڈ نے غور سے ندیم کی طرف دیکھا اور کہا،

مسٹر ندیم اتنے بے درد نہ بنیے، اتنی شریف، محنتی، کارگذار، فرض شناس، اور ذہین لڑکی کو سبکدوش کرتے میرا دل کڑھتا ہے۔ آپ کو بہر حال ایک اسٹینو ٹائپسٹ کی ضرورت ہے، کیوں نہ آپ اس سے کام لیں؟ ایک مستحق امداد لڑکی بے روزگار ہونے سے بچ جائے گی، اور آپ کی ضرورت رفع ہو جائے گی۔!"

ایڈورڈ کے ان الفاظ میں اپیل بھی تھی اور اصرار بھی، ندیم کو خاموش ہو جانا پڑا،

"اچھا مسٹر ایڈورڈ جو آپ کہتے ہیں وہی سہی۔"

ایڈورڈ نے سگار کا ایک کش لیا۔ اور اُٹھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ مسٹر ندیم، ———— مجھے اُمید ہے شہلا آپ کو کبھی، کسی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔!"

پھر دفعتہً جیسے کچھ یاد آگیا۔ انھوں نے پوچھا،

"مسٹر ندیم آپ کو شہلا سے کوئی شکایت تو نہیں ہے؟"

ندیم نے بے پرواہی سے کہا۔

"جی نہیں، میری تو ان سے کبھی گفتگو بھی نہیں ہوئی۔!"

ایڈمنڈ نے جاتے ہوئے کہا،

"تو پھر کل سے مس شہلا آپ کے آفس میں آجائیں گی۔!"

ایڈمنڈ کے جانے کے بعد ندیم پھر اپنے کام میں لگ گیا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے فائل ایک طرف کھسکا دیا، جیب سے سگریٹ کیس نکالا، اور کرسی پر ٹیک لگا کر سگریٹ سلگایا، پھر دھوئیں کے چھلے بنا بنا کر چھوڑنے لگا، معلوم ہو رہا تھا کوئی اہم مسئلہ زیر غور ہے۔!

(۲)

دوسرے روز ندیم دفتر پہنچا، شہلا پہلے سے آچکی تھی، ندیم کو آتا دیکھ کر وہ کھڑی ہوگئی، اور زیر لب تبسّم کے ساتھ گردن کو ذراسی جنبش دے کر گویا سلام کیا، ندیم کی تیوریاں چڑھ گئیں، اس نے بھی گردن ہلادی، لیکن ہونٹ تبسم سے آشنا نہ ہوسکے، گردن جھکائے ہوئے اپنے دفتر میں گیا اور کرسی پر بیٹھ گیا،

ذرا دیر کے بعد شہلا پنسل اور کاپی لے کر پہنچی اور سامنے جاکر کھڑی ہوگئی، ندیم میز پر جھکا کوئی فائل دیکھ رہا تھا، اس نے توجہ بھی نہیں کی، تقریباً پندرہ منٹ کے بعد فائل سے فراغت پانے کے بعد اس نے گردن اٹھائی، شہلا کے سراپا پر ایک نظر ڈالی اور کہا،

"فرمائیے مس شہلا، !" ——— میں نے تو آپ کو نہیں بلایا تھا، ! "

وہ کچھ جھینپ سی گئی، اس نے کہا۔

"میں اس لیے حاضر ہوئی تھی کہ شاید آپ کو کچھ خطوط لکھوانا ہوں، ! "

ندیم نے دوسری فائل اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا،

"اگر ضرورت ہوئی تو میں آپ کو ضرور تکلیف دوں گا، ! "

شہلا پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا وہ خاموشی کے ساتھ آکر آفس سے ملحق کیبن میں ٹائپ رائٹر کے پاس کاپی اور پنسل پھینک کر بیٹھ گئی، اس کی آنکھیں پرنم تھیں، چہرہ زرد، لیکن جلد ہی اس کیفیت پر غالب آگئی اور ایک انگریزی رسالہ دیکھنے لگی،

بظاہر وہ رسالہ کا کوئی مضمون پڑھ رہی تھی مگر درحقیقت وہ اس نئی صورت حال پر غور کر

سبک دوش کر دیتے تو میں کہاں جاتی ؟ کیا کرتی ؟ یہ ڈھائی سو روپے جو ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو مل جاتے ہیں، جن سے میری بوڑھی اور بیمار بیوہ ماں، اپنا علاج، اور میرا اور میرے چھوٹے بہن بھائی کا پیٹ پالتی ہے، پھر کہاں ملیں گے ؟

کیا پھر مجھے در در کی ٹھوکریں کھانا پڑیں گی ؟

کیا پھر میری ماں دوا کو ترسے گی ؟ میری بہن فاقہ کرے گی ؟ میرا بھائی بھوک سے روتے گا ؟ بلبلائے گا ؟

آہ ! ـــــــ نہیں، یہ جگر گداز منظر اب مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا، کیا ہوا، اگر ندیم وہ جب مجھے ذلیل سمجھتے ہیں، میری توہین کرتے ہیں، بہر حال میں کمپنی کی ملازم اور ان کی ماتحت ہوں افسر کبھی خوش مزاج ہوتا ہے، جیسے ایڈورڈ، کبھی بد مزاج ہوتا ہے، جیسے مسٹر ندیم، ماتحت کو سب کے ساتھ گذر کرنا پڑتا ہے میں بھی یہی کروں گی، ایڈورڈ صاحب کی ماتحتی میں سکون و اطمینان کے جو دن گذر گئے، وہ اب افسانۂ ماضی بن چکے ہیں، ندیم صاحب کی ماتحتی میں ان خوشگوار دنوں کی مجھے قیمت ادا کرنی ہے، ابتلا اور آزمائش کے یہ دن بھی مجھے اسی طرح بسر کرنے چاہئیں جس طرح ـــــــ

اتنے میں گھنٹی بجی، وہ جلدی سے کاپی اور پنسل لے کر اٹھی، اور پھر ندیم کے کمرہ میں پہنچ گئی۔

ندیم نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا،

بیٹھ جائیے، مجھے کچھ خطوط لکھوانے ہیں !

وہ ندیم کی طرف دیکھے بغیر کرسی پر بیٹھ گئی، پنسل ہاتھ میں تھی، کھلی ہوئی کاپی سامنے، نظر میز پر،

ندیم نے کئی خط لکھوائے، وہ شارٹ ہینڈ میں لکھتی رہی،

آٹھ دس خط لکھوا چکنے کے بعد ندیم نے کہا،

رہی تھی جس سے آج پہلی مرتبہ اسے دوچار ہونا پڑا تھا،

وہ سوچ رہی تھی،

مسٹر ایڈورڈ، اور مسٹر ندیم میں کتنا زبردست فرق ہے، کہاں ایڈورڈ صاحب کا تپاک،

اخلاق، شرافت، کہاں ندیم صاحب کی سرد مہری، بد اخلاقی اور بیہودہ طرز عمل،!

ایڈورڈ سے اور دفتر کے دوسرے لوگوں سے تو میں نے ندیم صاحب کے اخلاق، شرافت

ہمدردی، ملنساریت اور انسانیت کی بڑی تعریف سنی تھی، کوئی انھیں انسان کے روپ میں فرشتہ

کہتا تھا۔ کسی کے خیال میں وہ اخلاق کا پیکر ہیں، لیکن اگر انسان نما فرشتے اور اخلاق کے پیکر ایسے ہی

ہوتے ہیں تو پھر نہ اخلاق کی میرے دل میں قدر رہے گی نہ فرشتوں کی!!

یہ شخص تو اتنا بدتمیز ہے کہ یہ بھی نہیں جانتا عورتوں سے گفتگو کس طرح کی جاتی ہے؟

جو شخص عورت کا احترام نہیں کر سکتا، کیا وہ خود کسی احترام کا مستحق ہو سکتا ہے؟ عورت

کے کتنے روپ ہیں؛ ماں، بہن، لڑکی، بیوی، اور ہر روپ میں، وہ اپنی مثال نہیں رکھتی، رحمت

خداوندی کی جھلک ماں کی ممتا ہی میں مل سکتی ہے۔ بہن سے بڑھ کر بھائی پر نثار کون ہو سکتا ہے؟

لڑکوں کے مقابلہ میں بیچاری لڑکیوں کو ماں باپ تنکا بھی نہیں پوچھتے، پھر بھی وہ ماں باپ پر قربان

ہوتی رہتی ہیں، اور بیوی؟ کیا اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے، بیوی سے بھی بڑھ کر

بے غرض، خدمت گزار اور سراپا ایثار ہستی کوئی ہو سکتی ہے؟ شوہر بدصورت ہو، بدمزاج ہو،

آوارہ ہو، فضول خرچ ہو، ظالم ہو، بدخو ہو، بیوی ہر حالت میں وفادار رہتی ہے، اسے بیمار

نہیں دیکھ سکتی، اس کی ہر مصیبت اپنے اوپر لینے کے لئے تیار رہتی ہے، دق میں مبتلا ہو کر

مرجاتی ہے مگر اف نہیں کرتی، ———— کیا یہ شخص ماں کی ممتا، بہن کی محبت،

بیوی کی وفاداری ہر چیز کا منکر ہے؟

کیا نہ اس کی ماں ہے؟ نہ بہن نہ بیوی ——؟

بہتر ہوتا کہ ایڈورڈ صاحب مجھے سبکدوش کر دیتے، ———— لیکن نہیں

"بس آج اتنا کافی ہے، ——— کیا آپ آج ہی انہیں ٹائپ کر سکیں گی،!؟"
شہلا نے کاپی بند کر کے رکھتے ہوئے کہا،

"جی ہاں ابھی کر دوں گی،!"

پھر وہ خاموش اٹھ کر اپنے کیبن میں چلی گئی، اور ٹائپ رائٹر پر بجلی کی طرح اس کی انگلیاں دوڑنے لگیں، کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد، ٹائپ شدہ خطوط لے کر وہ پھر ندیم کے سامنے پہنچی وہ کسی فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا، شہلا نے وہ خطوط اس کے سامنے رکھ کر پیپر ویٹ سے دبا دیے، اور کچھ کہے بغیر آکر پھر اپنے کیبن میں بیٹھ گئی، اور اسی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر گھنٹی بجی، شہلا نے رسالہ اسی طرح چھوڑا، اور ندیم کے کمرہ میں پہنچ گئی،

"میں نے دستخط کر دیے ہیں انہیں آج ہی ڈاک سے بھجوا دیں،!"

شہلا نے منہ سے کچھ نہ کہا، خطوط سمیٹے، اور کیبن میں آکر پہلے رجسٹر میں ان کا اندراج کیا، پھر ٹکٹ چسپاں کر کے چپراسی کو دیے کہ لیٹر بکس میں ڈال آئے،!

(۳)

شہلا کو ندیم کی ماتحتی میں کام کرتے تین مہینہ کی مدت گزر چکی تھی، اس عرصہ میں دونوں کے درمیان دفتری اور منصبی باتوں کے علاوہ کسی قسم کی بات چیت نہیں ہوئی، اور شہلا نے تو اپنی طرف سے کوئی بات کی ہی نہیں، ٹھیک وقت پر دفتر پہنچ جاتی، اور اپنے کام میں لگ جاتی، فرصت کے اوقات میں، مس کیتھرائن اور دوسری ٹائپسٹ لڑکیاں کینٹین میں جاکر چائے پیتیں، کیک، پیسٹری سے شغل کرتیں، قہقہے لگاتیں، دنیا جہاں کے واقعات پر تبصرے کرتیں، دفتر کے لوگوں پر نکتہ چینیاں اور مختلف قسم کے ریمارک کرتیں، لیکن شہلا اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرتی، کچھ اس لیے کہ وہ طبعاً غوغا آرائیوں کو ناپسند کرتی تھی اور زیادہ تر اس لیے کہ اپنے کیبن سے باہر جائے، اور ندیم صاحب یاد کرلیں اور موجود نہ پاکر، پھر کوئی کڑوی کسیلی بات کہہ دیں، اپنی عزت اپنے ہاتھ، وہ اس کا موقع ہی نہیں دینا چاہتی تھی کہ ندیم کو اس پر نکتہ چینی یا اعتراض کا موقع ملے، لہٰذا فرصت کے لمحات بھی کیبن میں بیٹھ کر کسی کتاب یا رسالہ کے مطالعہ میں گزار دیتی۔

ایڈورڈ صاحب گرمی کا موسم گزارنے لندن تشریف لے گئے تھے، اور اب ندیم بالکل کمپنی کے سیاہ و سفید کا مالک تھا، ایک روز جب دفتر بند ہونے کا وقت ہوا تو شہلا بعض کاغذات پر دستخط لینے کے لیے ندیم کے کمرہ میں پہنچی، وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے میز پر جھکا ہوا تھا، شہلا کے پاؤں کی چاپ سنکر اس نے سر اٹھایا، تو چہرہ سرخ ہو رہا تھا، یہ کیفیت دیکھ کر شہلا پریشان ہوگئی۔

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا،

"کیا آپ بیمار ہیں کچھ ؟"

ندیم نے ماتھا سکوڑ کر کہا،

"مس شہلا میں غیر ضروری باتیں سخت ناپسند کرتا ہوں، ——— لایئے کاغذات، !"

شہلا کا منہ فق ہو گیا، اس نے پھر اپنی نظروں میں اپنے آپ کو ذلیل محسوس کیا، چپ چاپ کاغذات اس کے سامنے رکھ دیئے، سرسری نظر ڈال کر، اس نے دستخط کر دیئے، شہلا کاغذات سمیٹ کر پھر اپنے کیبن میں چلی گئی، شرمندہ، اور ملول واپس آ گئی، بڑی دیر تک وہ کاغذات اس کے سامنے پڑے رہے، نہ وہ انہیں لفافوں میں بند کر سکی، نہ فائل میں لگا سکی، بار بار اسے اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا، وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہی تھی کہ آخر میری کیا شامت آئی تھی، جو میں پوچھ بیٹھی، آپ بیمار تو نہیں ہیں کچھ؟ کوئی بیمار ہو یا تندرست، مجھے پوچھ گچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

——— گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

تھوڑی دیر کے بعد جب ہیجان ذرا کم ہوا تو اس نے کاغذات ٹھیک کرنے شروع کیے، اب کام ختم ہو چکا تھا، لیکن وہ بیٹھی رہی کہ شاید ندیم صاحب کو پھر کوئی کام یاد آ جائے، اور وہ طلب فرمائیں، کوئی آدھے گھنٹہ کے بعد، ندیم برآمد ہوا۔ اس کا چہرہ اب بھی تمتمایا ہوا تھا، پاؤں بھی کسی حد تک لڑکھڑا رہے تھے، لیکن آہستہ آہستہ قدم رکھتا وہ نیچے اتر گیا، اس کے جانے کے بعد شہلا نے بھی کاغذات سنبھالے، الماری بند کی، قفل لگایا اور اپنے گھر چلی گئی۔!

دوسرے روز حسبِ معمول شہلا وقتِ مقررہ پر پہنچ گئی، لیکن ندیم نہیں نظر آیا، حالانکہ وقت کی پابندی میں شہلا سے وہ کسی طرح کم نہ تھا، شہلا کو تعجب تو ہُوا، لیکن اس نے زیادہ پروا نہ کی، آج کے کام کی جو لسٹ اس کے پاس تھی، اس کے مطابق وہ مصروف ہوگئی،

بارہ بجے کے قریب گیتھرائن پہونچی، اس نے کہا۔

شہلا ہم چائے پئیں گے۔!

شہلا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا،

ضرور پیو، بلکہ میری طرف سے بھی دو پیالیاں پی لینا،

کیتھرائن نے اسے شوخ نظروں سے دیکھا اور کہا،

پیسٹری بھی کھائیں گے،

شہلا نے اسی لب و لہجہ میں کہا،

ہاں بھئی، بغیر پیسٹری کے چائے کا لطف کیا۔

کیتھرائن اٹھ کھڑی ہوئی اور شہلا کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی،

تو آؤ چلیں پھر،

شہلا نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے اسی طرح بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

نہیں بھئی نہ مجھے چائے کا شوق ہے نہ پیسٹری کا!

کیتھرائن نے انگلیوں پر اپنی پرس کو نچاتے ہوئے کہا،

کنجوس بیگم بل میں ادا کر دوں گی چلو، !،

شہلا ہنسنے لگی،

نوشیرواں بیگم، اس سخاوت اور دریا دلی کا بہت بہت شکریہ، لیکن میں نہیں جاؤں گی، !

کیتھرائن پھر اس کے پاس بیٹھ گئی اور تیکھے لہجہ میں پوچھا،

کیوں نہیں چلو گی ؟ ہمارے کہنے سے بھی نہیں ؟ ،

شہلا نے بے بسی کے ساتھ کہا،

" نہیں بھئی مجھے معاف کرو، تم ندیم صاحب کو نہیں جانتیں، بڑے اکھڑ مزاج کے آدمی ہیں، وہ آگئے اور میں سیٹ پر نہ ملی، تو خواہ مخواہ ناشائستہ الفاظ سننا پڑیں گے مجھے، !،

کیتھرائن شہلا سے اور قریب ہوتی ہوئی بولی،

تم تو ندیم صاحب کا اس طرح ذکر کر رہی ہو جیسے وہ کوئی ہوّا ہیں، حالانکہ میں نے تو ان کے اخلاق اور شرافت و انسانیت کا ہر شخص کو مداح پایا ہے، مسٹر ایڈورڈ تو جب ندیم صاحب کا نام لیتے ہیں تو باچھیں کھل جاتی ہیں، خود مجھے تو ان سے بات چیت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، ضرورت ہی نہیں پیش آئی کبھی، لیکن میرے سامنے وہ کئی مرتبہ ایڈورڈ صاحب کے پاس آئے اور گھنٹوں بیٹھے، میں نے تو ہر مرتبہ ایسا محسوس کیا جیسے بڑے باغ و بہار آدمی ہیں، لیکن تم کہتی ہو اکھڑ ہیں، ———

شہلا نے ٹوکا،

" صرف اکھڑ ہی نہیں، بدتمیز اور غیر مہذب بھی، ——— کم از کم میں نے یہی محسوس کیا ہے ؟ "

کیتھرائن دانتوں تلے انگلی دباتی ہوئی بولی،

" حیرت ہے، ——— تمہارے ساتھ کیسی سنگ دلی سے تنگ دل آدمی

کا بھی یہ رویّہ نہیں ہونا چاہیے۔!"

شہلا نے مسکراتے ہوئے اور چھیڑتے ہوئے کہا،

"کیوں، ؟ ——— کیا میں کیتھرائن ہوں ؟"

کیتھرائن ہنسنے لگی،

"کاش کیتھرائن تم جیسی ہوتی! ——— لیکن شہلا سچ کہنا ندیم کیسا آدمی ہے ؟"

شہلا اسے تیکھی نظروں سے دیکھتی ہوئی گویا ہوئی،

"اتنا کچھ سننے کے بعد بھی پوچھ رہی ہو ندیم کیسا آدمی ہے'! "

کیتھرائن نے اپنے سونے کے سے بالوں کو جھٹکتے ہوئے کہا،

"بڑی بے وقوف ہو، میرے سوال کا جواب کچھ اور ہے'! ——— میرا مطلب یہ ہے کہ، ندیم صاحب کیسے آدمی ہیں، ———"

شہلا کھلکھلا کر ہنس پڑی،

"برے، بہت برے، بد تہذیب، گنوار، اجڈ، وحشی، ——— اور سننا چاہتی ہو ان کی تعریف میں کچھ ؟" ——— آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے، ایک ہی بات بار بار پوچھے جا رہی ہو ؟"

کیتھرائن نے بے بسی کے ساتھ کہا،

"شہلا میرا مطلب سمجھو! ———"

"میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں، کیا ندیم صاحب خوب صورت نہیں ہیں ؟"

شہلا نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا،

"ہوں گے، ——— ممکن ہے ہوں، ممکن ہے نہ ہوں، نہ میں نے اس مسئلہ پر کبھی غور کیا، نہ آئندہ اس سلسلہ میں وقت ضایع کرنے کا ارادہ ہے، دنیا میں بہت سے لوگ خوب صورت ہیں، خود ہمارے شہر فرید پور میں سیکڑوں یوسف ثانی موجود ہوں گے، لیکن ہمیں کسی

کی خوب صورتی یا بدصورتی سے کیا مطلب؟ ——— ابن مریم ہُوا کرے کوئی''!

کیتھرائن نے ذرا بگڑتے ہُوئے کہا،

"تم بھی، ندیم صاحب سے کچھ کم نہیں ہو"؟"

شہلا نے پوچھا،

"وہ کیسے؟ اس عجیب وغریب انکشاف کا مدعا کیا ہے؟ میں ذرا بھی نہیں سمجھ سکی"!

کیتھرائن نے جھوٹ موٹ کا غصّہ ظاہر کرتے ہُوئے کہا،

"بے وقوف میں پوچھنا چاہتی ہوں کیا وہ خوب صورت نہیں ہے؟ ——— سچ کہتی ہوں ایسا آدمی آج تک میری نظر سے نہیں گزرا"

شہلا ہنس پڑی، پھر اس نے کہا،

"مجھے تم سے ہمدردی ہے"!"

کیتھرائن نے شاعرانہ انداز میں کہا،

"ہوں مجھے تم پر رشک آتا ہے، کاش تمھاری جگہ میں ہوتی!"

شہلا اُٹھ کھڑی ہوئی، اپنی کرسی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی،

"تشریف لایئے، ——— واقعی میں بڑی خوشی سے اس پر تیار ہوں کہ تم میری جگہ کام کرو، اور میں تمھاری جگہ"!"

کیتھرائن جیسے آمادہ ہوگئی، مشورۃً اس نے پوچھا،

"ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟"

شہلا نے بتایا،

"بڑے مزے میں ہو سکتا ہے، میں ایک ہفتہ کی چھٹی لے لیتی ہوں، ایڈورڈ صاحب ہیں نہیں، لہٰذا تم کو کچھ زیادہ کام کرنا نہیں پڑتا، لامحالہ میری جگہ تم طلب کی جاؤ گی، پھر جب ہفتہ بھر بعد میں واپس آؤں تو اتنے عرصہ میں ندیم صاحب کو تم اسیرِ دام کر چکی ہوگی، کہہ دینا میں

یہیں کام کروں گی، ——————

اتنے میں کاغذات کا ایک پلندا لے کر چپراسی حاضر ہوا، اس نے کہا،

"صاحب کو بخار ہے وہ آج نہیں آئیں گے۔ یہ کاغذات ٹائپ کرنے کو بھیجے ہیں،"

یہ نئی بات تھی، لیکن، ندیم سے نئی باتوں کے علاوہ اور توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی،؟ اس کی چیز میں، کس بات میں، کس ادا میں نیا پن نہ تھا؟ وہ جدت کے سوا اور تھا کیا؟

شہلا نے چپ چاپ کاغذات لے لیے اور کام میں لگ گئی،! ٭

---

(۵)

کئی دن گزر گئے، مگر ندیم دفتر نہیں آیا، چپراسی ہر روز شہلا کے ٹائپ کیے ہوئے کاغذات لے جاتا اور دستخط کرا کے لے آتا، نہ شہلا نے کبھی پوچھا کہ صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے، نہ خود اس نے بتایا، وہ وقت مقررہ پہ آتی، اور خاموشی سے اپنے کام میں لگ جاتی،

جمعہ شہر میں کرکٹ میچ تھا، سارا شہر امنڈ پڑا تھا یہ نظارہ پر بہار دیکھنے کے لیے، مسٹر جانسن جو ایڈورڈ صاحب کی قائم مقامی کر رہے تھے، اور ریذیڈنٹ ڈائریکٹر تھے، اتنے جوش میں آئے کہ لنچ کے بعد دفتر میں چھٹی کا حکم صادر فرما دیا، جسے تالیوں کی گونج میں دفتر کے لوگوں نے سنا، اور ہنستے قہقہے لگاتے رخصت ہو گئے۔

شہلا بدستور اپنی سیٹ پر بیٹھی ٹائپ کر رہی تھی کہ کیتھرائن آئی، بڑی جلدی میں تھی اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے کہا،

"ارے شہلا یہ کیا کھٹ کھٹ لگا رکھی ہے؟ ہر وقت کی کھٹ پٹ سے تمہاری انگلیاں بھی نہیں دکھتیں!"

شہلا نے اسی طرح ٹائپ کرتے کرتے اور نظر کاغذات پہ جمائے ہوئے کہا،

"میری انگلیاں تمہاری انگلیوں کی طرح نازک نہیں ہیں، ——"

کیتھرائن اس وقت بحث کرنے کے موڈ میں نہ تھی، اس نے کہا،

"اچھا نہ سہی، —— چلو میرے ساتھ میچ دیکھیں گے!"

شہلا نے اپنی مصروفیت کو اسی طرح قائم رکھتے ہوئے جواب دیا،

"مجھے پیچ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے"

کیتھرائن ووقتی ہوئی، اندر کیبن میں آگئی، اور بالکل پاس کھڑی ہو کر بولی،

"چلوگی کیسے نہیں؟ چلنا پڑے گا، !"

شہلا نے ذرا کے ذرا نظر اٹھائی، ——— اور ٹائپ پر اس طرح انگلیاں مارنے لگی جیسے کوئی پرندہ اڑنے کو تیار ہو، بڑی بے بسی کے ساتھ کہا،

"نہیں کیتھرائن ضد نہیں کرنے، تم جاؤ، دیکھو یہ ڈھیر دکھا ہے کاغذات کا میرے سامنے، اور صاحب بہادر کا فرمان صادر ہوا ہے کہ یہ سارے کاغذات ٹائپ کر کے آج ہی ان کے ملاحظہ کے لیے بھیج دیے جائیں، جب تک کام نہ ختم ہو جائے میں نہیں اٹھ سکتی۔ تم مسٹر ایڈورڈ اور مسٹر جانسن کے سلوک کی عادی ہو، میں تو اب اس سلوک کو بھول چکی ہوں، میرا پالا تو مسٹر ندیم سے پڑا ہے، اور مسٹر ندیم کیسے ہیں یہ جانتی ہی ہو"

کیتھرائن مسکراتی ہوئی بولی،

"ہمیں تو بڑے اچھے لگتے ہیں !"

شہلا کی انگلیاں پھر ٹائپ پر تیزی سے دوڑنے لگیں،

"مجھے تم سے ہمدردی ہے !"

کیتھرائن کھلکھلا کر ہنس پڑی،

"شکریہ، ——— اچھا شہلا میں جاتی ہوں !"

شہلا نے ٹائپ کرتے کرتے جواب دیا،

"جاؤ، خدا کرے وہی میچ جیتے جس میں تمہارا کوئی پسندیدہ ممبر ہو !"

کیتھرائن ہنستی ہوئی باہر چلی گئی، اور شہلا مسکراتی ہوئی پھر اپنے کام میں پورے انہماک و استغراق کے ساتھ مصروف ہوگئی۔!

چار بجے کے قریب وہ اپنے کام سے فارغ ہوئی، اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ آج ذرا جلدی فراغت ہوگئی، گھر وقت سے پہلے پہنچ جاؤں گی، کاغذات ایک فائل میں لگا کر چپراسی کے حوالے کرنے والی تھی کہ جاکر ندیم صاحب کو دے آئے یکایک فون کی گھنٹی بجنے لگی، اس نے چپراسی سے جو سامنے منتظر کھڑا تھا کہا۔

"دیکھنا تو کون ہے، ؟"

چپراسی گیا، اور پھر فوراً ہی دوڑتا ہوا آیا،

"میم صاحب، بڑا صاحب ——"

شہلا گھبرا گئی،

"بڑا صاحب، ؟ —— یعنی مسٹر ایڈورڈ ——"

چپراسی نے اس پریشان لہجہ میں جواب دیا،

"جی وہی بیگم صاحب، ——"

شہلا اور زیادہ پریشان ہوگئی، اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا،

"کیا ہوا مسٹر ایڈورڈ کو؟"

چپراسی نے اپنے اکھڑے ہوئے سانس کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا،

"وہ فون پر آیا ہے،"

شہلا نے اور زیادہ گھبرا کر دریافت کیا،

"کیا ایڈورڈ صاحب آگئے —— ؟"

چپراسی نے ذرا سنبھلتے ہوئے کہا،

"نہیں وہ لندن سے بول رہا ہے صاحب، !"

شہلا نے کاغذات کا فائل میز پر پھینکا، کہنے لگی،

"بڑے احمق ہو"

پھر تیزی سے وہ دوسرے کمرہ میں چلی گئی،

یہ مسٹر ایڈورڈ کا فون تھا، دونوں میں گفتگو شروع ہو گئی،

"ہلو، میں لندن سے بول رہا ہوں، ایڈورڈ، ——————

"ہلو مسٹر ایڈورڈ، میں شہلا بول رہی ہوں!"

"اوہ مس شہلا، کہیے آپ خیریت سے ہیں، دفتر کے کئی لوگوں نے مجھے خط لکھے، مگر آپ نے بالکل مجھے یاد نہیں کیا"

"نہیں مسٹر ایڈورڈ یہ بات تو نہیں، آپ کے احسانات مجھے زندگی بھر یاد رہیں گے، ——————"

"لیکن خط لکھنے کی فرصت نہیں ملتی" وہ ہنستے ہوئے، کیوں مس شہلا؟"

"جی ہاں آج کل مصروف بہت رہتی ہوں!"

"مجھے آپ سے یہی شکایت ہے کہ آپ کام زیادہ کرتی ہیں! ——————

خدا جانسن کو بھیجئے ——————"

"مسٹر جانسن؟ وہ تو نہیں ہیں"

"کیوں خیریت تو ہے؟"

"آج کرکٹ میچ ہے وہیں تشریف لے گئے ہیں۔ بلکہ دفتر میں بھی چھٹی کر دی ہے ——"

"اوہ، پھر بھی آپ دفتر میں موجود ہیں؟"

"جی ہاں کچھ بہت ضروری قسم کے کاغذات ٹائپ کرنا تھے، بس اب میں بھی جانے والی ہوں، کام ختم ہو گیا سارا!"

"تو مسٹر ندیم بھی کرکٹ اسٹیڈیم میں رونق افروز ہوں گے!"

"جی نہیں ان کی تو کچھ طبیعت ناساز ہے، کئی دن سے دفتر بھی نہیں آرہے، یہاں سے کاغذات بھیج دیے جاتے ہیں، وہ دستخط کر کے واپس کر دیتے ہیں، کوئی ضروری بات ہوتی ہے تو فون پر ہدایت دے دیتے ہیں!"

"لیکن کیا بیمار ہیں ندیم صاحب ؟ یہ تو بتایئے !"

"مسٹر ایڈورڈ یہ تو میں نہیں جانتی !"

"کیا کہا آپ نے ؟ آپ نہیں جانتیں مسٹر ندیم کیا بیمار ہیں ؟"

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے، وہ دفتر میں نہیں آئے کئی روز سے !"

"نہ آپ گئیں ان کی خیریت پوچھنے ؟"

"(تلخی کے ساتھ) جی نہیں، ——— شاید میرے فرائض میں کمپنی کے کسی افسر کی عیادت تو نہیں داخل ہے !"

"(ہنستے ہوئے) نہیں بالکل نہیں مس شہلا آپ خفا تو نہیں ہو گئیں !"

"مسٹر ایڈورڈ ایسی باتیں نہ کیجئے، مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ میرے محسن ہیں، میرے دل میں آپ کی عزت ہے !"

"ہاں مس شہلا، میرے دل میں تمہاری بھی عزت ہے، اور محبت بھی، وہی جو ایک بھائی کو ایک بہن سے ہوتی ہے، تم بڑی نیک اور شریف لڑکی ہو !"

"میں نے آپ کو واقعی ہمیشہ ایسا ہی پایا !"

"(قہقہہ لگاتے ہوئے) بڑی شدید ہوا میرے الفاظ مجھی کو لوٹا دیئے ! ———

——— اچھا تمہیں میرا ایک کام کرنا پڑے گا ———"

"فرمایئے، ضرور کروں گی !"

"ابھی اور اسی وقت !"

"جی ابھی اور اسی وقت !"

"تو دیکھو لڑکی، دفتر سے سیدھی ہوٹل جاؤ، میری طرف سے ندیم کی خیریت پوچھو، وہ بڑا بے پروا، اور لاابالی آدمی ہے، اور اس سے کہو۔ آج رات کو دس بجے مجھے فون کرے۔ اور اگر خدانخواستہ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو خود مجھے فون کر کے ساری تفصیل بتا دینا، شاباش ———"

اور پھر فون کا سلسلہ یک بیک منقطع ہو گیا!

شہلا حیران و پریشان کھڑی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے ؟

ندیم کا جو رویہ اس کے ساتھ اب تک رہا تھا، اس کے پیش نظر وہ کسی طرح اس پر تیار نہیں تھی کہ ہوٹل جا کر ندیم صاحب کی مزاج پرسی اور عیادت کرے، لیکن کیا مسٹر ایڈورڈ کا حکم ٹالا جا سکتا تھا؟ مسٹر ایڈورڈ جو صرف ایک محسن اور شفیق افسر ہی نہیں تھے، جنھوں نے اب ایک نیا رشتہ بھائی بہن کا بھی قائم کر لیا تھا،

وہ سوچنے لگی، اگر میں ندیم صاحب کے پاس نہ جاؤں، یا اگر وہ زیادہ علیل ہوں اور مسٹر ایڈورڈ کو فون پر دس بجے رات تک اطلاع نہ دوں تو ان کی پریشانی کا کیا عالم ہوگا؟ عین ممکن ہے، اپنے سارے پروگرام چھوڑ کر سیٹ بک کرائیں اور پہلے طیارے سے حیدرآباد واپس آجائیں، پھر انہیں کیا منہ دکھاؤں گی؟ کیا جواب دوں گی ؟

شہلا یہی سوچ رہی تھی کہ چپراسی روشن خاں نے کہا،

"لائیے فائل دے دیجیے، صاحب کو دے آؤں، جا کر وہ انتظار کر رہے ہوں گے ——"

شہلا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا،

"میں بھی چلتی ہوں!"

روشن خاں نے آمادگی کے ساتھ کہا،

"چلیے ———— صاحب بڑا مہربان آدمی ہے کل اس نے مجھے پانچ روپے دیے تھے!"

شہلا نے فائل اٹھایا، اور روشن خاں کی طرف بڑھا دیا، پھر بولی،

"آؤ چلیں!"

(۲)

دفتر سے باہر آنے کے بعد شہلا فٹ پاتھ پر رکشا کے انتظار میں کھڑی ہوگئی، اتنے میں ایک رکشا والا سامنے سے گزرا، شہلا نے ہاتھ کے اشارے سے روکا پھر روشن خاں سے کہا،

"تم آؤ میں چلتی ہوں، !"

"بہت اچھا" روشن خاں نے جواب دیا،

"چلو، ——— ہوٹل ——— ہوٹل کاسموپلیٹن جانتے ہو تم؟ ———

شہلا نے پوچھا"

"بہت اچھی طرح سرکار"!" رکشا والے نے جواب دیا،

"بس تو وہیں چلنا ہے، !" شہلا نے بتایا،

"ابھی چٹکی بجاتے ہوئے، دو منٹ میں پہنچائے دیتا ہوں ! ———"

یہ کہہ کر رکشا والے نے پیڈل پر پاؤں مارا، اور چل پڑا۔ ذرا دیر میں منزل مقصود آگئی، شہلا نے ایک اٹھنی اس کے ہاتھ پر رکھی، اور کمپاؤنڈ میں داخل ہوگئی، اتفاق کی بات کمرہ نمبر ۱ سامنے ہی نظر آگیا، مزید اتفاق یہ کہ کمرہ کے سامنے والے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز ایک چھوٹی سی میز پر پاؤں لٹکائے ندیم کسی اخبار کے پڑھنے میں مصروف تھا، وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی آگے بڑھی، جب بالکل ندیم کے پاس پہنچی تو اخلاقاً مسکرانے کی کوشش کی،

ندیم نے چاپ سنکر اخبار سامنے سے ہٹایا، تو شہلا سامنے کھڑی تھی، ——— اور مسکرا رہی تھی، دفعتہً ندیم کا رنگ رُخ بدل گیا، اخبار اس نے میز پر پھینکا اور ٹھیک طرح سے بیٹھتے ہوئے ذرا ترش لہجہ میں کہا،

"آپ یہاں ——— ؟"

شہلا کا تبسّم اب تک قائم تھا، اس نے بھی اس مختصر سے سوال کا مختصر سا جواب دیا،

"جی ہاں، - ——— "

اس جواب نے ندیم کا چہرہ بھیانک بنا دیا، تھوڑی بہت جو شگفتگی نظر آرہی تھی، رخصت ہوگئی، اس نے بالکل ترش لہجہ میں پوچھا،

"لیکن آپ کیوں آئیں ؟"

قبل اس کے کہ شہلا جواب دے ندیم نے کہا،

"میں نے تو آپ کو نہیں بلایا تھا !"

شہلا کا تبسّم رخصت ہوگیا تھا، لیکن ندیم کا سیل تکلّم جاری تھا،

"میں نے دفتر تک کے لیے یہ کہہ رکھا ہے جب تک میں خود نہ بلاؤں آپ آنے کی زحمت نہ کریں، نہ کہ ہوٹل ہی چلی آئیں ؟"

شہلا کا چہرہ اس طرح سفید پڑ گیا، جیسے واقعی اس سے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہوا ہو، جیسے اس نے چوری کی ہو، ڈاکہ ڈالا ہو، اور عین موقعہ واردات پر پکڑلی گئی ہو، وہ ابھی اپنی صفائی میں کچھ کہنے نہیں پائی تھی کہ پھر ندیم کی آواز گونجی،

"میں ذرا دوسری قسم کا آدمی ہوں جو باتیں آج کل فیشن میں داخل ہیں، میں انھیں معیوب تو نہیں کہتا، لیکن خود ان پر عمل کروں یہ بھی نہیں ہو سکتا !"

ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے بھرے بازار میں اس کے منہ پر طمانچہ ماردیا، وہ یہ باتیں سن رہی تھی، اور شرم و غیرت سے کٹی جارہی تھی، دل ہی دل میں دعا کررہی تھی کہ زمین پھٹ جائے اور وہ سما جائے۔

آسمان ٹوٹ پڑے اور وہ غارت ہو جائے، وہ خود بھی تو لوگوں سے ملنے جلنے کی، مردوں سے راہ و رسم بڑھانے کی، ادھر اُدھر آنے جانے کی نہ عادی تھی نہ اسے پسند کرتی تھی، یہاں وہ عاشق ہو کر نہیں آئی تھی، دعوتِ محبت دینے نہیں آئی تھی، مصیبتوں کی کثرت نے اس میں یہ یارا ہی کب باقی رکھا تھا کہ وہ عشق و محبت کے مسائل پر غور کر سکے، اس کی فرصت کے لمحات تو صرف یہ سوچنے میں صرف ہوتے تھے کہ کسی طرح کسی شریف گھرانے میں ایک ٹیوشن چالیس پچاس روپے ماہوار کا مل جائے، تو اور زیادہ تندہی اور دریادلی کے ساتھ چھوٹے بھائی بہن، اور ماں کی رکھوالی اور خبر گیری کر سکے۔ جی چاہا یہ ساری باتیں کہہ ڈالے، اور ندیم کو بتا دے کہ حضرت آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، ممکن ہے آپ اپنے وقت کے یوسف ثانی ہوں، اور حسن پرست لڑکیوں نے عاشق ہو ہو کر تعریف و توصیف کر کر کے آپ کا مزاج چرخ عظیم پر پہنچا دیا ہو، لیکن ——— مجھ کو دماغ سرو دگل یا سمیں کہاں؟ ——— میں تو اپنے جنجال میں پڑی ہوں، میں ذاتی طور پر حاضر خدمت نہیں ہوئی تھی ڈیوٹی نے مجھے یہاں آنے، اور ذلیل ہونے پر مجبور کیا تھا، پھر خیال آیا، ممکن ہے میری باتیں اس وحشی انسان کو ناگوار ہوں، بات بڑھے، اور میری ملازمت خطرہ میں پڑ جائے۔ غریب اور تباہ حال لوگ اسی لیے ہوتے ہیں کہ ٹھوکریں کھائیں، ذلتیں سہیں، جھڑکیاں سنیں، پیٹ پالنا ہے تو ناک کو الوداع کہنا ہی پڑے گا، لہٰذا ان باتوں کے برا ماننے سے کوئی فائدہ نہیں، ان کا جواب دینا غیر ضروری ہے، ہاں اس میں کوئی حرج نہیں کہ بتادوں، ایڈورڈ نے یاد کیا ہے انہیں ٹرنک کال کر لیں۔ یہ سوچ کر اس نے ہونٹوں کو جنبش دی ہی تھی، لیکن ابھی کوئی لفظ منہ سے نہ نکال پائی تھی کہ اسی عورت کو اقرار جرم سمجھ کر ندیم نے اعتراضاً کہا،

"اب تک آپ یہاں موجود ہیں!!"

شہلا نے جواب دیا،

"میں واپس جاتی ہوں!!"

ندیم کھڑا ہو گیا،

"شکریہ ۔ !"

اور پھر شہلا کی طرف دیکھے بغیر برآمدے سے اپنے کمرہ میں چلا گیا !

چند سکنڈ تک وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، آنکھ سے دو قطرے آنسو کے گرے، جلدی سے ساری کا پلو اٹھایا، اور آنسو پونچھ کر برآمدہ سے نیچے اتر آئی اور دروازہ پر پہنچی تو روشن خاں آتا دکھائی دیا، شفقت اور اخلاق کے لہجہ میں شہلا نے پوچھا،

"تم آگئے ؟"

"جی آگیا، !" روشن خاں نے جواب دیا، پھر پوچھا،

"کیا صاحب نہیں ہیں ؟"

"ہیں تو !" کچھ بلٹ پلٹاتے ہوئے شہلا نے کہا، پھر بات بنانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی، "کمرہ میں ہیں، شاید سو رہے ہوں، شاید آرام کر رہے ہوں، میں نے اندر جانا یا دروازہ کھٹکھٹانا مناسب نہ سمجھا، چلی آئی۔

روشن خاں نے عظمت اور عزت کی نظر سے شہلا کو دیکھا، پھر گویا ہوا،

"کوئی ضروری کام تھا صاحب سے ؟"

شہلا کو جیسے نئی روشنی نظر آگئی،

"ہاں ورنہ کیوں آتی، ——— وہ لندن سے فون آیا تھا نا ؟"

"جی صاحب آیا تھا، ——— صاحب حیرت ہے لندن سے بھی فون آجاتا ہے، بڑے صاحب کا تھا !"

"ہاں لندن سے بھی آجاتا ہے، تو وہ فون ایڈورڈ کا تھا، جانتے ہی ہو ؟"

"جی ہاں صاحب جانتا ہوں !"

"ایڈورڈ صاحب نے تاکید کی ہے کہ آج رات کو، دس بجے ندیم صاحب ان سے فون پر بات کریں !"

"چھوٹا صاحب بھی لندن فون کر کے بات کرے گا ـــــ ؟"

روشن خاں کی حیرت کو نظر انداز کر کے شہلا نے کہا،

"ہاں بھئی، تو کون سی قیامت ہو جائیگی، ہر روز وہاں سے یہاں، اور یہاں سے وہاں نہ جانے کتنے لوگ ایک دوسرے کو فون کرتے رہتے ہیں! !"

"ہاں صاحب کہتے ہوں گے، خود میں نے بھی آج سنا، لیکن یقین نہیں آتا !"

شہلا نے مسکراتے ہوئے کہا،

"یقین آنا کوئی ہنسی کھیل ہے، سچ پوچھو تو مجھے بھی شک سا ہے اب تک کانوں سے سننے کے بعد بھی یقین کرنے کا جی نہیں چاہتا، لیکن جی چاہے یا نہ چاہے یقین کرنا ہی پڑتا ہے !"

گویا بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے روشن خاں نے اقرار میں گردن ہلائی،

"جی صاحب یہ بات تو ہے !"

شہلا نے کہا،

تم ندیم صاحب کے پاس جا رہے ہو یہ فائل لے کر ـــــــ

"جی ہاں، ـــــ کوئی حکم !"

"تو ان سے کہہ دینا کہ لندن سے ایڈورڈ صاحب کا فون آیا تھا، اور انھوں نے تاکید کی ہے کہ آج رات کو دس بجے ندیم صاحب ضرور ان سے فون پر بات کر لیں،

"ضرور کہہ دوں گا !"

شہلا آگے بڑھ گئی، اور روشن خاں کا غذات کا فائل لے کر، ندیم کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اب تک کمرہ ہی میں تھا شاید روشن خاں کے بھاری بھرکم جوتوں نے اسے خبر دے دی کہ کوئی آ رہا ہے، وہ تیزی سے باہر نکلا، چہرہ تمتمایا ہوا تھا، آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، روشن خاں نے اپنے صاحب کو آج پہلی مرتبہ اس رنگ میں دیکھا، گھبرا گیا، ندیم پھر اسی آرام کرسی پر دراز ہو گیا، اسنے کہا،

"روشن خاں مجھے ٹھنڈا پانی پلاؤ !"

روشن خاں لپک کر کمرہ میں پہنچا تھرماس سے برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نکالے، انھیں گلاس میں لا کر بڑے ادب سے ندیم کے سامنے رکھ دیا، وہ ایک ہی دفعہ میں سارا گلاس خالی کر گیا، پھر رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا

" ذرا سگریٹ بھی لانا !"

روشن خاں پھر اسی مستعدی سے کمرہ میں پہنچا، اور فوراً سگریٹ کیس اور لائٹر لے کر برآمد ہوا، یہ دونوں چیزیں بھی، ادب اور قرینہ سے سامنے رکھ دیں، ندیم نے سگریٹ سلگانے کے بعد، نرم اور ملائم لہجہ میں کہا،

"کاغذات لے آئے ؟"

روشن خاں نے فائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"جی لے آیا صاحب، !"

ندیم نے فائل اپنے سامنے رکھ لیا، اور کاغذات الٹنے پلٹنے لگا، اتنے میں روشن خاں نے کہا،

"آج بڑے صاحب کا فون آیا تھا لندن سے !"

ندیم چونک پڑا، اس نے فائل کے کاغذات سے نظر ہٹاتے ہوئے سوال کیا،

ایڈورڈ صاحب کا فون آیا تھا ؟"

روشن خاں نے جواب دیا،

"جی ہاں صاحب انہی کا تھا !"

ندیم نے پر سکون لہجہ میں کہا،

" خیریت تو ہے ؟"

روشن خاں نے جواب دیا،

"اللہ بہتر جانتا ہے، غیب کی باتیں ہم کیا جانیں صاحب !"

اس بے تکے جواب پر ندیم کو شاید غصہ آجاتا، لیکن روشن خاں کا سچا اور معصوم چہرہ دیکھ کر وہ تبسم سے بدل گیا،

"لیکن آخر بڑے صاحب سے کچھ باتیں بھی تو ہوئی ہوں گی۔؟"

روشن خاں نے عرض کیا،

"جی ہاں میم صاحب نے ان سے باتیں کی تھیں!"

ندیم نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا،

"مس شہلا نے؟"

روشن خاں نے اقرار کیا،

"جی صاحب انہی نے، ——"

ندیم نے جلتا ہوا سگریٹ برآمدے سے باہر پھینکتے ہوئے کہا،

"ہوں، ——"

روشن خاں نے مزید اضافہ معلومات کے لیے بتایا،

"وہ تو یہاں فون کا حال بتانے آپ کے پاس آیا بھی تھا، لیکن آپ کمرہ میں تھا، ہمیں ابھی دروازے پر ملا، کہنے لگا، تمہارا صاحب یا تو سو رہا ہے، یا آرام کر رہا ہے، ہم چلا آیا، تم صاحب سے کہہ دینا کہ بڑا صاحب کو آج دس بجے رات کو ضرور فون کرلے، اس نے تاکید کیا ہے!"

ایک سگریٹ ندیم نے پھر سلگایا،

"ہوں، ——"

روشن خاں نے پوچھا،

"آپ فون کرے گا بڑا صاحب کو؟"

ندیم نے جلتا ہوا سگریٹ ایک مرتبہ پھر برآمدے سے باہر پھینکا، اور جواب دیا،

"ہاں!"

پھر مسکراتے ہُوئے اس نے دریافت کیا،

"تم بھی کچھ پیام دینا چاہو تو بتادو میں کہہ دوں گا!"

روشن خاں نے بڑی سادگی سے کہا،

"ہمارا سلام بول دینا صاحب کو۔"

اور پھر وہی سوال دہرایا جو شہلا سے کر چکا،

"لندن سے فون کس طرح آجاتا ہے صاحب؟"

ندیم نے اس سوال کا جواب نہیں دیا، بلکہ خود ایک سوال کر ڈالا،

"ایڈورڈ صاحب نے کچھ اور بھی تو کہا ہوگا؟"

روشن خاں نے پھر اپنی ناواقفیت کا اعتراف کر لیا،

"ضرور کہا ہوگا صاحب، لیکن ہم کیا بتا سکتا ہے، میم صاحب بے چارا آپ کو بتانے آیا تھا، مگر آپ کمرہ میں سو رہا تھا، یا آرام کر رہا تھا، وہ چلا گیا، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ میں میم صاحب کے گھر جاکر پوچھ آؤں کہ ان سے کیا کیا بات ہوا تھا!"

ندیم نے مسکراتے ہُوئے کہا،

جی نہیں ابھی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں!

---

(۷)

ہوٹل کاسموپلیٹن سے شہلا باہر نکلی تو اس کے پاؤں من من بھر کے ہورہے تھے، آج کی توہین سے اس کا دل بہت رنجور تھا، اپنی بے بسی پر اسے رونا آرہا تھا، اب تک اس نے خود کو بہت روکا، اور سنبھالا تھا، لیکن اب ضبط گریہ ناممکن ہوگیا، آنسوؤں کے قطرے باربار حلقۂ چشم سے باہر آتے اور باربار وہ انھیں رومال سے خشک کرتی، وہ سوچتی، انسانیت، شرافت، اخلاق، ہر چیز کو ندیم نے بالائے طاق رکھ دیا ہے؟ یہ برتاؤ اگر سیٹھ کے ساتھ ہوتا تو بھی ایک بات تھی، میرے ساتھ، صرف میرے ساتھ پہلے دن سے اس کا رویہ اتنا ناشائستہ، اور غیر مہذب کیوں ہے؟ کیا صرف اس لیے نہیں کہ میں غریب ہوں، نوکری کرنے پر مجبور ہوں؟

یہ سوچتے سوچتے اس کی خودی ابھری اور اس نے فیصلہ کرلیا،

"میں استعفیٰ دے دوں گی!"

یہ فیصلہ کرتے ہی اس کے آنسو تھم گئے، ایک سکون سا محسوس ہوا، دل سے آواز اٹھی، ذلت اور توہین کے مقابلہ میں فقر و فاقہ کہیں قابل برداشت ہے؟!

وہ اضطراب جو ندیم کی باتوں سے پیدا ہوا تھا، بڑی حد تک رفع ہوگیا، اطمینان اور سکون کی حالت میں وہ گھر پہنچی، جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوئی، چھوٹی بہن دوڑی دوڑی آئی، اور اس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔

"آپا آگئیں،!"

شہلا نے محبت اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، چونکہ پاؤں اس کی گرفت میں تھے اس لیے آہستہ آہستہ لنگڑا لنگڑا کر چلنے لگی، اتنے میں چھوٹا بھائی خسرو بھی آ گیا، وہ فوزیہ کا یہ امتیاز برداشت نہ کر سکا وہ ہاتھ جواب تک فوزیہ کے سر پر تھا، خسرو نے اسے ہاتھ میں لے لیا، شہلا نے اس کے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا،

"تم نے سبق تو یاد کر لیا ہوگا !"

فوزیہ نے جواب دیا،

"اس نے تو کتاب بھی پھاڑ دی، یاد کاہے سے کرے گا !"

شہلا نے شکایت آمیز نظروں سے خسرو کو دیکھا،

"کیوں خسرو، یہ کیا کیا تم نے ؟"

فوزیہ بولی،

یہ بھی تو نہیں سوچتا آپا کتنی محنت کر کے پیسے لاتی ہیں، کبھی کتاب پھاڑ دیتا ہے، کبھی موزے کبھی جوتا۔ ——"

شہلا نے ندامت کے آنسو خسرو کی آنکھوں میں جھلملاتے دیکھے، اس کا دل تڑپ گیا، اسنے فوزیہ سے کہا،

"کتاب دھوکے سے پھٹ گئی ہو گی، ہمارا خسرو خود سے کیوں پھاڑتا، ؟ —— کیوں خسرو ؟"

خسرو کی چشم پرنم فوراً خشک ہو گئی، اس نے اقرار میں گردن ہلائی، شہلا نے سوال کیا،

"میں اور نئی کتاب لا دونگی، مگر احتیاط سے رکھو گے نا ؟"

خسرو نے پھر اقرار میں گردن ہلائی، شہلا نے پھر پیار سے اس کے گال چھوئے، اتنے میں ماں کا کمرہ آ گیا۔ شہلا نے پکارا،

"امی —— !"

فوزیہ نے بتایا،

"امی کو پھر بخار ہو گیا ہے !"

شہلا بے تابی سے آگے بڑھی، اور ماں کے سرہانے پہنچ کر ماتھے پر ہاتھ رکھا، اور بڑے پیار بھرے لہجہ میں کہا،

"امی ——————"

ماں نے کروٹ لیتے ہوئے کہا،

"ہاں میری بچی"!"

"پھر بخار آگیا آپ کو؟"

"ہاں تو کیا ہوا، ہو رات تک ورنہ صبح تک اُتر جائے گا"!"

"لیکن یہ بار بار آنا کیوں ہے؟"

خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے، سوگوار تبسم کے ساتھ ماہ خاتون بولیں،

"کیوں پریشان ہوتی ہے لڑکی۔ اچھی ہو جاؤں گی مرنے کی نہیں اطمینان رکھ، نعمت خانہ میں تیرا کھانا رکھا ہے"!"

شہلا نے ماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھے رکھے کہا،

"امی خاصا تیز بخار ہے آپ کو، کھانا آکر کھاؤں گی، پہلے ڈاکٹر صاحب سے حال کہہ آؤں جاکر"!"

یہ کہہ کر شہلا باہر نکلی، ماہ خاتون پکارتی ہی رہ گئیں، لیکن وہ چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر کو لے کر آگئی، ڈاکٹر صاحب نے خوب اچھی طرح دیکھا بھالا، اور نسخہ لکھ دیا، کمرہ سے باہر آکر جب شہلا نے فیس دی، تو اسے جیب میں رکھتے ہوئے بولے،

"ٹائیفائڈ معلوم ہوتا ہے، بڑی احتیاط کی ضرورت ہے"!"

شہلا کا چہرہ پیلا پڑ گیا، وہ مدھم آواز میں بولی،

"ٹائیفائڈ، !"

ڈاکٹر صاحب نے اطمینان سے جواب دیا،

"تو کیا ہُوا ـــــــ اچھا ہو جائے گا، یہ دوا پابندی سے دیتی رہئے "

ڈاکٹر صاحب چلے گئے، اور شہلا آکر ماں کے پاس بیٹھ گئی، فوزیہ نعمت خانے سے کھانا نکال لائی، شہلا نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا، اور پوچھا،

"تم نے بھی کھا لیا؟"

وہ بولی۔

"میں بھی کھا لیا اور خسرو نے بھی کھا لیا، آپ بھی کھا لیجئے !"

شہلا نے ہاتھ دھوئے اور کھانے بیٹھ گئی، لیکن ڈاکٹر جو خوش خبری سنا گئے تھے، اس نے کھانے کا لطف باقی نہ رکھا، جلدی جلدی دو چار نوالے کھا کر اُٹھ کھڑی ہُوئی، ماہ خاتون بستر پر لیٹے لیٹے سب کچھ دیکھ رہی تھیں، کہنے لگیں،

"بیٹی تو نے کچھ نہیں کھایا، اتنی محنت کرے گی اور پھر یوں بھوکی رہے گی، تو ایک دن خود بھی بستر پر پڑ جائے گی !"

شہلا نے ہاتھ دھوتے دھوتے کہا،

"امی آج کچھ زیادہ بھوک نہیں ہے، !"

ماہ خاتون خاموش ہو گئیں، فوزیہ اور خسرو اپنی اپنی کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھ گئے، ماں کی جب آنکھ لگ گئی تو وہ خود بھی اپنا کورس لے کر بیٹھ گئی اس سال ایم اے کا امتحان دینے کی تیاری کر رہی تھی، بالآخر ماہ خاتون کی آنکھ لگ گئی، فوزیہ اور خسرو پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگے، شہلا اُٹھی، اس نے جلدی سے دونوں کے بستر ٹھیک کیے، اور لٹا دیا، خود آکر پھر لیمپ کے سامنے بیٹھ کر مطالعہ کرنے لگی، گھڑیال نے جب گیارہ بجائے تو کتابیں سمیٹ کر وہ بھی بستر پر لیٹ گئی،

پریشان حال اور پریشان خاطر لوگ دن تو کسی طرح گزار لیتے ہیں، لیکن رات ان کے لیے شب بلا بن کر آتی ہے، دنیا جہان کے خیالات اس وقت یورش کرتے ہیں، شہلا جب سارے کاموں سے فارغ ہو کر سونے کے لیے لیٹی تو لاکھ لاکھ آنکھیں بند کیں، کروٹیں بدلیں، خالی الذہن ہونے کی کوشش کی، خیالات کے سیلاب کو روکنے کی جدوجہد کی، لیکن کامیاب نہ ہوسکی، وہ ساری فکریں اور پریشانیاں جنھیں دن کی مصروفیت میں اور شب کے مطالعہ میں بھولی ہوئی تھی، ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں،

پرسوں فوزیہ کی فیس دینی ہے،

خسرو غریب کا جوتا بالکل ناکارہ ہوگیا ہے، کہہ رہا تھا لڑکے مذاق اڑاتے ہیں، ——— !

امی کی طبیعت پھر خراب ہوگئی، ڈاکٹر صاحب نے ٹائیفائڈ کا اندیشہ ظاہر کیا ہے، خدانخواستہ اگر واقعی ٹائیفائڈ ہوا تو کیا ہوگا، قیمتی دوائیں کہاں سے آئیں گی؟ پرہیز کا کس طرح بندوبست ہوگا،

خود میرے امتحان میں بھی اب صرف دو مہینے باقی رہ گئے ہیں، کورس کی کتابیں تو جس طرح بنا فراہم کرلیں، لیکن اب امتحان کی فیس کے جو مٹھی بھر روپے دینا ہیں، ان کا بندوبست کس طرح ہوگا؟

مکان کا کرایہ تین مہینہ سے نہیں دیا ہے، اسے کب تک ٹالا جائے گا؟ اس مرتبہ پوری رقم لیے بغیر تو وہ ہرگز نہیں ٹلے گا، ایک سو پانچ روپے یہ چاہئیں، ——— !

ہاں خوب یاد آیا، پندرہ دن کے بعد آبا جان کی برسی ہے، اس موقع پر بھی کم از کم چالیس پچاس روپے صرف ہو جائیں گے۔ کچھ عزیز آئیں گے، کچھ رشتے دار آئیں گے، یہ لوگ ویسے تو کبھی بات نہیں پوچھتے لیکن ایسے موقعوں پر فوراً آدھمکتے ہیں، اور اس طرح آتے ہیں جیسے از راہ احسان کسی تقریب میں تشریف لائے ہیں، خاطر مدارات میں ذرا کمی ہوئی اور ان کی تیوریاں

چڑھیں،

اور ہاں بابدولت کی سال گرہ بھی تو ہے۔ اگلے مہینے کی سات تاریخ کو، نہ جانے امی کو میری سال گرہ کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے، ہزار بار کہہ چکی۔ سال گرہ کرنی ہے تو فوزیہ کی کیجئے، مگر انھیں تو جیسے ضد ہے، میری سال گرہ ضرور کریں گی اور دھوم دھام سے کریں گی، ہاتھ روکتے روکتے بھی ساٹھ ستر روپے تو خرچ ہو ہی جاتے ہیں،

خیالات کے اس ہجوم میں دفعتًہ آج کا واقعہ یاد آ گیا،

کاسموپلیٹن ہوٹل میں جانا، ندیم سے ملنا، انکا غیر مہذب اور ناشائستہ برتاؤ، اپنی بے بسی، خون کا گھونٹ پی کر خاموش واپسی،

پھر یاد آیا میں نے استعفا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے'!

لیکن فوراً ہی یہ ارادہ کمزور پڑ گیا، ماہ خاتون کی علالت، فوزیہ کی فیس، خسرو کا سوٹ باپ کی برسی، اپنی سالگرہ، مکان کا کرایہ،

نوکری کرتے ہوئے جب ان جھنجالوں سے نجات کی کوئی صورت نہیں نظر آتی، تو استعفا دینے کے بعد کیا ہوگا؟ پھر تو یہ گاڑی ایک دن بھی نہیں چل سکے گی۔

اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا، نہیں مجھے استعفا نہیں دینا چاہئے، اپنی مہربان ماں، اپنے معصوم بھائی بہن کے لیے کیا میں اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتی کہ اپنی خودداری قربان کر دوں، تھوڑی سی ذلت سہہ لوں؟

"میں استعفا نہیں دوں گی،!" دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر کے شہلا نے ایسا سکون محسوس کیا جیسے عرصہ سے وہ بے روزگار تھی اور اب یک بیک بے سان و گمان پروانۂ ملازمت مل گیا،

تھوڑی دیر میں نیند آ گئی اور وہ سو گئی! ❊

(۸)

تین دن تک ماں کی علالت کے باعث شہلا دفتر نہ جا سکی، چوتھے روز جب ڈاکٹر صاحب نے یہ بشارت دی کہ ماہ خاتون کو ٹائیفائڈ نہیں ٹھیرا تھا، اور اب وہ بالکل اچھی ہیں تو اس کی جان میں جان آئی، اور ماں سے اجازت لے کر وہ دفتر گئی، ندیم صاحب پہلے سے بیٹھے تھے، جیسے ہی انھوں نے شہلا کو اپنے کیبن میں جاتے دیکھا آواز دی،

"مس شہلا ذرا ادھر آئیے گا۔!"

شہلا فوراً حاضر خدمت ہوئی،

ندیم نے کہا،

آج تین دن کے بعد آپ آئی ہیں، ——

شہلا نے کہا،

جی ہاں میری والدہ کی طبیعت سخت خراب ہو گئی تھی۔

ندیم نے تیوری چڑھا کر کہا،

"لیکن ڈیوٹی بہرحال ڈیوٹی ہے،!"

شہلا نے کہا،

میں جانتی ہوں، وہ ایک بڑی ڈیوٹی تھی جس نے مجھے اس چھوٹی ڈیوٹی کو انجام دینے سے روکے رکھا،

ندیم نے ذرا چیں بہ جبیں ہو کر کہا،

"لیکن ملازمت انسان کی ذاتی مجبوریوں کی پروا نہیں کرتی"،

نہ جانے کہاں سے شہلا میں حوصلہ پیدا ہو گیا، اس نے تنطے سے کہا،

"کرتی تو ہے، !"

ندیم نے کچھ حیرت، کچھ برہمی کے لہجہ میں کہا،

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا،

شہلا مزید وضاحت کرتے ہوئے گویا ہوئی،

"آپ بھی تو کئی روز تک بیمار رہے تھے مگر ملازمت نے آپ کی پروا کی، نہ آپ کی غیر حاضری لکھی گئی، نہ تنخواہ کاٹی جائے گی، میری ماں بیمار رہی، اور تین روز تک نہ آسکی، میری غیر حاضری بھی لکھی گئی، اور تنخواہ بھی کاٹ لی جائے گی، ممکن ہے مجھے برخاست بھی کر دیا جائے، آپ کو ملازمت نے وہ دیا جس کے آپ مستحق تھے، مجھے وہ دے گی جس کی میں سزاوار ہوں، آپ اتنے مستغنی ہیں کہ اس رعایت پہ حکام بالادست کا شکریہ بھی شاید ادا کریں، میں اتنی مجبور ہوں کہ اس رویہ پر شکایت بھی نہیں کر سکتی، !"

چند لمحوں تک ندیم پر سکتہ کی سی کیفیت طاری رہی، پھر اس نے بازو اس طرح جھٹکے جیسے کوئی چیز اس سے چمٹ گئی تھی، جسے جھاڑ ڈالا،

اس کے بعد کہا،

"ابھی تو خیر آپ کو خاصا کام کرنا ہے، جاتے وقت کیشیر سے مل لیجئے گا، !"

شہلا کا دل دھک دھک کرنے لگا، کمرہ اسے گھومتے نظر آیا، اپنی تیز گفتاری پر وہ دل ہی دل میں انجام کی بھیانک صورت دیکھ کر سوچنے لگی، اس نے سوچا ضرور ندیم صاحب نے کیشیر کو ہدایت کر دی ہے کہ میرا حساب کر دیا جائے، مصیبت جب تک نہیں آتی، آدمی اس سے ڈرتا رہتا ہے جب آجاتی ہے تو قدرت برداشت کرنے کا حوصلہ بھی دے دیتی ہے، جب تک

ملازمت سے الگ کیے جانے کا صرف اندیشہ تھا، شہلا لرزتی رہی، لیکن جب یہ اندیشہ واقعہ کی صورت میں نظر آنے لگا، تو اس میں ہمت پیدا ہوگئی،

اس نے کہا،

"ایک سال سے زیادہ مدت گزر گئی، میں یہاں کام کر رہی ہوں، کم از کم ایک مہینہ کا نوٹس مجھے ملنا چاہیے،"

ندیم نے ایک مرتبہ پھر چھلتی سی نظر شہلا پر ڈالی اور کاغذات کا ایک انبار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اصل سوال کا کوئی جواب نہ دیا، صرف یہ کہا،

"آپ کی غیر حاضری میں اتنا کام جمع ہو گیا ہے، بہر حال یہ آپ ہی کو نپٹانا ہے، جس قدر جلد یہ نپٹ جائے اتنا ہی بہتر ہے،"

شہلا نے وہ کاغذات سمیٹ لیے اور اپنے کیبن میں جا کر ٹائپ کرنے لگی، ویسے بھی اس کی اسپیڈ اچھی خاصی تھی، ایڈورڈ صاحب نے باقاعدہ امتحان لے کر، اور دوسرے امیدواروں سے فائق پا کر اسے ملازم رکھا تھا، آج اور زیادہ برق رفتاری کے ساتھ اس کی انگلیاں ٹائپ کی مشین پر دوڑنے لگیں، دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگی تھی اس کی خواہش تھی جتنا زیادہ کام ہو سکے آج ہی کر ڈالے، شاید ندیم صاحب اس کی کارگزاری دیکھ کر اپنا حکم واپس لے لیں اور اسے کیشیئر کے پاس نہ جانا پڑے،

حسبِ معمول لنچ کے لیے ندیم ہوٹل کاسموپولیٹن چلا گیا، عموماً وہ ایک بجے جاتا تھا، اور تین بجے آجاتا تھا، ایک گھنٹہ بیٹھ کر ضروری کاغذات پر دستخط کرتا، کچھ ہدایت دیتا، اور چار بجے واپس چلا جاتا۔

آج چار بج گئے، مگر وہ نہیں آیا!!

گھڑی نے پانچ بجا دیے مگر ندیم کا اب تک ٹھیک پتہ نہیں تھا!

اتنے میں اروشن خاں آیا، اس نے کہا،

"کمشنر صاحب آپ کو بلا رہا ہے، ——"

شہلا کا دل پھڑکنے لگا، اس نے تیوری چڑھا کر کہا،

"دیکھو نہیں رہے میں کام کر رہی ہوں"!"

روشن خاں چلا گیا،

تھوڑی دیر بعد وہ پھر واپس آیا، اس نے کہا،

"کمشنر صاحب کہتا ہے ہمیں دیر ہو رہی ہے، ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتا"!"

شہلا نے کہا،

"تو ان سے کس نے انتظار کرنے کو کہا ہے، کسی نے انھیں روک رکھا ہے؟ چلے کیوں نہیں جاتے ہیں"

یہ کہہ کر وہ پھر کھٹا کھٹ ٹائپ کرنے لگی، روشن خاں نے نہایت سادگی سے یہی الفاظ دہرا دیئے جا کر کمشنر صاحب کے سامنے، کمشنر صاحب جتنے زیادہ بوڑھے تھے، اتنے ہی زیادہ نازک مزاج تھے، چونکہ نہایت ایماندار اور فرض شناس آدمی تھے اس لیے یہ نازک مزاجی بھی ایک طرح کا فیشن بن گئی تھی، روشن خاں کے الفاظ سن کر جھلّا ہی تو گئے،

"یہ آج کل کی چھوکریاں نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگی ہیں"!"

یہ کہہ کر انھوں نے ایک واؤچر اٹھایا، اس پر کچھ لکھا، پھر رسیدی ٹکٹ لگایا، اور اپنے رجسٹر و کاغذات وغیرہ سنبھال کر الماری میں رکھے، تالا لگایا، پھر اسے ایک مرتبہ کھینچ کر دیکھا کہ کہیں کھلا تو نہیں رہ گیا، پھر اپنا کمرہ بند کیا، اس میں ایک موٹا سا تالا لگایا، اسے دو مرتبہ کھینچ کر دیکھا کہ بالکل بند ہو گیا یا نہیں، پھر ماتھے پر شکن ڈال کر روشن خاں سے کہا،

"بہت اچھا جناب، وہ کام کریں، ہم ہی بیکار ہیں، چلتے ہیں ان کی تنخواہ بنا ——

—— ہم ہم ہم"!"

روشن خاں نے کوئی جواب نہیں دیا ساتھ ہو لیا،

کمشنر صاحب، جب شہلا کی کیبن میں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ پسینہ میں شرابور ہو رہی ہے، سارا غصّہ رفع ہو گیا، اس کی جگہ رحم نے لے لی،

”ارے بیٹی تو اب تک کھٹا کھٹ اور پٹا پٹ کیے جا رہی ہے؟ کچھ بیمار پڑنے کو جی چاہتا ہے؟ اس طرح صحت قائم رہ سکتی ہے؟“

شہلا کا جی چاہا کہ کہے آپ صحت کو کہہ رہے ہیں، یہاں زندگی قائم رکھنے کے لالے پڑے ہیں، ایک بے روزگار لڑکی اپنے کنبہ کو پالنے کے لیے صحت کی فکر کرے یا زندگی کی؟ لیکن یہ خیالات دل کے دل ہی میں رہے الفاظ کا جامہ پہن کر زبان تک نہ آ سکے، اس نے ٹائپ کا سلسلہ بند کر کے کاغذ اس میں سے نکالتے ہوئے کہا،

”بس یہ آخری کاغذ تھا، میں آ ہی رہی تھی!“

کمشنر صاحب کا دریائے شفقت اور زیادہ جوش پہ آ گیا، انھوں نے فرمایا،

”بیٹی یہ تو سچ ہے تم آ ہی رہی تھیں، لیکن سوال یہ ہے کہ باقی کام کل نہیں ہو سکتا تھا، غضب خدا کا، پسینہ میں تر ہو رہی ہو! اتنی محنت بھی کوئی کرتا ہے؟“

شہلا نے اپنے خشک ہونٹوں پہ تبسم کی تازگی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا،

”وہ بات یہ ہے کہ امی بیمار تھیں اس لیے تین دن تک میں نہ آ سکی، خاصا کام جمع ہو گیا تھا، میں نے سوچا اگر یہاں رہنا ہی ہے تو کام چوری کا الزام کیوں اپنے سر لوں، لہٰذا ڈٹ کر بیٹھ گئی، دیکھیے سارا کام ختم کر ڈالا میں نے!“

کمشنر صاحب نے تحسین و تعریف کی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا،

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ ——— ہاں بیٹی محنت میں برکت ہے، خدا تمہارے اس حوصلہ کو قائم رکھے، اتنی محنت تو آج کل کے نوجوان بھی نہیں کرتے؟“

پھر کچھ سوچ کر کمشنر صاحب نے جیب سے واؤچر نکالا اور مسکراتے ہوئے کہا،

"اس پر دستخط کر دو، روپے میں لیتا آیا ہوں، ابھی گن کے دیتا ہوں!"

شہلا کا چہرہ سفید پڑ گیا، اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے فونٹن پن کی کیپ اتاری اور واؤچر کیشیئر صاحب سے لے لیا!"

کیشیئر صاحب نے واؤچر دیتے ہوئے کہا،

"بڑے صاحب (مسٹر ایڈورڈ) بھی کتنے شریف اور مہربان آدمی ہیں، اپنے ماتحتوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں، منیجر صاحب (ندیم) کو لندن سے فون کیا کہ سارے اسٹاف کو دو دو مہینہ کی تنخواہ بطور بونس کے عطا کی جائے، اور مس شہلا کو چار مہینہ کی تنخواہ دی جائے، اس لیے کہ دفتر میں سب سے زیادہ فرض شناس، اور محنتی لڑکی وہی ہے،!!"

اب تک شہلا نے واؤچر نہیں دیکھا تھا، وہ اس کی انگلیوں میں دبا اس طرح لرز رہا تھا جیسے کسی شاخ کی خزاں دیدہ پتی، یہ الفاظ سنکر اس کے چہرے پر خون دوڑ گیا، جس دل پر اب تک خوف، دہشت اور اندیشہ ہائے دور دراز کی حکومت تھی، وفعتہً وہ خوشی کا جھولا جھولنے لگا، پہلا اثر تو یہ ہوا کہ واؤچر چھوٹ کر اس کے ہاتھ سے گر پڑا، جھک کر جلدی سے اٹھایا، پھر مسکراتے ہوئے دستخط کر دیئے، اتنے میں کیشیئر صاحب نوٹ گن چکے تھے، واؤچر لے کر نوٹ اسے تھمائے پھر ہنستے ہوئے کہا،

"بیٹی مٹھائی واجب ہو گئی تم پر!"

وہ مسکراتی ہوئی بولی،

"سر آنکھوں پر!"

کیشیئر صاحب ہنستے ہوئے چلے گئے،

شہلا نے سارے کاغذات سنبھالے، انھیں ترتیب دی اور ایک فائل میں رکھا، پھر وہ سارا پلندہ جا کر ندیم کی میز پر رکھ آئی،

چلتے ہوئے روشن خاں کی طرف متوجہ ہوئی،

روشن خاں ذرا بازار تک چلو گے؟ کچھ چیزیں خریدنا ہیں !"

روشن خاں فوراً تیار ہو گئے،

"ہاں صاحب کیوں نہیں چلے گا ضرور چلے گا !"

شہلا آگے آگے اور روشن خاں پیچھے پیچھے روانہ ہوئے، بازار دفتر سے کچھ زیادہ دور نہ تھا جلد ہی یہ لوگ وہاں پہنچ گئے، شہلا نے ماں کے لیے چالیس روپے کا ایک کمبل خریدا، خسرو کے لیے سلے سلائے دو سوٹ لیے، فرزانہ کے لیے دو خوب صورت سی فراکیں خریدیں، ایک دوکان سے ٹافیاں لیں، پھر ایک جوتا فروش کی دوکان میں گھس گئی، روشن خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیلز مین سے کہا،

ایک مضبوط اور خوب صورت چپل دکھائیے ——————

سیلز مین نے کئی قسم کے چپل لا کر سامنے رکھ دیئے، شہلا نے کہا،

"روشن خاں پسند کرو !"

روشن خاں کو اس پیش کش پر حیرت بھی ہوئی، اور خوشی بھی تھی تھوڑے سے تامل کے بعد ایک چپل میں انھوں نے اپنا پاؤں داخل کر دیا، اتفاق کی بات بالکل فٹ آئی، شہلا نے قیمت پوچھی، معلوم ہوا بائیس روپے، روشن خاں کو جلال آ گیا، انھوں نے پھر اپنا پھٹا ہوا جوتا پہن لیا، اور فرمایا،

"بائیس روپیہ، بائیس روپیہ، تم لوٹتا ہے، ہم نہیں لے گا !"

سیلز مین نے کنونسنگ شروع کر دیا "اس کا چمڑا بہت عمدہ اور مضبوط ہے، ایک سال تک تو اس میں کوئی خرابی بھی پیدا ہی نہیں ہو سکتی" لیکن روشن خاں مطمئن نہیں ہوئے۔

"نا بابا ہم اتنا قیمتی چپل کیسے پہن سکتا ہے، ! ! !"

شہلا نے مداخلت کی،

"روشن خاں یہ چپل تم پہنو گے، !"

پھر اس نے سیلزمین کو روپے دیتے ہوئے کہا،

"باندھ دیجئے، !"

اب روشن خاں کے لیے مجالِ دم زدن نہ تھی، خاموش ہوگئے، اتنے میں سیلزمین نے ایک کاغذی ڈبے میں وہ چپل رکھ کر روشن خاں کو تھما دی،

دکان سے نکل کر شہلا نے کہا،

"روشن خاں اب تم جاؤ، !"

روشن خاں نے اظہارِ ممنونیت کے طور پہ کہا،

"آپ کو گھر تک پہنچا کر جائے گا، !"

شہلا مسکرانے لگی،

"اچھا چلو، !"

---

(۹)

چونکہ کل سہ پہر کو دفتر آ نا نہ ہو سکا تھا اس لیے، ندیم آج وقت سے ذرا پہلے آ گیا، میز پر کل کے دبے ہوئے سارے کاغذات ڈھیر تھے، اس نے تعجب کے ساتھ اس انبار کو دیکھا اور گھنٹی بجا کر روشن خاں کو بلایا، وہ آیا تو پوچھا،

"کیا مس شہلا آ گئیں، ؟"

روشن خاں نے کہا،

"ابھی تو نہیں آیا صاحب، !"

پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے کہا،

"کل شام کو چھ بجے تک کام کرتا رہا ——————"

ندیم نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا، اور پوچھا،

"شام کو چھ بجے تک ؟"

روشن خاں نے جواب دیا،

"جی صاحب، —————— سارا کام ختم کر کے اٹھا، کیشیر صاحب نے اسے کئی دفعہ بلایا، مگر نہیں گیا، !"

ندیم نے روشن خاں کی طرف بالکل متوجہ ہو کر پوچھا،

"کیوں نہیں گیا ؟"

روشن خاں نے کہا،

"بس کٹھا گھٹ ٹائپ کیے جا رہا تھا، ہم نے کہا، کیشیر صاحب کہتا ہے، ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے آؤ، بولا، کہدو، ہم نہیں آئے گا کام کر رہا ہے —— —— کیشیر صاحب بولا، کہدو ہم جاتا ہے، ہم نے آکر کہدیا، کہنے لگا، جاؤ کہدو، کس نے روکا ہے کیوں نہیں چلا جاتا، ہم نے یہ بھی کہہ دیا، کیشیر صاحب خفا ہو گیا، کہنے لگا، ہم خود چلتا ہے، ہم نے کہا چلو، کیا ہم جھوٹ بولتا ہے، وہ ہمارے ساتھ آیا، پھر اس نے بانس (بونس) کے روپئے دیے، کہنے لگا، بڑا صاحب نے چھوٹا صاحب کو لندن سے فون کیا تھا، یہ روپے لو، اور ہمیں مٹھائی کھلاؤ، ——

ندیم نے سوال کیا،

"اچھا —— پھر مٹھائی کھائی اس نے؟"

روشن خاں نے بتایا،

"شاید آج کھائے، پھر جب ہم دفتر بند کرنے لگا، تو ندیم صاحب نے ہم سے بولا، روشن خاں ہمارے ساتھ بازار چلے گا، ہم نے بولا، کیوں نہیں چلے گا، ——

ندیم نے پوچھا،

"تمھیں بازار لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

روشن خاں پہلے ہی سے مفصل رپورٹ دینے پر تلے ہوئے تھے، انھوں نے سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے کہا،

"ہمیں کیا معلوم تھا، ہمیں اس لیے لیے جا رہا ہے ——"

ندیم کے چہرے پر حیرت اور تعجب کے آثار پیدا ہوئے،

"کس لیے لے گیا تھا تمھیں؟"

روشن خاں کا جی چاہا کہ نسوار کی ایک چٹکی منہ میں ڈال کر، ہونٹوں میں دبا مزید تقریر کریں،

لیکن ندیم خاں صاحب بھی ذرا چکتے تھے، لہٰذا یہ حسرت پوری نہ کر سکے، صرف کھنکھارنے پر اکتفا کیا، پھر فرمایا،

"وہ ہمیں ساتھ لے کر گیا، ایک دوکان سے کمبل خریدا، کہنے لگا، یہ ہم نے اپنا ماں کے لیے خریدا ہے، پھر ایک دوکان سے دو سلے ہوئے سوٹ مول لیے، کہنے لگا، ہمارا چھوٹا بھائی ہے اسکول میں پڑھتا ہے یہ اس کے ہیں، پھر دو فراکیں خریدیں، کہنے لگا، یہ ہمارا چھوٹا بہن ہے اس کے لیے لیتا ہوں، اس کے بعد ایک جوتا کی دوکان میں گھس گیا، ہم سمجھا اپنے لیے جوتا خریدے گا۔ دوکاندار سے کہنے لگا،

ایک اچھا سا چپل لاؤ، وہ لایا، تو ہم سے بولا، روشن خاں پسند کرو، ہم نے پسند کر لیا، پھر دام پوچھے تو دوکاندار نے بتایا بائیس روپیہ، ہم تو بگڑ گیا صاحب، لیکن میم صاحب نے اسے روپیے دے دیے اور ہم سے کہنے لگا، روشن خاں تم اسے پہنے گے، پھر ہم کیا کرتا، چپ ہو گیا،

"

ندیم نے کرسی سے ٹیک لگالی، اور کاغذات سے نظر ہٹا کر کہا،

"واہ بھئی تم تو بڑے مزے میں رہے!"

روشن خاں نے کہا،

"صاحب ہمیں کچھ خوشی نہیں ہوا یہ چپل لے کر!"

ندیم نے سگار سلگاتے ہوئے پوچھا،

"کیوں؟ خوشی تو ہونا چاہیے تھا!"

روشن خاں نے اسی سنجیدگی سے کہا،

"ہمارا جی چاہتا ہے کہ واپس کر دے ———"

ندیم کو بڑی حیرت ہوئی، وہ یہ دریافت کیے بغیر نہ رہ سکا،

"آخر کیوں؟"

روشن خاں نے جواب دیا،

"صاحب ہمارا دل کہتا ہے ہمارے لیے اس نے چپل خرید دیا، مگر اپنے لیے جوتا نہیں لیا،
اپنا حصہ اس نے ہمیں دے دیا، ـــــــــــ"

ندیم کو اس وجدان پر یقین نہ آیا،

"لیکن وہ چاہتیں تو اپنے لیے بھی خرید لیتیں، روپے تو پھر بھی کافی بچ رہے ہوں گے،!
دوسروں کو تو صرف دو ماہ کی تنخواہ ملی ہے، لیکن انھیں تو چار مہینے کی ملی ہے، ایڈورڈ صاحب
بہت مہربان ہیں ان پر،!"

روشن خاں نے کہا،

صاحب یہ تو تم ٹھیک کہتا ہے، وہ چاہتا تو اپنے لیے بھی خرید لیتا، لیکن اس کا باپ مر چکا
ہے، چھوٹا بھائی بہن ہے، ماں ہے، سب کو وہی اکیلا پالتا ہے، ہمارا خیال ہے باقی روپے
سے وہ قرضہ اتارے گا!"

ندیم چونک پڑا،

"قرضہ ــــــــــ؟"

روشن خاں نے اصرار کیا،

"ہاں صاحب، اس پر قرضہ بھی ہے، بیچارا اس تنخواہ میں کیا کیا کرے، کئی دن ہوئے جس
مکان میں رہتا ہے اس کا مالک کا منیجر یہاں آیا تھا کہتا تھا تین مہینہ کا کرایہ چڑھ گیا ہے!"

ندیم نے سگار کا ایک لمبا سا کش لگایا پھر کہا،

"اچھا یہ بات ہے، ــــــــــ"

اتنے میں کیبن میں کچھ کھٹ پٹ کی آواز آئی، ندیم نے کہا،

"شاید مس شہلا آگئیں اگر آگئیں ہوں تو ہمارا سلام بولو!"

روشن خاں ندیم کا پیام لے کر گیا، جواب میں شہلا خود نمودار ہو گئی، ندیم نے کاغذات پر ایک

نظر ڈالتے ہوئے کہا،

"آپ نے تو کل ہی سارا کام ختم کر لیا !"

شہلا نے جواب دیا،

"آخر غیر حاضری کی تلافی بھی تو کرنی تھی، !"

ندیم نے اس بات پر توجہ نہیں کی، کہنے لگا،

"اس روز ہوٹل آپ مسٹر ایڈورڈ کا پیغام دے کر گئی تھیں؟"

شہلا نے بہت مختصر سا جواب دیا،

"جی ہاں، !"

ندیم نے، الفاظ سے نہیں، لیکن لب و لہجے سے معذرت کرتے ہوئے کہا،

"میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ آپ اس لیے آئی ہیں، !"

شہلا کی تیوری چڑھ گئی "

"آپ کا کیا خیال تھا، میں بھول گئی تھی، ؟"

ندیم اس سوال کا جواب نہ دے سکا، کچھ جھینپ سا گیا۔ اس نے کہا،

"مس شہلا مجھے کچھ خط لکھوانا ہیں، جو آج ہی ہوائی ڈاک سے جائیں گے، پہلے انہیں لکھ لیجئے، پھر کوئی اور کام کیجئے گا !"

شہلا لپک کر اپنے کیبن میں گئی، پنسل اور کاپی اٹھا لائی۔ ندیم بولتا گیا، اور وہ شارٹ ہینڈ میں لکھتی گئی، لیکن ایک خط سے زیادہ نہ لکھوا سکا، پہلا خط بول چکنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا، کچھ دیر تک تو شہلا نظریں نیچی کیے ہمہ تن گوش بنی بیٹھی رہی کہ جو کچھ وہ بولے اسے لکھ لے، لیکن جب کئی منٹ گزر گئے، اور اس کی آواز نہ آئی، تو اس نے نظر اٹھا کر اپنے باس کی طرف دیکھا، وہ کچھ سوچ رہا تھا، شہلا پھر کاپی کی طرف دیکھنے لگی، ندیم اٹھ کھڑا ہوا، اس نے کہا،

"مس شہلا، مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے، باقی خط سہ پہر کو یا کل لکھواؤں گا !"

شہلا نے کوئی جواب نہیں دیا اُٹھ کھڑی ہوئی،

"اسے ابھی ٹائپ کر لاؤں یا واپس آکر آپ دیکھیں گے !"

اتنی دیر میں ندیم کرسی سے اُٹھ چکا تھا، اس نے باہر کی طرف جاتے ہوئے کہا،

"واپس آکر، یا کل !"

وہ چلا گیا، شہلا آکر پھر اپنے کیبن میں بیٹھ گئی، جی ہی جی میں خوش تھی کہ کم از کم چند گھنٹے کے لیے ٹائپ سے نجات ملی، کل اتنا کام کیا تھا کہ اب تک انگلیاں دکھ رہی تھیں ! ◆

(۱۰)

دوسرے روز ٹھیک وقت پہ ندیم آگیا، وہ ایک خط جو کل اس نے لکھوایا تھا، شہلا ٹائپ کر چکی تھی، جیسے ہی وہ آیا، خط اس کی میز پر پہنچ گیا، ندیم نے خلاف معمول خط کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے پڑھا، حالانکہ عام معمول یہ تھا کہ ایک سرسری نظر ڈالی اور دستخط کر دیے، پھر پڑھنے کے بعد دستخط کے لیے قلم اٹھایا، تو پہلے ہاتھ میں لے کر کچھ سوچتا رہا، پھر بہت رساں رساں دستخط کیے، حالانکہ ہمیشہ پلک جھپکتے میں دستخط کر دیا کرتا تھا،

ان تبدیلیوں پر شہلا نے کچھ غور نہیں کیا، وہ چپ چاپ کھڑی رہی، دستخط کے بعد اس نے کاغذ اٹھایا، اور واپس جانے کے لیے مڑی، مشکل سے چند قدم چلی ہو گی کہ آواز آئی،

"مس شہلا ذرا سنئے گا،!"

شہلا پلٹ آئی اور کھڑے کھڑے سوالیہ نظروں سے اپنے باس کو دیکھا اور پھر نظر جھکا کر حکم کا انتظار کرنے لگی، چند لمحوں تک وہ اسی طرح کھڑی رہی پھر ندیم نے کہا،

"بیٹھ جایئے"

وہ باس کی کرسی پر بیٹھ گئی، پھر اس نے پنسل سنبھالی، اور سرخ چوڑی لکیروں والی کاپی سامنے رکھ لی، ندیم نے کہا،

"نہیں نہیں، اس وقت میرا ارادہ کچھ لکھوانے کا نہیں ہے"

شہلا نے کاپی بند کر لی، اور اسی انداز سے جیسے اب وہ اٹھنا چاہتی ہے، ندیم کی طرف دیکھا

وہ کہنے لگا،

"جس روز مسٹر ایڈورڈ کا فون لندن سے آیا تھا، آپ اطلاع دینے میرے پاس کاسموپلٹین ہوٹل آئی تھیں؟"

شہلا نے بغیر کسی پس وپیش کے جواب دیا،

"جی ہاں آئی تو تھی"

ندیم نے کہا:

"لیکن میرا طرزِ عمل شاید آپ کو بہت ناگوار گزرا ہوگا"

شہلا گویا ہوئی،

"ناگوار باتوں کی میں اب اتنی عادی ہو چکی ہوں کہ ناگواری کا احساس ہی نہیں ہوتا"

ندیم نے پوچھا،

"لیکن کیوں؟"

شہلا نے بڑی سادگی سے کہا،

"اس لیے کہ اس طرح کی باتوں پر غور کرنے کا حق صرف ان لوگوں کو ہے جو اپنا کوئی مستقل وجود رکھتے ہوں، جیسے مسٹر ایڈورڈ، جو اپنی ایک شخصیت رکھتے ہوں، جیسے مسٹر جانسن، جن کی اہمیت ناقابلِ انکار ہو، جیسے آپ، میں ہوئی یا روشن خاں ہوں یا ہم جیسے دوسرے ہوں، وہ ایسی باتیں صرف اسی وقت سوچ سکتے ہیں جب ان کا دماغ جواب دے چکا ہو، وہ پاگل ہو چکے ہوں"

ندیم نے اکتائے لہجہ میں کہا،

"مس شہلا آپ تو تقریر کرنے لگیں، بہرحال میرے کہنے کا مدعا یہ ہے۔ کہ میں نے بعد میں کئی مرتبہ اپنے طرزِ عمل پہ غور کیا، اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ غلط تھا، مجھے اس پر ندامت ہے، میں معافی چاہتا ہوں!"

شہلا نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا،

"یہ آپ کی نوازش ہے، ورنہ یہ رسمی سی بات ہے، اس کی کوئی خاص ضرورت تو نہ ہوتی!"

یہ کہہ کر شہلا نے نظر اٹھائی تو دیکھا ندیم کا چہرہ تمتمایا ہوا ہے، جیسے انتہائی غصہ کی حالت میں ہو، یہ انداز بیچاری کی سمجھ میں نہ آیا، جب وہ چلنے کے لئے اٹھ چکی تو ندیم نے کہا،

"کیا میں ایک سوال کر سکتا ہوں آپ سے؟"

شہلا چلتے چلتے رک گئی، اس نے کہا،

"کیوں نہیں؟ پوچھئے!"

ندیم نے دریافت کیا،

"اس روز آپ مسکراتی ہوئی آئی تھیں، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کیوں؟"

یہ عجیب و غریب سوال سنکر شہلا سٹپٹا گئی، ذرا دیر تک تو وہ ہکا بکا رہی، پھر بولی،

"یہ تو میری عادت ہے!"

ندیم نے زور دے کر کہا،

"لیکن یہ غلط عادت ہے، خطرناک عادت ہے، لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دینے والی عادت ہے، ——"

ندیم کی یہ تقریر سراپا حیرت بن کر شہلا نے سنی وہ سوچ رہی تھی یا میری سماعت دھوکا دے رہی ہے، یا مسٹر ندیم پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے، لیکن انسان کتنا ہی خاکساری اور فرو تنی کا پیکر ہو، کبھی کبھی اس کی خودی ابھر ہی آتی ہے، پہلے تو حیرت اور سکتہ کی حالت میں شہلا یہ باتیں سنتی رہی، پھر دفعتہً اس نے کہا،

"مسٹر ندیم آپ حد سے بڑھ رہے ہیں —— ناقابل برداشت حد تک! میرے اور آپ کے درمیان افسر اور ماتحت کا رشتہ ہے، میں کوشش کرتی ہوں کہ آپ کو شکایت کا موقع نہ دوں، اپنے فرائض دیانت داری کے ساتھ انجام دوں، اس کے بعد میں

آزاد ہوں، نہ آپ کو مجھ سے کوئی سروکار رکھنا چاہیے، نہ مجھے آپ سے، میں کیوں مسکرائی؟ میں کیوں مسکراتی ہوں؟ یہ میری عادت ہے اور کوئی وجہ، مجھے ایسی نظر نہیں آتی کہ میں اسے ترک کر دوں، ممکن ہے آپ کے نزدیک یہ غلط عادت ہو، لیکن قطعاً ضروری نہیں ہے کہ مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہو، ممکن ہے یہ خطرناک عادت ہو آپ کی نگاہ میں، لیکن مجھے اس میں کوئی قباحت نہیں نظر آتی، ممکن ہے بعض ضرورت سے زیادہ عقلمند لوگ اس سے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہوں، لیکن ان کا علاج میرے پاس نہیں پاگل خانے میں ہے، ایسے لوگوں کے لیے ہلکا سا ہلکا لفظ میں جو استعمال کر سکتی ہوں، وہ یہ ہے کہ ایسے لوگ بد نفس ہیں، وہ اگر غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں تو میں آن کی آن میں وہ غلط فہمی رفع کر سکتی ہوں، صرف ذرا دیر کے لیے مجھے اپنے سینڈل کو زحمت دینی پڑے گی، جو لوگ دوسروں کے متعلق بری رائے رکھتے ہیں، درحقیقت وہ خود اپنے بارے میں بری رائے رکھتے ہیں وہ خود اپنے اوپر ملامت اور نفرین کا ووٹ پاس کرتے ہیں، وہ اپنی بدنفسی پر دوسروں کو متہم کر کے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، بے شک میں غریب ہوں، لیکن مجھے اپنی غربت پر شرم نہیں آتی، میں لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے اپنا اور اپنے گھر کا پیٹ نہیں پالتی، محنت کرتی ہوں، دست و بازو کی مدد سے روزی کماتی ہوں، میرے بارے میں کون غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے،؟ کیا میں اس کی آنکھیں نہ پھوڑ دوں گی؟ کیا میں اس کی زبان نہ کھینچ لوں گی؟ آپ اس کمپنی کے منیجر ہیں، میری حیثیت ایک معمولی ٹائپسٹ کی ہے، آپ ہزاروں پاتے ہیں، میری آمدنی کی انتہا چند سو ہے، لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ آپ بار بار میری توہین کریں اور میں ایک مجرم کی طرح اپنی توہین برداشت کر لوں؟ اگر میرا کام آپ کو ناپسند ہے، مجھے اجازت دیجیے کہ استعفا دے دوں، یا آخری مرتبہ پھر میری توہین کر لیجیے، یعنی مجھے برخاست کر دیجیے، لیکن یہ خیال دل سے نکال دیجیے کہ میں بار بار اپنی توہین برداشت کر سکتی ہوں، ہر بات کی ایک انتہا ہوتی ہے اور میرے صبر کی بھی انتہا ہو چکی ہے،!!"

شاید ابھی شہلا کچھ اور کہتی، لیکن ندیم نے ذرا بلند آواز سے کہا،
"مس شہلا میں اب زیادہ نہیں سن سکتا، آپ تشریف لے جایئے !!"
شہلا نے کوئی جواب نہیں دیا، کاپی اور پنسل اٹھائی، چپ چاپ اپنے کیبن میں آکر بیٹھ گئی، اس کی آنکھیں پرنم تھیں، وہ سوچ رہی تھی اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

(11)

تھوڑی دیر کے بعد، ندیم نے گھنٹی بجائی، روشن خاں حاضر ہوا،

"مس شہلا کو ہمارا سلام بولو"!"

روشن خاں نے یہ پیغام پہنچا دیا،

شہلا اٹھی اور ندیم کے کمرہ میں پہونچ گئی، لیکن اس مرتبہ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے، وہ پنسل بھی نہ کاپی۔ ندیم نے بالکل بدلے ہوئے نرم اور ملائم لہجہ میں کہا،

"مس شہلا میں کچھ لکھوانا چاہتا ہوں"!"

شہلا دیر تک خاموش کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر کیبن میں جاکر پنسل اور کاپی اٹھا لائی، ندیم نے کئی خط لکھوائے، آخری خط لکھوانے کے بعد کہا،

"لنچ کے وقت سے پہلے یہ ٹائپ ہو جائیں گے؟"

شہلا نے رکھائی سے کہا،

"کوشش کروں گی!"

ندیم نے کلائی کی گھڑی پر ایک نظر ڈالی پھر گویا ہوا،

"ابھی تو ایک گھنٹہ باقی ہے، آپ تو بہت تیز رفتار ٹائپسٹ ہیں، ہو تو جانے چاہئیں!"

شہلا نے کاپی اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"امید تو ہے، !"

پھر وہ اپنے کیبن میں جا کر ٹائپ کرنے لگی، اس کی انگلیاں ٹائپ کی مشین پر دوڑ رہی تھیں، لیکن اس کا خیال ندیم میں الجھا ہوا تھا، ندیم کی تلخ اور ترش باتیں سنکر ملول و افسردہ وہ اپنے کیبن میں واپس آئی تھی، اور یہ فیصلا کر کے آئی تھی کہ خواہ کچھ ہو ضرور استعفا دیدے گی افسر بالا کا سخت اور دل آزار رویہ کو کسی نہ کسی طرح برداشت کیا جا سکتا ہے، لیکن دل میں تراز و ہو جانے والی باتیں نہیں برداشت کی جا سکتیں، وہ سوچ رہی تھی آخر ندیم صاحب کو میرے مسکرانے پر اتنا غصہ کیوں آیا؟ اس کے اتنے غلط معنیٰ انھوں نے کیوں لیے، غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا ذکر کیوں کیا؟

کیا میں کوئی آبرو باختہ عورت ہوں، کہ مسکرا مسکرا کر پرچانے، بھانے اور اسیر دام زلف عنبریں کرنے کی کوشش کر رہی تھی؟

کیا میں کوئی آوارہ بد معاش عورت ہوں کہ دفتر کے لوگوں سے عشق لڑاتی پھرونگی؟

کیا وہ اتنے عابد، زاہد، متقی اور پرہیزگار شخص ہیں کہ ایک عورت کا تبسم چہرہ دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور میں اتنی گئی گزری ہوں کہ جس مرد پر میری نظر پڑیگی، اسی پر لٹو ہو جاؤں گی، ؟

ایک آدمی کو حق ہے کہ وہ اپنا کیرکٹر زیادہ سے زیادہ صاف اور بے داغ رکھے، کسی ترغیب سے متاثر نہ ہو، کسی دام میں گرفتار نہ ہو سکے، لیکن کیا اسے یہ حق بھی ہے کہ اپنے سایہ سے بھڑکے، دوسروں کو ذلیل سمجھے؟ اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ دوسرے اسے ہضم کرنے اور کھا جانے کی فکر میں ہیں؟

جس شخص کا سینہ ایسے رکیک، پست اور ناپاک خیالات کا گنجینہ ہو، اسے ایک شریف آدمی قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کے ساتھ کام کیا جا سکتا ہے؟

کم از کم میں تو نہیں کر سکتی، اس طرح تو مجھے دق ہو جائے گی، میں مر جاؤں گی،!

میں مرگئی تو امی کا حشر کیا ہوگا؟ کیا وہ دیوانی نہیں ہو جائیں گی؟

خسرو کیا کرے گا؟ کیا وہ روتے روتے بے حال نہیں ہو جائے گا؟

فوزیہ کہاں جائے گی؟ پھر وہ اپنی چہیتی آپا کو کہاں پائے گی؟

میں اپنے لیے نہیں، زمانہ کے ان ستائے ہوئے بدبختوں کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں،

یہی سوچ کر اس نے کاغذ اٹھایا اور استعفا ٹائپ کرنے لگی، مشکل سے دو سطریں ٹائپ کی ہوں گی کہ روشن خاں پیام طلبی لے کر آیا،

وہ اس لیے گئی تھی کہ کھڑے کھڑے بات کر کے، اور اپنے استعفے کے ارادہ کا اظہار کر کے واپس چلی آئے گی، اس لیے کاپی اور پنسل ساتھ نہیں لے گئی تھی،

لیکن وہی شخص جو ابھی ذرا دیر پہلے فرعون بے سامان نظر آرہا تھا، چند لمحوں کے اندر اخلاق و انکسار کا پیکر نظر آنے لگا،

پہلے اس کے لب و لہجہ میں غصہ تھا، برہمی تھی، دل آزاری تھی، اذیت رسانی کا جذبہ تھا طنز تھا، حقارت تھی،!

لیکن اب، صرف چند منٹ کے اندر وہ شائستگی کا مجسمہ بن گیا تھا، اب اس کے لب و لہجہ میں ملاطفت تھی، نرمی تھی، شفقت تھی، خیر سگالی تھی،!

چنانچہ جب ندیم نے چند خط لکھوانے کا ارادہ ظاہر کیا، تو اس برتاؤ کے سامنے وہ نہ ٹھہر سکی، اس نے سوچا کیا حرج ہے، خط لکھ دوں، پھر استعفا پیش کر دوں گی،

پھر خط لکھانے کے بعد جس انداز سے اس نے جلد ٹائپ کر دینے کی درخواست کی، اس میں نہ رعونت تھی، نہ درشتی، نہ فرعونیت، نہ تمرّد، بلکہ ایک طرح کی التماس تھی، یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے، جو ابھی ذرا دیر پہلے قہر و جلال کی صورت بنا بیٹھا تھا،

شارٹ ہینڈ میں خطوط لکھ کر ٹائپ کرنے کے لیے جب شہلا اپنے کیبن میں پہونچی تو اس کا ارادہ بدل چکا تھا، !

رائے بھی بدل چکی تھی، !

اسا ہی استعفیٰ دینے کا ارادہ نہیں تھا، !

اب ندیم کے بارے میں سوچ رہی تھی، یہ شخص اتنا برا نہیں ہے جتنا نظر آتا ہے،

یہ زبان کا برا ہے لیکن دل کا برا نہیں ہے،

مگر زبان کا بُرا بھی ہمیشہ نہیں رہتا، کبھی اس کے منہ سے انگارے برستے ہیں کبھی پھول، !

کیا بات ہے؟

کیوں ہے ایسا؟

جب یہ اکڑتا ہے، تو اس پر غصہ آتا ہے، اس سے نفرت ہو جاتی ہے، جی چاہتا ہے اس کا منہ نوچ لوں،

جب یہ آدمیت کے جامہ میں ہوتا ہے، جب اپنے گذشتہ طرز عمل پر نادم نظر آتا ہے تو اس پہ رحم آتا ہے، ترس آنے لگتا ہے، جی کڑھتا ہے اس پر، !

شہلا کی انگلیاں ٹائپ کی مشین پر چل رہی تھیں، اور دماغ یہ باتیں سوچ رہا تھا، !

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی خط ٹائپ ہو گئے، نظر ثانی کرنے بیٹھی تو معلوم ہوا کچھ کا کچھ لکھ گئی ہے،

بہت جھنجھلائی اپنے اوپر اس طرح کی لغویت تو اس سے کبھی سرزد نہیں ہوئی تھی، لیکن مرتا کیا نہ کرتا، غلط خطوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈالا، اور ادھر نو انھیں ٹائپ کرنے بیٹھ گئی۔

گھڑی پر نظر گئی تو ایک بجنے میں صرف بیس منٹ باقی رہ گئے تھے، یہ فکر بھی تھی ایسا نہ ہو ایک بج جائے اور کچھ خط ٹائپ ہونے سے رہ جائیں، جس لب و لہجہ میں ندیم

نے خطوں کے جلد ٹائپ ہونے کی استدعا کی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ وقت سے پہلے نہیں تو ٹھیک وقت پہ کام ختم ہو جائے!'
شہلا کی انگلیاں ٹائپ کی مشین پہ پھر تیزی سے دوڑنے لگیں''! ٭

(۱۲)

گھڑی نے ایک بجایا!

شہلا جلدی جلدی قدم اٹھاتی کیبن سے باہر نکلی، اور ٹائپ کیے ہوئے کاغذات لے کر ندیم کے پاس پہنچ گئی، ندیم نے اسے ممنون نظروں سے دیکھا، اور گردن جھکا کر سرسری نظر سے خطوں کو دیکھا، پھر جلدی جلدی سب پر دستخط کر دیے،

کاغذات کو جب شہلا سمیٹ رہی تھی، تو ندیم نے کہا،

"مس شہلا آپ نے بالکل ٹھیک وقت پر کام کر دیا!"

عادتاً اس کلمۂ تحسین پر شہلا مسکرائی، لیکن فوراً ہی اس نے اپنا تبسّم روک لیا، ندیم نے اس کی یہ کوشش دیکھ لی، لیکن ظاہر نہ ہونے دیا کہ چوری پکڑ لی ہے اس سے، جب وہ کاغذات سمیٹ چکی تھی ندیم نے کہا،

"ابھی تھوڑی دیر پہلے جو گفتگو ہمارے درمیان ہوئی تھی، شاید میرا لب و لہجہ اس وقت تمیز اور تہذیب کے خلاف تھا، ——— کیوں مس شہلا میرا خیال درست ہے؟"

شہلا پھر مسکرانے والی تھی، لیکن اس نے اپنے اوپر سنجیدگی طاری رکھتے ہوئے کہا،

"میں نے اس پر غور نہیں کیا!"

ندیم نے پوچھا،

"یعنی آپ نے میرے لب و لہجہ کی تلخی نہیں محسوس کی؟"

شہلا نے جواب دیا، ؟ ،
محسوس تو کی تھی، لیکن ————"
ندیم نے سگار سلگاتے ہوئے اور کرسی کی بیٹھ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا
میں سننا چاہتا ہوں، "لیکن" کے بعد آپ کیا کہنا چاہتی تھیں؟"
شہلا نے بتایا،
میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ گو تلخی محسوس کی تھی، لیکن وہ تاثر زیادہ دیر تک میں قائم نہیں
رکھ سکی،

ندیم کا لب و لہجہ پھر بدل گیا، اس کی صورت بھی بدل گئی، اس کا چہرہ پھر سُرخ ہو گیا، اس کی آنکھوں سے پھر انگارے برسنے لگے، اس کی آواز پھر کرخت ہو گئی، اس نے کہا،
"شاید آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ وہ تاثر زیادہ دیر تک اس لیے نہیں قائم رہ سکا کہ آپ نے سوچا میں پاگل ہوں، سنکی ہوں، پاگل پر رحم آجاتا ہے، دیوانہ ترس کا مستحق ہوتا ہے، احمق کی باتوں کو ایک کان سے سنا دوسرے سے اڑا دیا جاتا ہے، سنکی شخص کی باتیں صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ لوگ ان سے لطف لیں، ————"
شہلا نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ نگاہ حیرت سے اس نیم مجنون شخص کو دیکھ رہی تھی، اور وہ کہہ رہا تھا،
"نہیں مس شہلا، میں پاگل نہیں ہوں، لہٰذا رحم کا سزاوار بھی نہیں ہوں، میں دیوانہ بھی نہیں ہوں، لہٰذا ترس کا مستحق بھی نہیں سمجھا جا سکتا، میں احمق تو نہیں ہوں؟ میری باتیں ایک کان سے سننے اور دوسرے سے اڑا دینے کے لیے نہیں ہوتیں لہٰذا اگر میری باتوں سے تکلیف پہنچی ہے تو ظلم کرتی ہیں مجھ پر ————"
شہلا نے سادگی سے سوال کیا،
"آپ کیا ہیں؟ میں بالکل نہیں سمجھ سکی، اگر خود آپ سمجھ سکے ہوں تو بتائیے، !"

ندیم نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا، آنکھیں بند کر لیں، کچھ دیر خاموش رہا
پھر بالکل بدلے ہوئے لہجہ میں بولا،
مس شہلا آپ کا خیال صحیح ہے، واقعی میں پاگل ہوں، احمق ہوں، سنکی ہوں، میں اس قابل
ہوں کہ مجھ سے رحم کا برتاؤ کیا جائے، میں مستحق ہوں کہ مجھ پہ ترس کھایا جائے، آپ کو اجازت ہے
کہ مجھے سنکی سمجھئے، ———— لیکن آپ جانتی ہیں میرا یہ حال کیوں ہے؟،
شہلا نے ایک مرتبہ پھر ندیم کی طرف دیکھا، ———— ان نظروں میں واقعی رحم اور
ترس جھلک رہا تھا ———— پھر کہا،
"نہیں، ———— میں کیسے جان سکتی ہوں؟"
ندیم نے سر اٹھا کر، کرسی کی پشت پر رکھ لیا، اور پیچھے کی طرف اسے جھکا کر گویا ہوا،
"ہاں آپ نہیں جانتیں اور جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے، بے شک میں احمق
ہوں اور نادان ہوں، لیکن نہ اتنا کہ اپنی حالت کی داستان لے کر بیٹھ جاؤں"
شہلا نے کہا،
"کیا یہ کاغذات میں لے جاؤں!؟"
ندیم نے جواب دیا،
"لے جائیے"
شہلا نے سوال کیا،
"کچھ اور تو آپ کو نہیں لکھوانا ہے؟"
ندیم نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا،
"نہیں مس شہلا!"
شہلا نے پوچھا،
"کیا آپ سہ پہر کو واپس آئیں گے؟"

ندیم نے کچھ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا،

"نہیں، ——— شاید میں نہیں آسکوں گا،! ——— شاید آج مجھے پھر بخار آجائے گا، شاید میں کئی دن تک نہ آسکوں، شاید میں کبھی نہ آسکوں ———!!"

شہلا چونک پڑی، اس نے کہا،

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ شاید آپ کبھی نہ آسکیں اس کا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

وہ نڈھال لہجہ میں گویا ہوا، ———

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں باقاعدہ دیوانہ ہوگیا تو پاگل خانہ بھیج دیا جاؤں گا، اگر مرگیا تو قبرستان میں!" ——— دونوں باتیں ممکن ہیں، بلکہ میں دعا کرتا ہوں، اور مس شہلا آپ بھی آمین کہیے کہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بات آئندہ چوبیس گھنٹے میں ضرور ہوجائے!!"

یہ کہتے کہتے ندیم کی آواز تھرانے لگی، اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں، چہرہ پھر تمتما اٹھا، شہلا انتہائی سراسیمگی، دہشت، اضطراب اور پریشانی کے عالم میں ندیم کا دم بدم بدلتا ہوا حال دیکھ رہی تھی، اب واقعی اس ناقابل فہم شخص سے جو لمحہ بہ لمحہ ایک ناقابل حل معمہ بنتا جارہا تھا، ہمدردی ہونے لگی تھی، لیکن اس شخص کی آشفتہ مزاجی، ہمدردی کی بھی تو متحمل نہیں ہوسکتی تھی، بیچاری کی کچھ بھی نہیں آرہا تھا، کیا کہے، ؟ کیا کرے ؟ اس مشکل سے کیونکر اور کس طرح عہدہ برآ ہو، ؟ آخر بڑی دقت سے وہ اس ذہنی کشمکش پر غالب آئی، اس نے کہا، جو درحقیقت ایک سوال تھا، ایک استفسار تھا،

"نہ جانے آپ اتنے دل گرفتہ کیوں ہیں ؟"

ندیم نے کہا،

"وہ آپ نہیں جانتیں کہ میں دل گرفتہ کیوں ہوں ؟ آپ کو جاننا بھی نہیں چاہیے، آپ میری دوست نہیں، ہمدرد نہیں غمگسار نہیں، ہمدم نہیں ———!"

شہلا کا جی چاہا کہ کہے،

ندیم صاحب ایسا نہ کہیئے، میں دل سے آپ کی ہمدرد ہوں، غمگسار ہوں، لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ ہمدردی اور غمگساری کا موقع بھی تو نہیں دیتے، میں آپ کی سچی دوست ہوں، لیکن کیا کروں آپ نہایت بے دردی سے دوستی کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں، میں اگر آپ کی کوئی خدمت کر سکوں تو بڑی خوشی ہو گی مجھے، لیکن آپ کو تو جیسے میری اس خوشی سے بیر ہے، کد ہے، عداوت ہے،

شہلا نے یہ سب کہنا چاہا، مگر کچھ نہ کہہ سکی، حیرت اور ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھنے لگی، پھر ذرا دیر کے بعد گویا ہوئی،

"شاید آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے!"

بڑی مظلومیت کے لہجہ میں ندیم نے کہا،

"مس شہلا کاش سر میں درد ہوتا۔ لیکن میں تو سراپا درد ہوں ———— درد، درد، صرف درد، اور کچھ نہیں!"

شہلا نے رکتے رکتے کہا،

"لیکن اس طرح تو آپ کی صحت پر بہت برا اثر پڑے گا، آپ کو کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیئے ————"

ندیم ہنس پڑا ———— کھوکھلی ہنسی، ———— پھر اس نے کہا،

"ڈاکٹر؟ ———— نہیں مس شہلا، میرا علاج نہ آپ کے پاس ہے نہ کسی دوست کے پاس نہ کوئی حکیم میرا علاج کر سکتا ہے نہ ڈاکٹر ———— غسل میت ہی ہمارا اکمل صحت ہو تو ہو!"

یہ الفاظ سنکر شہلا کا دل رونے لگا،!

کتنا درد تھا ان سادہ سے الفاظ میں '
کتنا سوز تھا، ان لفظوں میں '' !
کتنی حسرت تھی، ان چند الفاظ میں سمٹی ہوئی '' !
شہلا کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں، لیکن اس نے اپنے آنسو روک لیے، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے اور ندیم سے کہے،
اپنا درد مجھے دے دیجیے، لائیے آپ کا غم میں بانٹ لوں '' !
لیکن یہ الفاظ زبان تک آ کر رک گئے، آواز کا لباس نہ پہن سکے،
ندیم اٹھ کھڑا ہوا، اس نے کہا،
مس شہلا میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا، نہ جانے دل میں آپ کیا کہتی ہوں گی ——— ''
شہلا نے جواب میں چند رسمی سے الفاظ کہنا چاہے، لیکن نہ کہہ سکی،
ندیم اٹھا ہیٹ سر پر رکھی اور چلا گیا '' !
ندیم کے جانے کے بعد بڑی دیر تک شہلا اسی طرح گم سم، خاموش، ایک بت کی طرح کھڑی رہی، نہ کرسی پر بیٹھ سکی، نہ اپنے کیبن میں جا سکی،
آخر یہ مشکل روشن خاں نے آسان کر دی، وہ اپنا آبنوسی ڈنڈا زمین پر مارتا ہوا آیا، اس نے کہا،
''صاحب تو گیا، آپ کیوں کھڑا ہے اب تک ؟ ''
شہلا چونک پڑی، اس نے کہا،
''ایں ——— ؟''
پھر وہ کچھ شرمندہ سی ہو کر اپنے کیبن میں چلی گئی !
کیبن میں پہونچ کر کام کرنے لگی، انگلیاں ٹائپ رائٹر پر رقص کر رہی

تھیں لیکن دماغ نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کر رہا تھا، ———

آہ اے مرے خیال تو کہاں کہاں گیا؟
میں ترے ہی ساتھ تھی تو جہاں جہاں گیا!

———

سوزِ نہاں

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۱)

دوسرے روز ندیم خاموشی سے دفتر آیا، اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا، تازہ "مارننگ نیوز" سامنے رکھا تھا، ہوٹل میں اسے پڑھ آیا تھا پھر اس کی ورق گردانی کرنے لگا، پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں اور کچھ سوچنے لگا، پھر ایک سگار سلگایا اور گھنٹی بجائی، ایک اطاعت گزار جن کی طرح روشن خاں فوراً آموجود ہوا، ندیم نے کہا،

"مس شہلا ——————— ؟"

روشن خاں نے پوری بات بھی نہیں سنی، گیا، اور مس شہلا کو بھیج دیا، وہ آئی، اور حسب معمول ایک مرتبہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا، پھر نگاہ جھکائی اور خاموش ہوگئی، کاپی اور پنسل ہاتھ میں تھی، ندیم نے پوچھا،

"آپ کچھ کام کر رہی تھی، ——————— ٹائپ کی آواز آرہی تھی میرے کانوں میں !!"

شہلا نے جواب دینا چاہا تھا کہ ندیم نے کہا،

"لیکن کل کا کچھ کام باقی تو نہیں تھا، نہ آج ابھی تک میں نے کوئی کام دیا ہے !"

شہلا نے بتایا،

"جی ہاں وہ بات یہ ہے کہ مس کیتھرائن دو روز سے رخصت پر ہیں، مسٹر جانسن کا کام رکا ہوا تھا، انھوں نے کچھ کاغذات دیے ہیں ٹائپ کرنے کو !!"

ندیم نے بگڑے ہوئے تیور سے کہا،

"لیکن میں نے تو جب آپ اپنی والدہ کی وجہ کئی دن تک نہ آسکی تھیں، مس کیتھرائن سے کوئی کام نہیں لیا تھا،!

شہلا نے تائید کی،

"جی ہاں آپ نے تو نہیں لیا تھا سارا کام واپس آکر میں نے ہی نپٹایا،"

ندیم نے سوال کیا،

پھر آپ نے یہ کام کیوں لے لیا،؟

شہلا فوراً اس سوال کا جواب نہ دے سکی، ذرا سے تامل کے بعد اس نے کہا،

لیکن مسٹر جانسن کا کہنا میں کس طرح ٹال دیتی"؟

ندیم نے گھور کر شہلا کو دیکھا، پھر فون کا چونگا اٹھایا،

شہلا لرزنے لگی لیجیے اب مسٹر جانسن کی شامت آگئی خدا خیر کرے، لیکن خدا نے خیر ہی کی جانسن اپنی سیٹ پر نہیں تھے، معلوم ہوا کہیں باہر گئے ہیں، اور کچھ نہیں معلوم نہیں کب آئینگے ندیم نے رسیور اپنی جگہ رکھتے ہوئے کہا،

کہیں باہر گئے ہیں"!

شہلا کی جان میں جان آگئی، یہ بشارت سنکر اس کے بعد ندیم نے کہا،

"میں بات کروں گا،!"

وہ پھر لرزنے لگی کہ نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب مسٹر جانسن سے میری مڈبھیڑ ہوئی تھی میں ان کے سامنے جاتی نہ وہ ٹائپ کے لیے کاغذات دیتے، نہ یہ بن بلائی آفت آتی نہ ندیم کو منع کر سکتی تھی کہ اب یہ بات جانسن صاحب کے سامنے نہ چھیڑے نہ کوئی حیلہ اب سمجھ میں آتا تھا کہ جانسن صاحب سے اور ندیم سے ملاقات ہی نہ ہو، کچھ دیر ندیم خاموش

بیٹھا رہا، پھر شہلا نے ندیم سے پوچھا:

"کیا آپ کو ڈکٹیٹ کرائیں گے؟"

ندیم نے کہا،

"نہیں ——— جی نہیں!"

شہلا سوچنے لگی، اگر کچھ ڈکٹیٹ نہیں کرانا تھا، تو یاد کیوں فرمایا تھا لیکن یہ بات صرف سوچنے کی تھی زبان پر لانے کی نہ تھی، وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتی اپنے کیبن کی طرف روانہ ہوئی آہستہ آہستہ قدم رکھتی اس لیے گئی کہ اگر ندیم صاحب کو کسی اور معاملہ میں ہدایت دینا ہو تو فرما دیں، اب ان سے کوئی بات پوچھتے بھی تو ڈر لگتا تھا، نہ جانے منہ سے کیا نکلے، وہ اس کا کیا مطلب لیں؟ اور پھر یک بیک برس پڑیں، وہ اپنے کیبن میں پہونچی اور ٹائپ کرنے لگی مشکل سے چار پانچ سطریں ٹائپ کی ہوں گی، پھر گھنٹی بجی، اور فوراً ہی روشن خاں نے آکر یہ خبر دی،

"صاحب بلاتا ہے!"

شہلا نے کاغذ ویسے ہی چھوڑا اور پھر حاضر خدمت ہوگئی، ندیم سنبھل کر بیٹھ گیا، اس نے کہا،

"مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا!"

شہلا نے آمادگی کے ساتھ کہا،

"میں حاضر ہوں، فرمایئے!"

ندیم نے سوال کیا،

"لیکن آپ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں ——— جانسن صاحب کا کام لاکھ ضروری ہو، لیکن مجھے بھی تو کچھ ضروری ہی باتیں کرنی ہیں ——— بیٹھ جایئے!"

شہلا نے سوچا، لیجیے یک نہ شد دو شد، اب طنز و تعریض کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، ان الفاظ پر کچھ ہنسی آئی، کچھ غصہ آیا، لیکن وہ کرسی پر بیٹھ گئی، اور انتظار کرنے لگی کہ دیکھیے اب پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے ———

پانچ منٹ گزر گئے، !

دس منٹ گزر گئے،

لیکن ندیم صاحب بدستور خاموش تھے اب تو شہلا کو وحشت ہونے لگی کہ یہ ماجرا کیا ہے، ؟ اگر خدانخواستہ واقعی دماغ خراب ہو گیا ہے تو اس کی پہلی تماشائی میں کیوں بنوں؟ اس نے ڈرتے ڈرتے دبی زبان سے کہا،

"آپ کچھ کہہ رہے تھے ؟"

ندیم نے کہا،

"جی ہاں، کیا آپ سن سکیں گی ؟"

اس سوال کا جواب دینا آسان نہ تھا، یقیناً وہ کوئی بڑی ہی سنگین قسم کی بات ہوگی، جس کے لیے ندیم صاحب جیسا آدمی اس لب و لہجہ اور ان الفاظ میں پوچھ رہا ہے،

بہرحال، اس نے اپنا حوصلہ بحال کیا، اور بولی،

"فرمایئے ——— سنوں گی کیوں نہیں !"

لیکن یہ کہتے کہتے دل دھڑکنے لگا، ندیم نے کہا،

"آپ برا تو نہیں مانیں گی ؟"

دل کی دھڑکن کچھ اور بڑھ گئی، اس نے رُکتے رُکتے کہا،

"ہر شخص کو اظہار خیال کا حق ہے، اتفاق یا اختلاف دوسری چیز ہے، ظاہر ہے آپ کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ آپ کہیں میں اس سے اتفاق ہی کر لوں ؟"

ندیم بکیسر تپاک کے ساتھ گویا ہوا،

"نہیں بالکل نہیں، ——— اگرچہ میری یہ خواہش ضرور ہے کہ آپ اتفاق کریں!"

اس وقت واقعی شہلا کی حالت دیدنی تھی، اس کی سمجھ میں قطعاً نہیں آرہا تھا کہ ندیم کیا کہنا چاہتا ہے، کس بات کی یہ تمہید ہے؟ اور جو کچھ وہ کہے گا، اس کا جواب کیا ہوگا؟ لیکن بہرحال گریز اور فرار کی کوئی صورت نہیں تھی، سننا بھی تھا، اور جواب میں کچھ کہنا بھی تھا، لیکن کیا سننا ہے اور کیا جواب دینا ہے؟ یہ بات بالکل تاریکی میں تھی،

ندیم نے یک بیک کہا،

"مس شہلا، میں آپ کے کام سے بالکل مطمئن ہوں، آپ کی فرض شناسی، آپ کی پابندیٔ اوقات، آپ کی محنت، آپ کی خاموشی اور یگانگی، دفتری سیاست سے آپ کی علیحدگی اور بے تعلقی یہ سب چیزیں آپ کی بہترین سفارش ہیں ———"

ندیم نے اپنا بجھا ہوا سگار پھر سے سلگایا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا،

"اس کے علاوہ آپ کے کردار، سیرت، اخلاق، شرافت، اور معقولیت سے متعلق جو باتیں کسی ٹوہ اور تجسس سے نہیں بالکل اتفاقاً مجھے معلوم ہوگئی ہیں، ان کی بنا پر میرے دل میں کسی حد تک آپ کی عزت بھی پیدا ہوگئی ہے، ———"

گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے اس نے سگار کا ایک لمبا لمبا کش لیا، اور کہا،

دفتر کے سب لوگ، آپ کی کارگزاری سے بے حد مطمئن ہیں، ایڈورڈ صاحب کے دل میں آپ کی خاصی عزت ہے، جانسن صاحب کبھی کسی کا اتنا خیال نہیں کرتے، جتنا آپ کا کرتے ہیں ———"

شہلا نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا،

"جی ہاں میں بھی اسے محسوس کر سکتی ہوں، ایڈورڈ صاحب کے تو مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ زندگی بھر انہیں بھول نہیں سکتی، جانسن صاحب کا برتاؤ بھی اچھا ہی رہا ہے۔

ندیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا،

"اب میں پوائنٹ پر آرہا ہوں ———— میرے بارے میں، یعنی میرے رویہ کے بارے میں آپ کو یقیناً شکایت ہوگی، اور جہاں تک آپ کے نقطۂ نظر کا تعلق ہے، وہ شکایت بے جا بھی نہیں"

"لیکن مجھے تو کوئی شکایت نہیں ہے!"

"یہ مجھے آپ کی نیکی اور شرافت کا ایک اور ثبوت مل گیا، ———— نہیں مجھے تو ہونی چاہیے، میں خود جب اپنے طرز عمل پر غور کرتا ہوں تو گو میرے نقطۂ نظر سے وہ بالکل صحیح ہے ....

لیکن جو میرے نقطۂ نظر کو نہیں محسوس کرتا، محسوس نہیں کر سکتا، اسے اس کے خلاف رائے رکھنے کا حق ہے، یہ حق سب سے پہلے آپ کو ملنا چاہیے، لہٰذا اگر آپ شاکی ہیں، تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کی شکایت بجا، بالکل بجا ہے، ————

"اوہ لیکن ندیم صاحب آپ کیوں ان غیر ضروری باتوں پر اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں، یقین کیجیے مجھے کوئی شکایت نہ ہے، نہ آئندہ ہوگی!"

"کیوں، کس لیے؟"

"اس لیے کہ میں آپ کا مزاج سمجھ گئی ہوں!"

"خوب یہ تو بڑا دلچسپ انکشاف ہے میرے لیے، ———— میرے مزاج کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہے آپ نے؟"

"یہی کہ آپ، اخروٹ کی طرح ہیں!"

"کیا کہا اخروٹ کی طرح!"

"جی ہاں، جس کا خول، لوہے کی طرح سخت ہوتا ہے، لیکن جس کے اندر کا گودا نہایت نرم اور ملائم ہوتا ہے!"

"خوب، خوب، کچھ اور ؟"

"بس اور کیا، آپ ظاہر میں جتنے سخت نظر آتے ہیں، درحقیقت اتنے سخت نہیں ہیں !"

"کچھ اور بھی مس شہلا ؟"

"بس اتنا ہی، ——— میری جو رائے تھی، میں نے عرض کر دی !"

"ایک بیک سنجیدہ ہو کر، لیکن آپ کو میرے بارے میں رائے قائم کرنے کا کیا حق تھا ؟"

"دگھبرا کر، جی ——— ؟"

"ذرا بلند آواز سے، میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ میرے بارے میں آپ کو رائے قائم کرنے کا کیا حق تھا ؟ ——— میں اسی چیز سے خائف تھا ! ———"

"کس چیز سے خائف تھے آپ ؟"

"انہی باتوں سے، انہی میٹھی باتوں سے، اب شاید تھوڑی دیر میں آپ، اس سے بھی زیادہ شیریں، دل نشین، اور سحر طراز الفاظ استعمال کرنے لگیں گی !"

"لیکن یہ خیال کیوں آیا ؟"

"اس لیے کہ تمہید شروع کر دی آپ نے !"

"تمہید ؟ ——— یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟"

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں مس شہلا !"

"میرے خیال میں تو غلط ہی ہے !"

"اچھا چھوڑیئے ان باتوں کو جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا، وہ سنئے !"

"فرمایئے، ہمہ تن گوش بیٹھی ہوں !"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اب تک آپ نے شادی کیوں نہیں کی ؟"

"کچھ دیر خاموش رہ کے، لیکن کیا یہ سوال کرنے کا آپ کو حق ہے ؟ یہ حق تو میں

نے اپنی والدہ کو بھی نہیں دیا ہے !"

"گویا بہ حق آپ نے صرف اپنے لیے رز رو رکھا ہے ؟"

"یقیناً، ———— لیکن یہ بالکل غیر ضروری باتیں ہیں، ان کا سلسلہ جس قدر جلد ختم ہو جائے بہتر ہے مسٹر ندیم !"

"لیکن انہی باتوں پر اس دفتر میں میرے یا آپ کے رہنے کا سوال منحصر ہے" !"

"(ذرا برہم ہو کر) کیا آپ مجھے دھمکانا چاہتے ہیں ؟"

"نہیں مس شہلا، میں آپ سے التجا کرتا ہوں، (ہاتھ جوڑ کر) دست بستہ التجا کرتا ہوں کہ ازراہ کرم جلد از جلد کسی سے شادی کر لیجیے !"

"(بہت زیادہ برانگیختہ اور مشتعل ہو کر) مسٹر ندیم !"

"میرے یہ الفاظ شاید آپ کو گراں گزرے ہوں، لیکن میری اور آپ کی عافیت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ شادی کر لیں !"

"لیکن کیوں ؟ اس اصرار کا مطلب کیا ہے ؟ میں بالکل نہیں سمجھ سکی !"

"دیکھئے میں صاف الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیے دیتا ہوں !"

"وہی تو میں چاہتی ہوں ———— فرمایئے !"

"مجھے آپ کی وہ باتیں سن کر، جو آپ نے میرے بارے میں میرے مزاج کے بارے میں، میرے اخروٹ کے خول کی طرح سخت، اور اس کے گودے کی طرح نرم ہونے کے بارے میں جو کچھ فرمایا، اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ عنقریب آپ اظہار عشق کا سلسلہ شروع کرنے والی ہیں ————"

"(چونک کر نہایت غمگین انداز میں) کیا کہا آپ نے مسٹر ندیم ؟ کیا آپ نے مجھے اس لیے بلایا تھا کہ میری توہین کریں، بے شک میں فرومایہ، غریب اور آشفتہ روزگار ہوں، لیکن یاد رکھیے اس طرح کی باتیں میرے لیے قطعاً ناقابل برداشت ہیں، ————

آخر آپ نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟"

"حوا کی بیٹی، ———— جس کے کشتگانِ ستم میں آدم ہمیشہ سے شامل رہا ہے، اور شاید قیامت تک رہے گا!"

(اور زیادہ چراغ پا ہو کر) آپ بدتمیز ہیں، یاوہ گو ہیں، ————

"مس شہلا خفا نہ ہوئیے، میرے الفاظ سے شاید آپ کی خودی کو صدمہ پہنچا، اور آپ مشتعل ہو گئیں، اچھا اب میں اپنا مفہوم دوسرے الفاظ میں ظاہر کرتا ہوں، ————

"اپنا مفہوم اپنے پاس رکھیے میں کچھ نہیں سننا چاہتی، ————! آئندہ ————"

"نہیں نہیں، براہ کرم، میری ایک بات اور سن لیجئے، صرف ایک بات، شکریہ، کہ آپ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئیں، ہاں تو دوسرے الفاظ میں اپنا مفہوم اس طرح بیان کر سکتا ہوں کہ اگر آپ نے عشق کا اظہار نہ کیا تو آپ جانتی ہیں کیا ہوگا؟"

"میں نہیں جانتی!"

"میں جانتا ہوں!"

"میں قطعاً نہیں معلوم کرنا چاہتی کہ آپ کیا جانتے ہیں"

"میں ہر قیمت پر بتانے کو تلا ہوا ہوں" ———— پھر یہ ہوگا کہ میں آپ سے اظہارِ عشق پہ مجبور ہو جاؤں گا۔ لیکن اگر ایسا ہو تو میرا نہایت مخلصانہ اور دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ میری التجائیں ٹھکرا دیجئے گا۔ مجھے ٹھکرا دیجئے گا، میری ایک نہ سنئے گا، نہ میری اختر شماری پہ رحم کھائیے گا، نہ میری آہ و زاری پر توجہ کیجئے گا، نہ مجھے گریباں چاک دیکھ کر دلدہی کیجئے گا، نہ مجھے مجنوں اور دیوانہ پاکر لطف و نوازش کا اظہار کیجئے گا ————

"مسٹر ندیم آپ کو کیا ہو گیا ہے آپ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں پاگل ہوئی

جا رہی ہوں! "

"مس شہلا براہ کرم، قطع کلام نہ کیجئے، جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں سن لیجیے، !"

"سن تو رہی ہوں اور کس طرح سنوں؟" -

"شکریہ، ———— اگر آپ نے میرا یہ مشورہ نہ قبول کیا، یا میرے دعوائے محبت کو قبول کیا، تو اس کا لازمی نتیجہ شادی ہوگا، اور مس شہلا ———— اور مس شہلا (اور زیادہ زور دے کر) اور مس شہلا اگر ایسا ہوا تو میں سب کا گلا گھونٹ دوں گا، آپ کو زہر دے دوں گا، پھر بھی آپ بچ گئیں، تو خنجر گھونپ دوں گا آپ کے سینہ میں اور پھر پھانسی پہ چڑھ جاؤں گا، اپنے اوپر رحم کیجئے، اور مجھ سے رومان لڑانے کا خیال ترک کر دیجیے، کیوں اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہیں آپ؟"

شہلا کا غصہ کافور ہوگیا دیوانگی کی باتوں پہ اسے ہنسی آگئی، اس نے کہا "مسٹر ندیم لیکن آپ کو یہ غلط فہمی کیوں ہے کہ میں آپ سے محبت کرنے لگوں گی؟"

ندیم نے حیرت سے شہلا کی طرف دیکھا، پھر پوچھا،

"کیا آپ مجھ سے محبت نہیں کریں گی ———— ؟ بتایئے ؟"

"ہرگز نہیں، کچھ میرا دماغ چل گیا ہے جو ایسی حماقت کرنے بیٹھوں گی ؟"

"اور اگر میں نے، فرض کیجئے، میں نے محبت شروع کر دی تو آپ کا رویہ کیا ہوگا؟"

"وہی جو ہونا چاہیے!!"

"یعنی؟ میں پوچھنا چاہتا ہوں یعنی؟"

"یعنی نامنظور کر دوں گی!"

"واقعی مس شہلا؟"

"بلا شک، قطعاً!"

"کتنی اچھی ہیں آپ مس شہلا، لیکن ٹھہریئے ———— اسے کیا کردوں گی

دل کو نہیں اعتبار ہوتا، !!! آپ ایک تلوار کی طرح میرے سر پر لٹک رہی ہیں، اسی تلوار سے میرا سر ٹکرا گیا، تو میرے جی کا زیاں ہے، آپ کے لگ گئی تو آپ گئیں۔ ——

لہٰذا میری استدعا ہے ——

"کہئے، کیا استدعا ہے، !"

"میری استدعا ہے کہ شادی کر لیجئے، جلد از جلد کسی اچھے یا بُرے، غریب یا امیر، تعلیم یافتہ یا جاہل، خوب صورت یا بد رو مرد سے شادی کر لیجئے!"

"آخر میری شادی کرانے پر آپ کیوں تلے ہُوئے ہیں؟"

"تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے۔ میں آپ کی طرف سے مطمئن ہو جاؤں، مس شہلا، آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا، زندگی بھر اس احسان کو یاد رکھوں گا، گن گاتا رہوں گا، آپ کے، !"

"سنجیدگی کے ساتھ، لیکن ایک فیصلہ اس دفتر میں آنے سے پہلے کر چکی ہوں ——

—— اور وہ اٹل ہے، !"

"کیا میں وہ اٹل فیصلہ معلوم کر سکتا ہوں، !"

"جی ہاں کیوں نہیں !"

"تو فرمائیے —— میں اسے معلوم کرنا چاہتا ہوں، !"

"بہت زیادہ سنجیدہ ہو کر کہا، میرا اٹل فیصلہ یہ ہے مسٹر ندیم کہ میں کبھی شادی نہیں کروں گی، نہ غریب سے، نہ امیر سے، نہ تعلیم یافتہ سے نہ جاہل سے، نہ خوب صورت سے نہ بد رو سے، نہ کسی عاشق صادق سے، نہ کسی ہوس پرست سے، نہ کسی طرم خاں سے، طرم خاں سے مراد میری وہ مرد ہیں جو اپنے آپ کو آقا، اور عورت کو باندی سمجھتے ہیں، جیسے دھڑلے اپنی بیویوں کو اپنے اور اس کے بچوں کے سامنے اپنی اور اس کی ماں کے سامنے ٹھونک تک دیتے ہیں، !"

"ہاں کچھ لوگ اس طرح کے بھی ہیں، !"

"جی ہاں، ——— بہرحال وہ اس طرح ہوں، یا دوسری طرح کے، یا تیسری طرح کے، مجھے کسی سے شادی نہیں کرنا ہے !"

"واقعی مس شہلا ؟"

"جی ہاں مسٹر ندیم، !"

"کیا عورت بغیر مرد کے زندہ رہ سکتی ہے ؟"

"کیوں نہیں رہ سکتی، ——— کم از کم میں رہ سکتی ہوں، اسے خود اعتمادی کہہ لیجئے یا خود فریبی، بہرحال میں اسی طرح رہوں گی !"

"اس فیصلہ پر میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو مبارک باد دوں ؟ ———

اب ہماری گفتگو ختم ہو چکی ہے، نہیں مس شہلا جایئے نہیں، ابھی ابھی ایک سوال اور میرے دل میں پیدا ہوا ہے، بڑا کرم ہوگا، اگر اس کا جواب دے دیجئے۔ پھر جایئے !"

"(پھر بیٹھتے ہوئے) فرمایئے، ——— وہ سوال بھی کر ڈالیے میں ضرور جواب دوں گی، تاکہ آپ کے دل میں کوئی شبہ باقی نہ رہ جائے؛ تاکہ آپ میری طرف سے بالکل مطمئن ہو جائیں، ——— جی ؟،

اتنے سنگین اور نادر الوجود فیصلہ کی وجہ بھی تو ہوگی ؟"

"ہے، ضرور ہے !"

"کیا ؟ ——— میری اس جرأت کو معاف کیجئے، لیکن یہ سوال زبان پر آ ہی گیا !"

(حقارت کے ساتھ) اس لیے کہ میں مرد سے نفرت کرتی ہوں !"

"(خوش ہو کر) کیا کہا آپ نے ذرا پھر سے فرمایئے !"

(پوری سنجیدگی کے ساتھ) اس لیے کہ میں مرد سے نفرت کرتی ہوں !"

"آپ مرد سے نفرت کرتی ہیں۔"

"جناب، !"

"کیا واقعی ؟ "

"مجھے ایک واقعہ بھی ایسا یاد نہیں ہے کہ میں جھوٹ بولی ہوں !"

"مس شہلا آپ واقعی مرد سے نفرت کرتی ہیں ؟"

"مسٹر ندیم یقین کیجیے، میں نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے !" ———— لیکن ہر مرد سے نہیں، میں اپنے مرنے والے باپ کو آج تک نہیں بھول سکی، اور شاید کبھی نہیں بھول سکوں گی، وہ مرد ہی تھا، میں اپنے نو عمر چھوٹے بھائی خسرو کی یاد میں، یہاں دفتر میں بیٹھی کڑھتی رہتی ہوں، حالانکہ وہ بھی ہونے والا مرد ہے !"

"پھر آپ کس طرح مردوں سے نفرت کرتی ہیں !"

"صرف ان مردوں سے جن سے شادی کی جا سکتی ہے، جو عورت کی طرف سے اظہار محبت کے متمنی رہتے ہیں، یا خود مزید انتظار کی زحمت نہ اٹھا کر خود اظہار محبت شروع کر دیتے ہیں، ———— ایسے مردوں سے میں نفرت کرتی ہوں، ایسے لوگوں سے میرا اعتماد اٹھ چکا ہے !"

"اعتماد اٹھ چکا ہے !" ———— اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس فیصلہ کی تہ میں کوئی تجربہ ————

"ممکن ہے کسی تکلیف دہ تجربہ نے مجھے یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کر دیا ہو، ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو، لیکن بہر حال یہ میرا فیصلہ ہے، اور جیسا کہ میں عرض کر چکی ہوں اٹل ہے !"

"مس شہلا کن الفاظ میں بتاؤں کہ آپ کا یہ فیصلہ سن کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے ! اب مجھے آپ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے، اب میں آپ کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں !"

"شکریہ، ———— کیا اب مجھے اجازت ہے ؟"

"میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا، یقیناً آپ اکتا گئی ہوں گی، لیکن ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں، ——— کیا اجازت ہے؟"

"فرمایئے، اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں صرف اتنا معلوم کرنا چاہتا ہوں کیا آپ سچ مچ اس فیصلہ پہ قائم رہیں گی؟ ——— قائم رہ سکیں گی؟"

میرا مختصر سا جواب یہ ہے کہ "ہاں" ——— لیکن میرے پاس کوئی ایسی قوت نہیں ہے جس سے کام لے کر آپ کو یقین کرنے پر مجبور کر دوں!"

"نہیں مس شہلا، ایسا نہ کہیے، صداقت میں بڑی قوت ہوتی ہے، آپ کے لب ولہجہ سے، انداز و اسلوب سے، طور طریقہ سے صداقت برس رہی ہے، آپ کا ہر ہر لفظ سچائی کی تصویر ہے، مجھے یقین ہے آپ وہی کہہ رہی ہیں، جو آپ کے دل میں ہے، جو آپ کا مقصد ہے، جو آپ کا ارادہ ہے!"

"خیال تو میرا بھی اپنے بارے میں یہی ہے!"

"بس تو اب یہ بات طے ہو گئی کہ آپ شادی نہیں کریں گی؟"

جی ہاں بالکل طے،!"

یہ فیصلہ اٹل ہے کہ آپ کسی سے محبت نہیں کریں گی ———؟"

"بالکل اٹل ——— جس طرح موت اٹل ہوتی ہے!"

"اور یہ بھی کہ اگر کسی نے آپ سے اظہار محبت کیا تو فوراً آپ اسے ٹھکرا دیں گی؟"

"جی ہاں ——— یہی بات ہے!"

"نہ آپ اس کی آہ و زاری پہ کان دھریں گی، نہ اس کے نالہ و فغاں پر آپ کو ترس آئے گا، نہ اس کی میٹھی باتوں سے آپ متاثر ہوں گی، نہ کسی کی سفارش

اس کے باب میں قبول کریں گی؟ ——————— مس شہلا خدا کے لیے کہہ دیجیے،

ہاں!"

"پہلے بھی کہہ چکی ہوں، اور اب پھر کہتی ہوں، آپ کو میری، میری زندگی کی، میرے مستقبل کی اتنی فکر نہیں ہے جتنی میری بیوہ ماں کو ہے، جب میں نے اپنا یہ فیصلہ انہیں سنا دیا، اور وہ اس کے آخری، قطعی، اٹل ہونے کو محسوس کرنے لگیں، تو آپ جس کا مجھ سے، میری زندگی سے، میرے مستقبل سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیوں اتنے فکر مند ہوتے ہیں؟ جو کچھ کہہ رہی ہوں اسے مانئے اور نہیں مانتے تو آپ جانیں اور آپ کا کام' ———————"

نہیں مس شہلا ایسی باتیں نہ کہیے جن سے مایوسی کی کیفیت مجھ پہ طاری ہو، یا میں شک وشبہ میں مبتلا ہو جاؤں، میں مانتا ہوں کہ آپ سچ کہہ رہی ہیں!"

"شکریہ، بہت بہت شکریہ!"

"تو لایئے، ہاتھ ادھر بڑھایئے!"

"یہ کیوں؟"

"میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں، لازوال، غیر فانی، اور زندگی کی آخری سانس تک قائم رہنے والی دوستی، مس شہلا، آپ مجھے نہیں جانتیں، میں بہت مظلوم ہوں، دکھی ہوں، میری جگہ پہاڑ ہوتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ سمندر ہوتا تو خشک ہو جاتا، نہ جانے کس طرح میری سخت جانی مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے، مجھے بیوی کی، رفیقہ حیات کی، شریک زندگی کی، محبوبہ دل آرام کی ضرورت نہیں ہے، ایک دوست کی ضرورت ہے، آپ کا کیریکٹر جو کچھ اب تک میرے علم میں ہے، اس کی بنا پر مجھے یقین ہے، آپ بہترین اور شریف ترین دوست ثابت ہو سکتی ہیں، ——————— لایئے مس شہلا، ہاتھ بڑھایئے، میرا دل نہ توڑیئے

یہ کہتے کہتے ندیم کی آواز لرزنے لگی، اور شہلا؟ جیسے کسی نے زبردستی اس کا ہاتھ ندیم کے ہاتھ میں دے دیا ہو، وہ ہاتھ ملانے پر مجبور ہو گئی!،

لیکن اس مجبوری میں کچھ لطف بھی، ایک غیر ارادی لذت بھی، ——

—— کچھ استعجاب، کچھ جھجک، کچھ تامّل، ایک نئی انجان ہونی سی چیز، بظاہر بے مقصد لیکن فکر انگیز بھی،! ❖

---

(۷)

ندیم کے پاس سے رخصت ہو کر، شہلا اپنے کیبن میں آکر پھر بیٹھ گئی، ندیم فوراً ہی باہر چلا گیا، اب چاہیے تھا کہ وہ مسٹر جانسن کا دیا ہوا کام ختم کرتی، لیکن خاص نے ٹائپ رائٹر کو ہاتھ لگایا، نہ کاغذ کو، یہ کام آج ہی ختم کر کے دینا تھا، لیکن وہ اس طرح بے پروا بیٹھی تھی، جیسے کچھ کرنا ہی نہیں ہے، گم صم، حیران، پریشان، خاموش، اداس، افسردہ مضمحل!

وہ سوچ رہی تھی،

ندیم صاحب کیا ہیں؟

یہ کس ڈھب کا آدمی ہے؟ آدمی ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا، اور نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

آج اس شخص نے جو عجیب و غریب باتیں کیں، ان کا مقصد کیا تھا؟ مدعا کیا تھا؟

اس کی کیفیت کیا ہو رہی تھی؟

عجیب، دہشت ناک، حیرت انگیز اور حسرت آمیز!

کبھی غصہ سے چہرہ تمتما اٹھتا،

پھر ایسا ہوتا کہ معلوم ہوتا دم نکل رہا ہے اور اب یہ مر جائے گا،

پھر فوراً ہی یہ کیفیت ختم ہو جاتی اور ایک دوسرا سین نظر آتا، یہ محسوس ہوتا، جیسے

شدت الم سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے،

اتنی مختصر سی مدت میں، ایک ہی مجلس کے اندر، ایک ہی آدمی کے ساتھ گفتگو کے دوران میں حالت اور کیفیت کا یہ تغیر کوئی معمولی بات نہیں ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا،

ایک کامیاب ترین ایکٹر بھی، ——— ایک کیریکٹر ایکٹر بھی اپنے چہرے بشرے پر، اپنے انداز و اطوار پر، اپنے لب ولہجہ پر، اپنے الفاظ اور ادائے بیان پر اتنی قدرت نہیں رکھتا کہ چند لمحوں کے اندر کچھ سے کچھ ہو جائے،

یہ کچھ سے کچھ ہو جانا نہیں تو کیا ہے، کہ ابھی برہمی، ابھی التجا، ابھی اضطراب، ابھی دیوانگی، ابھی دوستی ———

برہمی کی کیفیت جب طاری ہوئی تو آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا، التجا کا لہجہ اختیار کیا تو مدلیو زہ گر بن گیا، اضطراب کی کیفیت نمایاں ہوئی تو جنونی کی سرحد تک پہنچ گیا، دیوانگی کے اثرات نمایاں ہوئے، تو صرف گریباں پھاڑنے کی کسر رہ گئی، اور، ——— اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو وہ گرم جوشی۔ وہ تپاک، وہ اپنائیت کہ خدا کی پناہ!

کبھی جی چاہتا ہے کہ اسے دیوانہ سمجھ لوں، ——— لیکن اس آدمی کو دیوانہ سمجھنے والا کیا خود دیوانہ نہیں ہے، جو نہایت بیدار مغزی کے ساتھ، ایک غیر ملکی فرم کو چلا رہا ہے، مینجنگ ڈائرکٹر دونوں انگریز ہیں، باہوش، تجربہ کار، قابل، مستعد، جفاکش، لیکن اس دیوانے کی قابلیت، اہلیت، محنت، دیانت اور اس کی صداقت کے سامنے پانی بھرتے ہیں ——— یہ دیوانہ ہے، دیوانے ایسے ہی ہوتے ہیں؟

کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اسے بے وقوف سمجھوں، لیکن جس کے سامنے بڑے بڑے عقلمند سر جھکاتے ہوں اسے کوئی بے وقوف ہی بے وقوف کہہ سکتا ہے، میں تو یہ حماقت نہیں کر سکتی،

پھر یہ کیا ہے؟

میں اسے کیا سمجھوں؟

یہاں اگر عقل جواب دے دیتی ہے، دانش روپوش ہو جاتی ہے، گوش و ہوش بیکار جاتے ہیں،

اچھا ایک اور سوال بھی تو پیدا ہوتا ہے،

آخر یہ نوازش میرے ہی اوپر کیوں ہے؟ مجھی کو کیوں خواہ مخواہ ہدف عتاب اور ساتھ ہی ساتھ مورد کرم بنایا گیا ہے؟

مجھے حکم دیا جاتا ہے کہ شادی کروں، جلد سے جلد کسی مرد کے حبالۂ عقد میں آ جاؤں،

لیکن کیوں صاحب ایسا کیوں اور کس لیے کروں؟

اس لیے کہ اعلیٰ حضرت کو اندیشہ ہے کہ کہیں میں اظہار محبت نہ شروع کر دوں، لیکن چونکہ یہ اندیشہ بے بنیاد ہے، اس لیے کہ نہ میں نے ایسا کیا، نہ ایسا خیال کبھی میرے دل میں آیا، نہ زندگی کی ٹھوکر نے مجھے اس قابل رکھا ہے کہ ایسے خیال کے قریب بھی بھٹک سکوں،

ہاں تو چونکہ یہ اندیشہ بے بنیاد نظر آیا کہ میں اظہار محبت شروع کر دوں گی۔ اس لیے فوراً ہی ایک دوسرا خیال اعلیٰ حضرت کے قلب ناصبور میں پیدا ہوا،

یعنی کہیں وہ خود عشق نہ شروع کر دیں اس خاکسار سے،

اچھا صاحب اگر آپ عشق کرنا چاہتے ہیں تو کیجئے، نہ جانے کتنے آدمی ہیں جو اس مرض میں مبتلا ہیں، ان لاعلاج بیماروں کی فہرست میں ایک نیا نام اور سہی،

جانِ ناتواں پھنس گئی ہے؟ اس سے گلو خلاصی کی کوئی صورت نکل سکتی ہے یا نہیں؟

میرے اللہ!

یہ شخص تو ایک ناقابلِ حل معمّہ ہے، جسے بوجھنا، حل کرنا، ممکن نہیں، یہ پھول بھی اور کانٹا بھی، ریشم بھی اور خنجر بھی، آدمی بھی اور حیوان بھی، —— کیونکر اس کی نگہ ناز سے جینا ہوگا؟

لیکن نہیں!!

اعلیٰ حضرت اس لئے بیتے تیار نہیں ہیں کہ عشق کریں ــــــــــ اور شادی بھی کریں،!

لیکن اگر عشق فرمایا، اور شادی کی زحمت گوارا فرمائی، تو میرا گلا گھونٹ دیں گے مجھے زہر دے دیں گے، میرے سینہ میں خنجر گھونپ دیں گے،!

یا اللہ ــــــــــ ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟

خود ہی شادی کریں گے، خود ہی عشق کریں گے، اور پھر اپنی مفروضہ بیوی کو یعنی مجھے ہلاک کر دیں گے،

لیکن چونکہ میرے اخلاق، کردار، اور سیرت کو پسند کرتے ہیں۔ــــــــــ

ــــــــــ مجھے پسند کرتے ہیں، اور میرے ان صفات تک ان کی رسائی کسی طرح ہوئی؟ میں نہیں جانتی لہٰذا عشق سے بھی دست بردار شادی کے ارادہ سے بھی دست کش، دوستی کرنا چاہتے ہیں!

آہ وہ دوستی کا بڑا ہوا تھا جس میں تلخی بھی تھی، اور لچک بھی، دعوت بھی اور لطافت بھی،!

لیکن دوستی بھی کیوں؟

کیا ضرورت ہے دوستی کرنے کی؟

اور وہ بھی اس طرح کہ ہاتھ کانپ رہا ہے، پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں۔ آواز نکلنے رہی ہے آنکھوں میں آنسو ستارے کی طرح جگمگا رہے ہیں!!

یا اللہ، یہ کیا معمہ ہے؟ اس پہیلی کو میرے حصہ میں کیوں ڈالا تھا۔

میں کیا کروں؟

اس مصیبت سے چھٹکارا کس طرح پاؤں؟ یہ کس جنجال میں میری

(۴۳)

میرے اللہ!

ملی ہی دل میں یہ الفاظ اس کی زبان پہ آئے تھے کہ روشن خاں چائے کی پیالی لے کر آگیا،

دفتر کی طرف سے سہ پہر کی چائے، ——— ایک کپ، اور دو بسکٹ ——— اسٹاف کی خدمت میں پیش کیے جاتے تھے، بسکٹ سے تو کچھ ایسی زیادہ نہیں لیکن چائے سے اسے بہت رغبت تھی، گھر پہ بھی کئی مرتبہ پیا کرتی تھی، ماہ خاتون اگر چہیتی بیٹی کی کسی بات سے عاجز تھیں، تو اسی چائے نوشی کے شوق سے، دفتر میں بھی اگر کسی دن دیر ہو جاتی تو روشن خاں سے وہ مطالبہ کرتی،

جاؤ دیکھو چائے کیوں نہیں آئی آج اب تک!'

لیکن آج سامنے گرما گرم چائے کی پیالی رکھی تھی، بھاپ اٹھ رہی تھی، لیکن طبیعت راغب نہ ہوئی، اس نے روشن خاں سے کہا،

"روشن خاں تم پی لو!"

روشن خاں نے نہایت استغنا سے جواب دیا،

"ہم تو پی چکا، یہ آپ کے لیے لایا ہے بیبی!"

وہ التجا کرتی ہوئی بولی،

نہیں روشن خاں آج میرا جی نہیں چاہ رہا ہے، ایک کے بجائے دو پیالی تم ہی پی جاؤ، اللہ کا نام لے کے!

روشن خاں کو کیا تامل ہو سکتا تھا، اس نے چائے اٹھائی اور باہر جا کر ایک ساتھ ہی دونوں بسکٹ کھائے چائے غٹا غٹ پی گیا، وہ ہمیشہ چائے اسی طرح پیتا تھا، —— خواہ وہ کتنی ہی گرم ہو، جس طرح لوگ پانی پیا کرتے ہیں ——

اور شہلا پھر اپنے خیالات کی دنیا میں پہنچ گئی، !

وہ سوچ رہی تھی، !

ایک لڑکی کے لیے باپ کا سہارا کتنی بڑی نعمت ہے، وہ اس کی آبرو کا محافظ ہوتا ہے، اس کے مصارف کا کفیل ہوتا ہے، اسے مصیبتوں سے بچاتا ہے، اس کی زندگی خوشگوار بنانے کے لیے جو کچھ ممکن ہو سکتا ہے کرتا ہے، اس کی شادی میں اپنی پونجی صرف کر دیتا ہے،

لیکن میں کتنی بد قسمت ہوں، کتنی سیہ بخت ہوں!

خدا نے مجھے ایک باپ دیا تھا، محبت کرنے والا، شفقت کرنے والا، میری تکلیف سے بے قرار ہو جانے والا باپ!

لیکن جس خدا نے مجھے یہ نعمت دی تھی، اس نے یہ نعمت چھین بھی لی!

جب تک میرا باپ زندہ تھا، مجھے کوئی فکر نہ تھی، کوئی اندیشہ نہ تھا، کسی طرح کا غم نہ تھا، زندگی کی ایک بہار جاوداں تھی، ایک چمن پر بہار، جسے نہ خزاں کا دھڑکا تھا، نہ پامالی کا اندیشہ، ہر وقت خوشی کے چہچہے، نغمے، قہقہے، آج یہ عزیز آ رہا ہے، کل وہ عزیز جا رہا ہے، آج یہاں تقریب ہے کل وہاں جلسہ ہے،

میری سالگرہ کے جلسے کتنی دھوم دھام سے ہوتے تھے!

کالج میں اپنی سہیلیوں کے مقابلہ میں میرا درجہ ہر حیثیت سے کتنا اونچا تھا!

لیکن باپ کے مرتے ہی سب کچھ ختم ہو گیا'! ———— نہ وہ بہار رہی، نہ وہ چمن، نہ وہ بے فکری کا دور رہا، نہ وہ خود فراموشی کا زمانہ، نہ وہ دل لگی اور قہقہے رہے نہ وہ نغمے اور ترانے، خزاں کے ایک جھونکے نے ہر چیز تہس نہس کرکے، غارت کرکے رکھ دی، وہی گھر جہاں ہمہ وقت شادیانے بجا کرتے تھے اب ماتم سرا بن گیا جہاں امید کی روشنی چمکا کرتی تھی، وہاں یاس کی تاریکی چھا گئی'

لیکن میں نے غلط کہا۔!

یاس کے اس اندھیرے میں روشنی کا ایک چراغ اپنی جوت سے میرے سیہ خانۂ قلب کو منور کیے ہوئے تھا!

مراد، میرا، صرف میرا مراد'

ہاں مراد، جسے دیکھ کر امی کا دل پھول کی طرح کھل جاتا تھا، جسے پاکر میرے باپ کو اتنی خوشی ہوئی تھی جیسے اسے دولت جاوداں مل گئی ہو'

جو میرا پھپھی زاد بھائی تھا!

ابا کو اپنی بہن سے عشق تھا، اس لیے اس کے بیٹے پر بھی ہزار جان سے فدا تھے'!

اور یہ ابا کی بہن کا بیٹا ہزار جان سے مجھ پر فدا تھا'!

خوش رو، خوش اندام، خوش قامت، تعلیم یافتہ، باذوق، لیکن جس کی باتوں میں وہ رس تھا کہ ———— کسی کی آنکھ میں جادو تو سے بیان میں ہے'!

مراد آتا تھا، تو ہمارے گھر میں عجیب طرح کی چہل پہل شروع ہو جاتی تھی، فوراً ابا حکم صادر کرتے تھے،

"وہ بھی چائے لاؤ، مراد کو چائے پلا بھی آگے!"

امی جھٹ چائے تیار کرنے کا حکم دیتیں اور خود، پکوڑے، پھلکیاں، تلے ہوئے مرغ

ابلے ہوئے انڈے، اور نہ جانے کیا کیا تیار کرنے بیٹھ جاتیں،

صرف اسی پہ اکتفا نہ کرتیں فوراً سائیکل پر نوکر کو دوڑا ہی کو جا۔ فلاں فلاں، چیزیں لیتے آؤ، وہی رس گلے، برفی، گلاب جامن یا بالوشاہی موتی چور کے لڈو، اور بہت سی الم غلم چیزیں"

بیٹی میں یہ سب چیزیں رکھ کر ایک کمرہ میں پہنچا دی جاتیں، اور وہ اصرار کر کر کے مراد کو یہ سب چیزیں کھانے پر مجبور کرتے۔

لیکن ——

لیکن مراد کو ان چیزوں میں لذت نہ ملی، وہ تو مجھ سے باتیں کرنے، میرا دیدار کرنے، میرے حسن جہاں سوز کا نظارہ کرنے، میری تبسم سے گوں، میرے رخسار گلعذار، میری قامت زیبا میری زلف عنبریں کا نظارہ کرنے آتا تھا، ——— یہ الفاظ اسی سے تو اتنی دفعہ سننا پڑے کہ بالآخر مجھے یاد ہو گئے ——— پھر ابا کو چکما دے کر امی کو بہلاوے میں ڈال کر نوذیہ کو چاکلیٹ کی رشوت دے کر، خسرو کو ٹافیوں کا ڈبہ دے کو کسی نہ کسی طرح، میرے پاس بھاگا بھاگا آتا تھا،

صرف چند منٹ کے لیے،!

صرف مجھے ایک نظر دیکھ لینے کے لیے !

صرف میری آواز سننے اور مجھ سے دو باتیں کرنے کے لیے،!

لیکن یہ دو منٹ، پندرہ بیس منٹ کے ہونے تھے،!

پھر امی کی آہٹ پا کر میں اسے دھکیلتی'

اب جاؤ- امی آگئیں تو نہ تمہاری خیر ہے، نہ میری !

وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں دوسرے دروازے سے نکل جاتا،!

اور پھر یہ پندرہ بیس منٹ کی ملاقات پہروں گھنٹوں، دنوں، میرے دل و دماغ پر مسلّط رہتی۔

میں خود بھی تو مراد سے محبت کرنے لگی تھی، !

اور کیسے نہ کرتی ؟

مراد ہر اعتبار سے ہزاروں میں یکتا تھا، صورت انتخاب، سیرت لاجواب، !

اور پھر میرے لیے اس نے ایثار بھی کتنا کیا تھا، !

رقیہ اس کی چچازاد بہن تھی، اور ایمان کی بات یہ ہے کہ خوب صورت تھی، اور بے پناہ خوب صورت تھی، جب بھی میری اس سے ملاقات ہوئی، میں اس کے حسن سے متاثر ہوئی، ——————— اور صرف خوب صورت ہی نہیں دولت مند بھی تھی، بیس ہزار روپیہ نقد اس کے نام پر بنک میں باپ نے جمع کرا دیا تھا، زیورات اور قیمتی پارچہ جات اور گراں بہا جہیز الگ، !

لیکن مراد نے ان سب چیزوں کو ٹھکرا دیا، !

مراد نے باپ سے بغاوت کی، اور صاف صاف کہہ دیا کہ وہ شہلا کے سوا کسی سے شادی نہیں کر سکتا، !

بڑا ہنگامہ ہوا، !

لیکن مراد کی بات بالا رہی، اس کی ماں نے، یعنی میری پھپھی نے میرے باپ کی سگی بہن نے بیٹے کا ساتھ دیا، اور شوہر سے لڑ پڑیں، انھوں نے کہا، کیا میری شہلا، رقیہ سے کم ہے، انھوں نے شوہر سے سوال کیا، کیا، شہلا رقیہ سے غریب ہے ؟ انھوں نے پوچھا کیا لڑکے پر صرف باپ کا حق ہوتا ہے، ماں کا نہیں ہوتا جو اسے پیدا کرتی ہے، پالتی ہے پوستی ہے، اس کے لیے طرح طرح کی تکلیفیں جھیلتی ہے،

ان دلائل کے سامنے، ان کے شوہر یعنی میرے پھپا نہ ٹھہر سکے انھیں ہتھیار ڈال دینا پڑے،

مراد سے میری منگنی ہو گئی، !

کتنی خوش تھیں پھپھی اپنی اس کامیابی پر! ——————— گویا انھوں نے شوہر کو نہیں، سکندر اعظم کو شکست دے دی تھی!

کتنی خوش تھیں بڑی اماں اس واقعے سے، گویا ان کی لڑکی کا مستقبل سنور گیا، ——— انھیں ایک لائق فائق، خوب صورت اور سعادت مند داماد مل گیا،

کتنا خوش تھا بیلا مرنے والا باپ اس رشتے سے، گویا اس کی بیٹی جہنم سے نکل کر جنت میں پہنچ گئی گویا اسے سب کچھ مل گیا، !

اور کتنی خوش تھی میں خود، !

دل ہی دل میں کیسے کیسے منصوبے بناتی تھی، !

مراد میرا ہو گیا، شادی کے بعد ہم دونوں یوں ویسی اس طرح زندگی بسر کریں گے، میں مراد کا ہاتھ بٹاؤں گی، وہ سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہو چکا ہے، ترقی کرے گا، عروج حاصل کرے گا، نام پائے گا، میں اس کی خدمت کروں گی اور اپنی خستہ اور درماندہ مظلوم و مجبور بہنوں کی خدمت کروں گی، ان کے حقوق کے لیے جد و جہد کروں گی،

اور ہم سب سے زیادہ خوش، مسرور، اور پیکرِ نشاط، ایک اور ہستی بھی تو تھی، !

مراد، !

پھپھی نے، ابّا نے، امی نے، میں نے کسی نے، نسبت کے اس اعلان پر ایسی دیوانگی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا جو مراد کی طرف سے ظاہر ہوئی، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہیں جوشِ مسرّت سے پاگل نہ ہو جائے اس کے چہرے پر رونق بھی تھی وہ ہر وقت مسکراتا اور ہنستا رہتا تھا، !

وہ خوشی کا زمانہ، !

وہ نہ بھولنے والا زمانہ'!

وہ ہمیشہ یاد رہنے والا زمانہ'!

آہ،!

آتا ہے یاد ہر دم گزرا ہوا زمانہ'!

لاکھ لاکھ، اس زمانہ کو دل سے بھلاتی ہوں، لیکن اب بھی کبھی کبھی یاد آجاتا ہے، پہلے اس زمانہ کو یاد کر کے دل خوش ہوتا تھا، اب دل پہ گھونسہ لگتا ہے' اپنے وجود تک سے نفرت ہونے لگی ہے' دنیا سے نفرت ہونے لگی ہے، ہائے —— غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا'! •

آہ"!

شہلا کے دل کی زبان پر یہ لفظ آیا تھا کہ روشن خاں پھر حاضر ہوا، اس نے کہا،

"جانسن صاحب بولتا ہے، ہمارا کاغذ ٹائپ ہو گیا ہو گا لے آؤ!"

شہلا چونک پڑی، اس نے پوچھا،

"کاغذ، ————"

اور پھر اس نے ٹائپ رائٹر کی طرف دیکھا، اور اس کے بعد، روشن خاں سے گویا ہوئی،

"دیکھ نہیں رہے میری طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے، میں نے چائے تک نہیں پی، ————"

روشن خاں نے لقمہ دیا،

"ہاں وہ تو ہم اچھی طرح دیکھ رہا ہے!"

شہلا نے قدرے تنک کر، تیوری چڑھاتے ہوئے کہا،

جاؤ کہہ دو کاغذات کل ملیں گے!"

روشن خاں نے ایک مرتبہ اپنا ڈنڈا فرش پر مارا، اور گویا ہوا،

"ہم ابھی جا کر کہہ دے گا، طبیعت خراب ہے تو کیسے کام کر سکتا ہے !"

یہ کہہ کر روشن خاں چلا گیا، اس کے جانے کے بعد، شہلا پھر ماسوا سے بے نیاز و بے پرواہ ہو کر، اپنے خیالات کی دنیا میں پہنچ گئی جہاں اس کے سوا کوئی نہ تھا !

آہ !

لیکن یہ خوشی کتنی عارضی ثابت ہوئی !

ابا جان کا انتقال ہو گیا،

اور ان کے انتقال کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ————— خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا !

نہ وہ گھر رہا نہ وہ رونق، نہ وہ خوشی رہی نہ عیش و مسرت، نہ وہ بے فکری رہی، نہ ٹھاٹھ باٹھ، نہ وہ آسودگی رہی، نہ اطمینان، !

ابا جان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ ان کی دولت مندی کے بارے میں لوگوں نے جو حسن ظن قائم کر لیا تھا وہ غلط فہمی پر مبنی تھا !

ابا جان بے شک ٹھاٹھ سے رہتے تھے لیکن دولت مند نہیں تھے، وہ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو مقروض تھے !

بینک بیلنس جس کے بارے میں عام خیال تھا کہ ایک لاکھ کے لگ بھگ ہو گا، صرف چند سو نکلا،

مکان کرایہ پر تھا جائداد کوئی تھی نہیں !

اس میں کوئی شبہ نہیں وہ بڑے رسا آدمی تھے۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں برکت بھی بہت دی تھی، مختصر سی آمدنی بھی ان کے پاس آکر، وہ کام کر دکھاتی تھی، جو دولت مند سے نہیں ہو پاتے، ان کی آمدنی بارہ پندرہ سو روپے ماہوار سے زیادہ نہ تھی، لیکن لوگ ان کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر سمجھتے تھے چار پانچ ہزار ہے، ان کے پاس موٹر بھی

تھا، کوئی بھی، بغیر تجربہ بھی، کئی کئی نوکر بھی،

پھر جب اباجان کا انتقال ہو گیا، اور ان کے انتقال کے ساتھ ہی ہمارا بھرم بھی کھل گیا،!

آمدنی بند، خرچ موجود، وسائل ناپید!

پھر اب کیا ہو گا؟

اباجان کے انتقال کے بعد سب سے پہلا خیال قدرتاً میرے دل میں یہی پیدا ہوا۔

نگاہ، معاً مراد کی طرف گئی!

وہ تحصیلداری کے لیے نامزد ہو کر ایک دوسرے شہر نصیر آباد میں متعین ہو چکا تھا،

چیز کم ہی بہت جلد ڈپٹی کلکٹر ہو جائے گا،!

میرا دل کہتا تھا، مراد آئے گا، ضرور آئے گا!

وہ میرے ٹوٹے ہوئے دل کو سہارا دے گا، وہ میرے آنسو پونچھے گا، وہ پریشانی کے اس دور میں میرا سہارا ثابت ہو گا، مایوسی کی اس تاریکی میں امید کی روشنی ثابت ہو گا،

لیکن کیا ایسا ہوا؟

کیا مراد آیا؟

نہیں، وہ ایک بھولا ہوا خواب اور گزرا ہوا زمانہ بن گیا،

وہ نہیں آیا، وہ پھر کبھی نہیں آیا، وہ ایک غریب لڑکی کو بھول گیا، اس نے ایک بے مایہ لڑکی سے ناطہ کرنا مناسب نہ سمجھا، اس نے چند ہی روز بعد اپنے چچا کی لڑکی رقیہ سے شادی کر لی، بڑی دھوم دھام سے برات آئی، بڑی شان و شوکت سے نکاح ہوا، بڑے جاہ و تجمل سے دلہن رخصت ہوئی، دعوتوں، پارٹیوں، جلسوں، محفلوں، مجلسوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا، اور کئی دن تک جاری رہا،!

یہ سب کچھ اسی شہر میں ہوا، اسی شہر میں — جہاں شہلا رہتی تھی، جس سے وہ محبت

کرتا تھا، جس سے اسے عشق تھا، جسے دیکھ کر وہ جیتا تھا، جس سے ملنے کے لیے طرح طرح کے بہانے ایجاد کیا کرتا تھا، جس سے گھنٹوں اور پہروں دل کی باتیں کیا کرتا تھا، جس سے گھنٹوں اور پہر دل آئندہ زندگی کے پروگرام پر بحث و گفتگو ہوا کرتی تھی ——

—— وہ شہلا سے نہیں ملا، اسے تسلی دینے بھی نہیں آیا، اپنی شادی کے موقع پر اس نے شہلا کو بلایا بھی نہیں، جھوٹوں بھی نہیں پوچھا!! —— نہ اس سے تعزیت کی، نہ اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کی کوشش کی،،!

خود ہمیں بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ ابّا جو کچھ کماتے ہیں سب صرف کر دیتے ہیں، ہمارا خیال یہی تھا ان کے پاس کافی روپیہ جمع ہے، لیکن میں ابّا سے اس لیے تو محبت نہیں کرتی تھی کہ وہ مال دار ہیں، کیا مراد مجھ سے اس لیے محبت کرتا تھا کہ میں دولت مند ہوں؟ دولت مند باپ کی بیٹی ہوں،،؟

کیا عشق اندھا نہیں ہوتا، اس کی اتنی بڑی بڑی آنکھیں ہوتی ہیں کہ تھیلیوں اور تجوریوں کا جائزہ لے لیتی ہیں،!

ہاں میرے ابّا دولت مند تھے، یہ معلوم کرنے کے بعد بھی میں ان سے محبت کرتی رہی، یہ معلوم کر کے کہ انھوں نے کچھ نہیں چھوڑا، مجھے کوئی شاک نہیں لگا، بلکہ میرا دل فخر سے معمور ہو گیا، ہاں انھوں نے کچھ نہیں چھوڑا، جس طرح اس دنیا میں خالی ہاتھ آئے تھے، اسی طرح اس دنیا سے خالی ہاتھ گئے، لیکن جب تک زندہ رہے، جب تک کماتے رہے، کیا انھوں نے اپنے ضرورت مند رشتہ داروں کی خدمت نہیں کی؟ آڑے وقت میں ان کے کام نہیں آئے؟

کیا انھوں نے کسی کی مدد نہیں کی؟

کیا چچا جب ایک ۳۰۲ کے مقدمہ میں گرفتار ہوئے تھے تو وہ میرے ابّا ہی نہیں تھے، جنھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر، حوالات میں انھیں ہر طرح کا آرام

پہنچایا، نہ جانے کیا کیا جتن کیے اور ان کی ضمانت منظور کرائی، بڑے بڑے وکیلوں کو مقدمہ لڑنے پر مامور کیا اور ان کی فیس اپنی جیب سے ادا کی، اور جب تک انھیں رہا نہ کروا لیا، آرام نہ لیا، اور جب رہائی کے بعد پھوپا کے حالات پھر سنبھل گئے اور انھوں نے چاہا کہ ابا جان کو وہ ہزاروں روپے واپس کر دیں جو انھوں نے مقدمے پر صرف کیے تھے، تو کس شان سے ابا جان نے یہ رقم لینے سے انکار کر دیا تھا، اور کس اطمینان سے پھوپا نے ان کے انکار کو قبول کر لیا تھا، اور اس انکار پہ پھوپی تو خوشی کے مارے جامہ میں نہیں پھولی سمارہی تھیں، اور پھر جب مراد سول سروس کے امتحان میں بیٹھا تو اسے کامیاب کرانے کے لیے ابا نے کیا کچھ کیا، یہ تو میں نہیں جانتی ہاں یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ پھوپا اور پھوپی اور مراد تینوں نے ابا سے یہ الفاظ کہے تھے

یہ جو کچھ ہوا ہے صرف آپ کی وجہ سے ہوا ہے'!"

اور ابا نے شان استغنا سے کہا تھا،

"کیا مراد میرا لڑکا نہیں ہے !"

اس جواب پہ مراد کا چہرہ دمکنے لگا تھا، پھوپی نہال ہوگئی تھیں اور پھوپا پہ وجد کا عالم طاری ہو گیا تھا، دونوں میاں بیوی نے متفق ہو کر کہا تھا،

"بے شک آپ کا لڑکا ہے، !"

تو کیا مرتے ہی میرے باپ کی یہ سب باتیں فراموش ہو گئیں، کیا یہ کارنامے اسی قابل تھے کہ انھیں وقف طاق نسیاں کر دیا جاتا؟ کیا احسان مندی، شرافت اور انسانیت کا یہی تقاضا تھا کہ اپنے محسن کی وفات پر تعزیت بھی نہ کی جائے، اس کی بیوہ کے آنسو تک نہ پونچھے جائیں اس کی لڑکی کو دل دہی کا مستحق بھی نہ سمجھا جائے،

بہر حال پھوپا نے، پھوپی نے، ——— اور مراد نے بھی کیا۔!

پھر مراد کی صورت مجھے دکھائی نہیں دی، فرید پور میں اب وہ آتا بھی نہیں، سنا ہے نصیر آباد میں کوٹھی بنالی ہے، اب وہی اس کا وطن ہے، —— —— مبارک،

مراد کی اس روش نے میرا دل توڑ دیا،

جو لوگ دل کو شیشہ سے، آبگینہ سے تشبیہ دیتے ہیں وہ غلط نہیں کہتے میں تو ایسا ہی محسوس کرتی ہوں، جیسے ایک شیشہ تھا، جو گرا، اور چکنا چور ہو گیا،

اس واقعہ کے بعد، ایک عجیب انقلاب میرے اندر پیدا ہوا،
مرد کی ذات سے میرا اعتماد اٹھ گیا،

نہ جانے کیا بات ہے، جو مرد مجھے نظر آتا ہے، مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہیں یہ مراد تو نہیں ہے؟ کہیں اس لباس میں مراد تو چھپا ہوا نہیں ہے!؟

اور مجھ سے ندیم صاحب فرما رہے ہیں کہیں تم مجھ سے عشق نہ کرنے لگنا،!

میں عشق کروں گی؟ —— این خیال است و محال است و جنون"!

اتنے میں روشن خان پھر آیا،

"بہت دیر ہو گیا صاحب، اب دفتر بند کرے گا"!

شہلا اٹھ کھڑی ہوئی،

"بند کر دو"!"

(۵)

روشن خاں نے دفتر بند کر دیا!

شہلا گھر آئی، لیکن آج کی شہلا میں اور روز کی شہلا میں فرق تھا، ہر روز جب وہ دفتر سے آتی، تو فوزیہ اور خسرو سے بڑی دیر تک کھیلتی، ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی انھیں لطیفے سناتی، پھر انھیں سبق پڑھاتی، یاد کراتی، پھر ماں سے مختلف موضوعات پر گفتگو اور تبادلہ خیالات کرتی، اس کی باتیں گوش ہوش سے سنتی، پھر بھائی بہن کو سلا کر ماں کے سرہانے پانی کا بھرا ہوا لوٹا، سامنے تپائی پر پاندان اور بٹوہ رکھ کر اپنا کورس کھول کے بیٹھ جاتی، چونکہ امتحانات کا زمانہ قریب آگیا تھا اس لیے آج کل بڑی دیر تک پڑھتی، کبھی کبھی تو رات کے ۲ بج جاتے،

لیکن آج ———— ؟

آج اس نے نہ فوزیہ پر توجہ کی نہ خسرو پر، کھانا کھایا، ذرا دیر ماں سے باتیں کیں، پھر لوٹا اور پاندان رکھ کر، اپنے کورس کی کتابیں کھول کر بیٹھ گئی، ماہ خانون نے بھی یہ سوچ کے کہ امتحان کا زمانہ قریب ہے لڑکی کو زیادہ باتوں میں نہیں الجھانا چاہیے، کوئی نیا مسئلہ نہیں چھیڑا،

شہلا کتابیں کھول کر بیٹھ گئی، لیکن اس کا دل نہ جانے کہاں تھا؟ اس کے خیالات نہ جانے کہاں کہاں کی گردش کر رہے تھے،

وہ سوچ رہی تھی'، !

میں نے مراد سے کیوں اتنی امیدیں وابستہ کر لیں تھیں کہ ان کی ناکامی پہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا؟ ——— ؟

میں نے شروع ہی سے اسے جھوٹا، دغاباز اور فریبی کیوں نہیں سمجھا؟"

وہ مجھ سے کھیلتا رہا اور میں کھلونا بنی رہی'، !

وہ مجھے بے وقوف بناتا رہا، اور میں بے وقوف بنتی رہی'، !

ایک دن اس نے مجھ سے آنکھیں پھیر لیں' اور میں کچھ نہ کر سکی، نہ اس کا گریبان پکڑ سکی، نہ اپنا دامن اس کے ہاتھ میں دے سکی،

اور سچ تو ہے مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی'، !

ابا کے انتقال پر ملال کا غم تازہ تھا کہ مراد نے دھوکا دیا، مراد کا داغ جدائی ابھی نہ پایا تھا کہ گھر میں فاقہ ہونے لگا،

وہ تو خدا مسٹر ایڈورڈ کا بھلا کرے، اگر رالین کمپنی میں جگہ نہ مل گئی ہوتی تو میری بیچاری ماں کیا کرتی؟ میری ننھی سی فوریہ کا کیا حشر ہوتا؟ میرے دلارے پیارے حسن و گُرا کے سے فاقے کرنا پڑتا، واقعی ایڈورڈ صاحب آدمی کے روپ میں فرشتہ ہیں، ان کا کہنا تو یہ ہے کہ تمام امیدواروں میں مجھے موزوں ترین پاکر انھوں نے ملازمت دی، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ مجھ پر انھوں نے رحم کیا، ترس کھایا جب تک زندہ ہوں، ان کے اس احسان کو فراموش نہیں کر سکوں گی !

مسٹر جانسن بھی بھلے آدمی ہیں، زیادہ سے زیادہ رعایت کرتے ہیں، ہر قسم کی سہولت دیتے ہیں'

اور ہاں وہ میرے پرانے کرم فرما، اور نئے دوست ندیم صاحب ———
——— زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا! !"

وہ تو میرے لیے ایک معمہ بن کر رہ گئے ہیں، ——— نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا، !

نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی کہ ایڈورڈ صاحب نے مجھے ان حضرت کے سپرد کیا، خود تو لندن میں مزے کر رہے ہیں ——— سنا ہے اب کے شادی کر کے آئیں گے، اور مجھے یہاں پھانسی کے تختہ پر کھڑا کر گئے، بھلا یہ پھانسی کا تختہ نہیں تو اور کیا ہے، کبھی گلا گھونٹنے کی دھمکی دی جاتی ہے، کبھی زہر دینے کی، کبھی سینہ میں خنجر پیوست کرنے کی، کبھی فرمایا جاتا ہے خبردار جو ہم سے عشق کیا، کبھی ارشاد ہوتا ہے اگر ہم نے عشق کیا تو بھی تمہاری خیریت نہیں حالانکہ نہ مجھ میں عشق کرنے کی سکت ہے، نہ خود مایدولت میں یہ صلاحیت، !

لیکن ایک بات جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی یہ ہے کہ آخر اس نیم دیوانگی کا راز کیا ہے ؟ کیا یہ راز کبھی نکل سکتا ہے ؟

دوسری بات جو اور زیادہ ناقابل فہم ہے، یہ ہے کہ آخر ان تمام ارشادات کی مخاطب میں ہی کیوں ہوں ؟ وہ بھی اس شدت کے ساتھ کہ کبھی دھمکی ہے، کبھی التجا، بہر حال ——— جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا، !

(۶)

رات بڑی دیر تک شہلا انہی خیالات پریشان میں گرفتار رہی، صبح دیر سے آنکھ کھلی، وہ بھی اس وقت جب ماہ خاتون نے جگایا،

"اُرے بیٹی سورج سر پہ چڑھ آیا اور تم اب تک سو رہی ہو، ؟"

شہلا گھبڑا کر اٹھ بیٹھی،

"ارے ـــــــــــ "

ماہ خاتون نے پوچھا،

"طبیعت تو ٹھیک ہے میری بچی، ؟"

شہلا نے اُٹھتے ہوئے کہا،

امی رات بڑی دیر تک کورس کی کتابیں پڑھتی رہی،"

ماہ خاتون نے جھلا کر کہا،

"بھاڑ میں جائیں تمہاری کورس کی کتابیں، کچھ جان دینی ہے خبردار جو اب گیارہ بجے کے بعد جاگی، !"

شہلا نے کوئی جواب نہیں دیا، مسکراتی ہوئی اٹھی، جلدی جلدی نہادھو کر باس بدلا، ناشتہ کیا، اور دفتر کی طرف روانہ ہو گئی،

ظاہر ہے دفتر وقت پر نہیں پہنچی، روشن خاں دروازے پر کھڑے نسوار سے شغل

کر رہے تھے، دیکھتے ہی گویا ہوا،

"صاحب تو آگیا"!

شہلا نے کہا،

"آجانے دو"!

پھر وہ اپنے کیبن میں آکر بیٹھ گئی، تھوڑی دیر کے بعد گھنٹی بجی اور روشن خاں نے فرمان سنایا،!"

"صاحب بلاتا ہے"!

شہلا نے حسب عادت کاپی پنسل سنبھالی اور صاحب کے دربار میں پہنچ گئی، آج ندیم کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا، دیکھتے ہی تپاک اور گرم جوشی سے کہا،

آیئے مس شہلا!

اسے کھڑا دیکھ کر فرمایا،

"بیٹھئے، کھڑی کیوں ہیں؟"

وہ بیٹھ گئی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی

"کچھ دیر ہو گئی آج آپ کو؟"

وہ اپنے حواس بحال کرتی ہوئی بولی،

"جی ہاں۔ صبح آنکھ ذرا دیر میں کھلی"

ندیم نے ایک قہقہہ لگایا، پھر سگار سلگاتے ہوئے کہا،

"میں تو بڑی بے خبر نیند سویا، ——— مس شہلا سچ کہتا ہوں، ایسی اچھی اور زبردست نیند بہت دنوں بعد آئی ہے، ———"

شہلا ہنس پڑی، اس نے ہنستے ہوئے کہا،

"زبردست نیند؟"

ہنسی کا جواب ندیم نے بھی ہنسی سے دیا،

"نو بروست سے بھی زیادہ، ــــ حالت یہ تھی کہ نیند روٹھ چکی تھی، خواب آور دوا کے بغیر قدم نہیں رکھتی تھی میری آنکھوں میں، اور اب دوا کا اثر بھی کم ہو گیا تھا اس لیے کہ طبیعت عادی ہوتی جا رہی تھی، لیکن رات؟ ــــــــــــ

یہ پہلی رات تھی کہ دوا کھائے بغیر ٹھیک وقت پر نیند آئی۔ اور ٹھیک وقت پر بڑی مشکل سے جاگا،!"

"لیکن نیند کیوں نہیں آتی تھی آپ کو!"

"آ ہی نہیں سکتی تھی،؟"

"وہی تو پوچھتی ہوں کیوں؟"

"وہی تو کہتا ہوں،

"جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو؟

لیکن آپ سے دوستی کا ہاتھ ملاتے ہی وہ روز سیہ روپوش ہو گیا، امید ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے،!"

شہلا حیرت سے ندیم کی طرف دیکھ رہی تھی، اور وہ کہہ رہا تھا،

"ایسا میں خوش ہوں، میری خوشی کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا، خود میں نہیں کر سکتا معلوم ہے اب میں آپ کو کس نظر سے دیکھتا ہوں؟"

شہلا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، خدا خیر کرے، دیکھا چاہیے، آگے کیا ارشاد ہوتا ہے، ندیم نے کہا،

"جب تک میں آپ کو ایک عورت کی حیثیت سے دیکھتا رہا، جیسا کہ آپ خود جانتی ہیں بدکتا رہا، بھڑکتا رہا، اس لیے کہ آپ کی وہ خطرناک حیثیت سے میرے لیے قطعاً ناقابل

برداشت تھی، لیکن اب میں آپ کو ایک مخلص، شریف، اور نیک دوست کی حیثیت سے دیکھتا ہوں، اگر آپ کبھی میرے غریب خانہ پر یعنی ہوٹل میں تشریف لائیں تو میں دیدہ و دل فراش راہ کروں گا، اب آپ کو مجھ سے کبھی یہ شکایت نہ ہوگی کہ میں سخت مزاج اور سخت گیر ہوں، اب ہر نازک موقعہ پر میں بڑے شوق بلکہ اصرار سے آپ کی مدد قبول کروں گا، اور مجھے یقین ہے ایک دوست کی حیثیت سے جب کبھی ضرورت محسوس ہو آپ بھی مجھے یہ موقع دیں گی، !

بات ختم کرنے کے لیے شہلا نے کہا،

"ضرور، ضرور، ——— میں بہت خوش ہوں کہ آپ نے مجھے دوستی کا اعزاز بخشا، !" ——— !"

"یہ میری عزت افزائی ہے ——— میری خوشی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ احباب، ایک عرصہ سے مجھ سے "فریدپور کلب" کا ممبر بننے کا مطالبہ کر رہے تھے جو یہاں کا چوٹی کا کلب ہے، مگر کبھی ٹال جاتا تھا، کبھی انکار کر دیتا تھا، آج میں نے غنی بھائی اسماعیل جی کو، جو شہر کے بہت بڑے ساہوکار اور یار باش آدمی ہیں، فون پر اطلاع دی ہے کہ فوراً مجھے کلب کا ممبر بنا دیں۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا، اس طرح آپ کا وقت اچھی طرح کٹے گا، !"

"میں نے بھی یہی سوچا ہے، !"

"ایڈووکیٹ صاحب بھی اس کلب کے ممبر تھے، !"

"ضرور ہوں گے، ! ——— میرا ارادہ ہے کہ دفتر سے اٹھ کر سیدھا کلب جاؤں، !" ——— ایک عرصہ کے بعد تفریح و نشاط کی دنیا میں قدم رکھوں گا، دعا کیجئے، زندگی کا یہ دور راس آئے، !"

"انشاء اللہ ضرور راس آئے گا، ! ——— کیا آپ کچھ لکھوائیں گے؟"

"نہیں مس شہلا، آج میں بالکل کام کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں، آج میں نے لنچ کی دعوت بھی ایک دوست کی قبول کر لی ہے / جانسن بھی وہاں مدعو ہیں، آپ بھی چھٹی منایئے، گھر جایئے اور مزے کیجئے اپنی سہیلیوں کے ساتھ آپ بھی کہیں سیر کر آیئے، !"

"پھر جانسن صاحب کا دیا ہوا کام کیوں نہ ختم کر ڈالوں ——————— جو نہیں کر سکی تھی، !"

بہت بہتر ——————— اگر کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو میں کس طرح منع کر سکتا ہوں اور آپ کیوں مانیں گی؟ "

ندیم سے رخصت ہو کر شہلا اپنے کیبن میں آ گئی اور جانسن صاحب کا دیا ہوا کام کرنے لگی، اس کی انگلیاں ٹائپ پر چل رہی تھیں، لیکن وہ بھی ندیم سے کچھ کم خوش نہ تھی،

ندیم تو نہ جانے کس حادثہ کا شکار تھا کہ ہوش و حواس کھوئے بیٹھا تھا، لیکن شہلا تو واقعی اس کی ماتحتی میں آنے کے بعد ذہنی طور پر مریض ہو گئی تھی، ندیم کی صورت دیکھتے ہی کانپ جاتی تھی،

نہ جانے اب یہ کیا کہے گا؟

نہ جانے آج اس کا برتاؤ کیسا ہو گا، ——————— ؟

شاید آج استعفٰے کی نوبت آ ہی جائے، !

لیکن اب یہ سارے اندیشے ختم ہو چکے تھے، "دوستی" جو ہو چکی تھی ندیم سے، !

وہ خوش خوش کام کر رہی تھی کہ فرش پر ڈنڈا ٹپکنے کی آواز آئی سر اٹھا کر دیکھا تو قضائے مبرمؐ کی طرح روشن خاں کھڑے تھے،

"کیا بات ہے روشن خاں؟ "

"جانسن صاحب نے پوچھا ہے، ہمارا کاغذ ٹائپ کیا!"

شبلا کی انگلیاں پھر تیز تیز چلنے لگیں اس نے کہا،

"کہہ دیں خود ابھی لے کر حاضر ہوتی، !"

اور پھر وہ اپنے کام میں اس طرح منہمک ہوگئی جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر، جیسے اس کے علاوہ کوئی اور کام اسے کرنا ہی نہیں ہے،

بہار کا موسم تھا، آفتاب ڈھلنا شروع ہو گیا تھا، کلب کے لان میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے گول میزوں کے ارد گرد چار چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، کچھ آرام کرسیاں ذرا ہٹ کر کیاریوں کے پاس تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے پڑی تھیں اور ہر کرسی کے سامنے ایک چھوٹی سی تپائی بھی،

ندیم آیا، اور ایک آرام کرسی پر قابض ہو گیا۔ کرسی پر نیم دراز ہونے کے بعد، اس نے ایک سگار سلگایا اور نہایت اطمینان سے سامنے کا نظارہ دیکھنے میں محو ہو گیا، اتنے میں بیرا گذرا، اس نے منہ سے تو کچھ نہ کہا صرف ذرا کے ذرا کھٹک گیا کہ اگر صاحب آرڈر دیں تو اس کی تعمیل کر دی جائے، ندیم نے کہا،

"چائے، ——————"

بیرا سر جھکا کر آگے بڑھ گیا، اور ندیم نے اب نظارہ سے نگاہ ہٹا کر ایک اخبار پڑھنا شروع کر دیا، ذرا دیر میں بیرا چائے لے کر آ گیا، ندیم نے چائے بناتے ہوئے سامنے دور، ایک گول میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"دیکھنا وہ صاحب جو چند مردوں اور عورتوں کے ساتھ بالکل کونے پر بیٹھے ہنس رہے ہیں انھیں جانتے ہو؟"

"عینک لگاتے ہیں جو؟"

"ہاں ہاں وہی!"

"جی خوب جانتا ہوں، نسیم صاحب ہیں!!"

"ہاں ان کا نسیم صاحب نام ہے، جاؤ انھیں بھیج دو یہاں!"

"بہت خوب!"

ندیم چائے پینے لگا، بیرے نے جا کر نسیم کو اطلاع دی، وہ اپنے حلقہ احباب سے ذرا دیر کے لیے رخصت ہو کر ندیم کے پاس آ گیا، نسیم کا شمار شہر کے معقول لوگوں میں تھا،

(۷)

فرید پور کلب میں آج پہلی مرتبہ ندیم ایک ممبر کی حیثیت سے داخل ہوا، مسٹر شاہد کلب کے جنرل منیجر تھے، انھوں نے اس معزز ممبر کو ہاتھوں ہاتھ لیا، بڑے تپاک اور گرم جوشی سے پذیرائی کے فرائض انجام دیے، کلب کے حاضر الوقت ممبروں سے اس کا تعارف کرایا، تعارف میں جو کسر رہ گئی تھی وہ غنی بھائی اسماعیل جی نے پوری کرادی، کلب کا کون ممبر تھا جو ان کا دوست، نیاز مند، ثنا خواں یا مقروض نہ ہو، تھوڑی ہی دیر میں ندیم ایسا محسوس کرنے لگا، جیسے وہ یہاں اجنبی نہیں ہے، کچھ عجیب اپنائیت کی فضا اس نے محسوس کی،

اب یہ بات ندیم کے معمولات میں داخل ہوگئی، جس طرح پابندی اور باضابطگی کے ساتھ ہر روز وقت معینہ پر دفتر پہونچتا تھا اسی طرح پابندی اور باضابطگی کے ساتھ وقت معینہ پر کلب پہنچنے لگا، چند ہی روز میں اس کا حلقۂ احباب کلب کی دنیا میں خاصا وسیع ہوگیا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کلب کے کافی ممبر ایسے تھے جو پہلے سے اس کے دوست اور شناسا تھے، کچھ ایسے تھے جن سے نیا نیا یارانہ یہاں ہوا تھا، غرض وہ پرانے دوست ہوں یا نئے، ندیم کے سب ہی مداح اور قدر داں تھے، جس حلقہ میں بھی وہ پہنچ جاتا سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا، اس طرح اچھی زندگی میں جو ایک خلا سا محسوس کر رہا تھا وہ دور ہوگیا، اور وقت اچھی طرح کٹنے لگا.

امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا تھا اور خاصی رقم کما لیتا تھا، جلدی جلدی قدم رکھتا وہ ندیم کے پاس پہنچا، اور پاس سے ایک کرسی گھسیٹ کر بالکل قریب بیٹھتے ہوئے گویا ہوا،

"کیوں حضرت اکیلے اکیلے بادہ نوشی ہو رہی ہے؟"

ندیم ہنس پڑا،

"اگر چائے نوشی آپ کے نزدیک بادہ نوشی ہے تو کل یہ کلب بھٹیار خانہ کا نام حاصل کرے گا!"

"اچھا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں ارشاد فرمایئے نیازمند کو کیوں یاد فرمایا گیا؟"

"کوئی خاص کام تو نہیں ہے اکیلا بیٹھا بیٹھا گھبرا گیا، سوچا ایک بے وقوف آدمی کو بلا کر پاس بٹھا لوں، وقت دلچسپی سے کٹ جائے گا!"

"تو آپ کی نظر میں یہ خاکسار بے وقوف ہے؟"

"میرے خیال میں تمہارا ہر دوست تمہیں نہایت شریف قسم کا بے وقوف سمجھتا ہے اگر تمہارا کسی کے اس معاملہ میں مقابلہ ہو جائے اور ووٹ لیے جائیں تو مخالف امیدوار کی ضمانت ضبط ہو جائے گی، اور غیر معمولی کثرت آراء سے تم کامیاب قرار دیئے جاؤ گے!"

(ہنستے ہوئے) "شکریہ اس عزت افزائی کا، بہت بہت شکریہ!"

"نا بھائی یہ شکریہ بے معنی ہے، شکریہ ادا کرنا چاہیے تمہارا ــــ مجھے نہیں ــــ"

"پھر کسے؟"

"مس نوشابہ کو مس نگہت کو، مس فلاں کو، مس فلاں کو، جنھوں نے جب چاہا تمھاری بھری ہوئی جیب پر ڈاکہ ڈالا اور ایک ہی وار میں اسے خالی کر دیا، تم اف بھی تو نہ کر سکے،

"ارے بھئی خدا کے لیے چپ رہو، اگر کسی نے سن لیا ——— "

"کسی نے سن بھی لیا تو کیا ہو گا؟ ——— نقصان مایہ سے نہیں ڈرتے، شماتت ہمسایہ سے ڈرتے ہو، ——— وہی حماقت!"

"بھئی تم میرا مطلب نہیں سمجھے!"

"تم اور مطلب دو بالکل متضاد چیزیں ہیں!"

"ارے بھئی کیوں پیچھے پڑ رہے ہو آج بڑی مشکل سے ایک بت سے پیر سے راہ و رسم قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہوں، ——— "

"وہ کون صاحبہ ہیں؟"

"تم نے مس افروز کا نام نہیں سنا؟"

"نام تو میں نے دیتا ہیور تھ کا بھی سنا ہے، تعریف کرو!"

"بھئی وہ شہر کی ایک نامور خاتون ہیں بے انتہا حسین ہیں نہایت ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتی ہیں، تم نے مسٹر انور علی کا نام تو سنا ہو گا؟"

"انور علی؟"

"ارے ہاں وہی، ملٹری کنٹریکٹر لکھ پتی آدمی ہے بھائی!"

"تو انھیں کیا ہوا؟"

"ابھی حال میں افروز نے ان سے طلاق لی ہے، نہ بن سکی دونوں میں یہ جواں وہ ادھیڑ، یہ فیشن ایبل، وہ خود پرست یہ سوسائٹی رسیدہ، وہ حکام رس، ان کی آرزوئیں مسرتیں، تمنائیں کچھ اور، ان کی زندگی کا مقصد جدا، بہت بیچارے نے کوشش کی یہ رشتہ قائم رہ سکے۔ مگر یہ افروز جو بے زبردست قوت ارادی کی مالک ہے، ایک ہی جھٹکے میں یہ مضبوط رشتہ مکڑی کے جالے کی طرح ٹوٹ گیا!"

"بہت خوب، بہت خوب، ایک مرتبہ پھر بہت خوب!"

"دونوں کی صورت میں بھی بہت فرق ہے!"

"یہ گل فام، وہ سیہ فام، !؟"

"(ہنستے ہوئے) بخدا یہی بات ہے!"

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ؟ میرا؟"

"ہاں، ———— کیا شادی کرنا چاہتے ہو انسر وز سے؟"

"کاش ایسا ہو سکے!" ———— "کوشش میں تو ہوں، لیکن ————"

"لیکن کیا کوئی رقیب رو سیہ بھی موجود ہے؟"

"ایک؟ اماں، رقیبوں کی تو فوج کی فوج موجود ہے! سمجھ میں نہیں آتا کس کس سے نپٹوں؟"

"لیکن تمھارے مقابلہ میں کون ٹھہر سکتا ہے؟"

"واہ یہ کیا کہا! مجھ میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟"

"تم خود ہی سرخاب ہو!؟"

"(ہنستے ہوئے) پھر وہی مذاق، سنجیدگی کے موقع پر مذاق اچھا نہیں لگتا میرے بھائی!"

"سنجیدگی ہی سے تو کہہ رہا ہوں، کیا تم خوب صورت نہیں ہو؟ جوان نہیں ہو؟ دولت مند نہیں ہو، سوسائٹی رسیدہ نہیں ہو، ایک عورت کو اس سے اچھا شوہر اور کون مل سکتا ہے؟ تمھاری انسروز بیگم صدر آئزن ہاور، یا جنرل ڈیگال، یا مسٹر چرچل سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟ ———— بخدا ان تینوں سے تم خوب صورت ہو!"

"ارے ظالم، نام نہ لے'!"

"کس کا نام نہ لوں،؟ ——————— جنرل ڈیگال وغیرہ کا؟"

"ارے بھئی ان کمینوں کو گالیاں دو جھے کیا، (آہستہ سے) افروز کا نام نہ لو'!"

"یہ کیوں؟"

"اگر کہیں اس کے کان میں بھنک پڑ گئی تو سمجھ جائے گی اسی کی باتیں ہو رہی ہیں'!"

"پھر کیا ہوگا؟"

بھئی بڑی تنگ مزاج ہے اس کا برا مان گئی تو مناتے نہیں بن پڑے گی'!"

"بڑے بزدل ہو'!"

"ٹھنڈی سانس بھر کر) اگر کبھی عاشق ہوئے تو دیکھ لیں گے تمہاری بہادری بھی' ——— میاں یہ وہ دنیا ہے کہ بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہوتا ہے، سکندر یہاں سر جھکا کر آتا ہے، چنگیز یہاں گا چاکر کمترین ہے نادر یہاں کا ایک معمولی سا غلام، تیمور ——————— "

"خاموش'!"

شاید فہیم کی تقریر ابھی زور شور اور جوش خروش سے ابھی اور جاری رہتی، لیکن خاموش سنکر وہ چونکا۔ اور اس نے ندیم کے چہرے پر ایک نظر ڈالی تو گھبرا گیا'! ———

ندیم کا روپ اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ندیم کا یہ روپ آج پہلی مرتبہ اس کی نظروں سے گزرا تھا، وہ ڈر گیا، سہم گیا، یہ دیکھ کر کہ ندیم کی آنکھوں سے خون اُبل رہا ہے، اس کا چہرہ خون کبوتر کی طرح سرخ ہو رہا ہے، اس نے اپنے حواس بجا کر اور اپنی حیرت پر غالب آتے ہوئے کہا،

"کیا ہوا مسٹر ندیم؟"

"لیکن ندیم بھی اپنے حواس بجا کر چکا اور اپنی حالت پر غالب آچکا تھا، ایک طوفان تھا جو آیا اور گزر گیا، دنیا ہی طوفان جو کچھ روز پہلے خیالات کے سامنے آیا تھا لیکن وہ بہت دبیو

میں کئی مرحلوں سے گزرنے کے بعد تدریجی طور پر ختم ہوا تھا، یہ "آناً فاناً" ختم ہوگیا، ندیم مسکرانے لگا،

"ڈر گئے تم ؟"

نسیم نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا،

"ہاں بھئی جھوٹ کیوں بولوں واقعی ڈر گیا تھا، ———— میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم اتنے خوفناک بھی نظر آ سکتے ہو، بخدا ایسی ڈراؤنی صورت آج تک میری نظر سے نہیں گزری"

ندیم ہنسنے لگا، اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا،

"رات ہوتی تو جن یا بھوت سمجھتے اور ڈر جاتے ؟"

بغیر کسی تامل یا جھجک کے اپنی اس کمزوری کا بھی بیچارے نسیم نے اعتراف کر لیا،

"ہاں یار واقعی ڈر جاتا۔ اور کئی دن تک بخار میں مبتلا رہتا !"

"اچھا چھوڑو یہ باتیں، ———— یہ تو کہو لندن جانے کا کیا ہوا؟ ———— مجھے یاد پڑتا ہے اسی ہفتہ میں تمہیں جانا تھا، شاید ایر فرانس سے سیٹ بھی بک کرالی تھی تم نے۔"

"ہاں بھئی، ارادے پروگرام طے تھے، مگر ————"

"مگر اب ارادہ بدل دیا؟ ———— کس لیے ؟"

"نہیں ارادہ بدلا تو نہیں ہے، لیکن، ————"

"صاف صاف کیوں نہیں کہتے ؟"

"اب سوچا یہ ہے کہ جب تک قسمت کا فیصلہ نہ ہو جائے، سیر و سفر سے کیا حاصل؟ آج لندن میں بین الاقوامی نمائش ہے، کل پیرس میں ہوگی، پرسوں ایتھنز میں، کسی روز نیویارک میں کبھی روم میں، آج نہیں جا سکتا، کل چلا جاؤں گا، پرسوں چلا جاؤں گا، کسی روز چلا

جاؤں گا، کبھی چلا جاؤں گا۔ مگر یوں تو نہیں جا سکتا کہ میں بین الاقوامی نمائش دیکھ رہا ہوں، اور یار لوگ ——————

(زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے، اور کوئی دلہن ہیروئین کو لے اُڑے)؟ اماں تمھیں اپنے اوپر اتنا اعتماد بھی نہیں؟ جو شخص احساس کمتری کا اس درجہ شکار ہو اسے عشق کی وادی میں قدم رکھنا ہی نہیں چاہیے!!"

(آہ سرد کے ساتھ) اُڑالو مذاق خوب جی بھر کے ہم بے کسوں کا!"

"کیا تم خفا ہو گئے؟"

"ایک مشکل یہ ہے کہ تم سے اور افروز سے خفا بھی نہیں ہو سکتا!!"

"(اور زیادہ زور سے ہنستے ہوئے) مجھے بھی افروز کے ساتھ نتھی کر دیا، کچھ دماغ چل گیا ہے تمھارا؟"

"یہی سمجھ لو، —————— بدقسمتی سے دونوں کو چاہتا ہوں!! اور دونوں میں سے کوئی بھی میری قدر نہیں کرتا، مجھے اپنا نہیں سمجھتا!"

"کیوں ناشکری کرتے ہو؟ میری یہ پیش گوئی کان کھول کر سن لو، افروز تمھاری ہے اور تمھاری رہے گی، اسے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا!!"

"(خوش ہو کر) یہ کیسے جانا تم نے میرے دوست؟"

"دلہن نے خواب پر تمھیں اعتماد ہے یا نہیں؟"

"کیوں نہیں ہے!"

"میں نے خواب دیکھا تھا!!"

"(بے انتہا متحیر ہو کر) تم نے خواب دیکھا تھا؟"

"میرے بارے میں؟"

"ہاں تمھارے اور افروز کے بارے میں، ——————"

(۸)

کلب میں جو خواتین آتی تھیں ان کی چار قسمیں تھیں، ایک وہ جو بن سنور کر اپنے شوہروں کے ساتھ رونق افروز ہوتی تھیں، دوسری وہ جو شوہروں کو گھر چھوڑ آتی تھیں، تیسری وہ جو اچھے سے شوہر کی تلاش میں، تمام اسلحہ سے مسلح ہو کر یہاں تک تشریف لانے کی زحمت گوارا کرتی تھیں، اور چوتھی وہ جو شوہر کے جنجال کو پسند نہیں کرتی تھیں، آتی تھیں، ہنستی بولتی تھیں، جس سے چاہا رلہ و رسم پیدا کر لی، اور جب چاہا اسے دھتا بتا کر کسی اور سے ایکاد تعلق قائم کر لیا،

بہت جلد ندیم کو معلوم ہو گیا کہ کلب میں آنے والی خواتین میں سے کون کس فہرست میں داخل ہے، نمبر ۲ - ۳ - ۴ سے وہ دور کی صاحب سلامت پر اکتفا کرتا تھا، نمبر ایک سے اگر کبھی کچھ دیر کے لیے نشست برخاست بھی رہے تو گوارا کر لیتا تھا لیکن اس نشست برخاست میں یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھتا تھا کہ دو چار آدمیوں کے جمگھٹ میں ملتا تھا، بطور خود یا تنہا نہیں۔

لیکن ندیم ایسا آدمی نہ تھا، جو آسانی سے نظر انداز کر دیا جاتا، !
وہ اگر رکا رکا اور کھنچا کھنچا رہتا تھا تو کیا ہوا، پاس آنے والیوں کو تو نہیں دھتکار سکتا تھا، آخر ایٹی کیٹ بھی تو کوئی چیز ہے، تہذیب شرافت اور انسانیت بھی تو کسی چیز کا نام ہے، چنانچہ بہت کم ایسا ہوتا کہ اسے تنہائی نصیب ہوتی، کبھی کوئی آجاتا، کبھی کوئی

"میرے اور افسر وز کے بارے میں؟ سچ کہتے ہو؟"

"بھلا خواب بھی کوئی جھوٹا بیان کرتا ہے؟"

"ہاں میں نے سنا ہے، جھوٹا خواب نہیں بیان کرنا چاہیے، اور جو جھوٹا خواب بیان کرتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے!"

"امی بے تو جھوٹے لوگ ہی سچے خواب بیان کرتے ہیں، ——— سنو گے؟"

"ضرور سنوں گا!"

"میں نے دیکھا، ——— اچھا خیر پھر سہی ———"

"کچھ عادی ہو گئے ہو، پہلے تو مجھے مشتاق بنا دیا، اب نخرے کر رہے ہو؟ بتاؤ کیا دیکھا تھا؟"

"میں نے دیکھا ایک شامیانہ ہے، جس میں شہر کے تمام معززین امرا اور رؤسا موجود ہیں، بیچ میں ایک تخت بچھا ہے، وہاں قاضی صاحب رونق افروز ہیں، ان کے سامنے سہرا باندھے سر جھکائے ایک شخص بیٹھا ہے، میں نے کسی سے پوچھا یہ کون ہے، سننے والے نے بتایا، یہ مسٹر نسیم ہیں، جن کی شادی افسروز بیگم سے ہو رہی ہے، پھر چھوہارے تقسیم ہونے لگے، اپنا حصہ لے کر جب میں گھر آیا تو آنکھ کھل گئی، اور ——— جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا۔"

آجاتی، اور جب کوئی آتا یا آتی، تو پھر بحث و گفتگو کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا، اگر مجلس میں کئی لوگ ہوتے تو ندیم بھی بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتا، صرف خواتین ہوتیں، تو صرف ہاں نہیں پر اکتفا کرتا، تنہا وہ اور تنہا کوئی خاتون ہوتی، تو چند سیکنڈ بھی بیٹھنا اس کے لیے دوبھر ہو جاتا، اور کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے یا تو کلب سے رخصت ہو جاتا یا کسی اور ٹولی میں پہنچ جاتا،

چند روز تک تو اس کی ان حرکتوں پر نوٹس نہیں لیا گیا، پھر کچھ عرصہ تک یہ ادائیں لاابالی پن اور سادہ لوحی پر محمول کی گئیں، لیکن جب مستقل طور پر یہ وطیرہ قائم ہو گیا، تو اس پر نکتہ چینیاں بھی شروع ہو گئیں، اور کانا پھونسیاں بھی، ایک روز کلب کے باغیچہ میں بیٹھا آرنج ---- گھونٹ گھونٹ کر کے پی رہا تھا کہ شاہد آگیا، جس سے اب خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی، ندیم نے خندہ جبینی کے ساتھ اس کا استقبال کیا، اور بیرے سے ایک اور گلاس لانے کے لیے کہا، شاہد نے کہا،

"ہمیں تو وہ چیز پلاؤ جو ہم پیتے ہیں، ——"

ندیم نے آمادگی کے ساتھ پوچھا،

"وہ کیا چیز ہے؟ بتاؤ، ابھی آجائے گی!"

شاہد گویا ہوا،

"بس وہی —— جو کالی کالی بوتلوں میں لال لال ہے!"

ندیم ہنسنے لگا،

"آپ شراب پئیں گے؟"

شاہد نے جوش اور ولولہ کے ساتھ کہا،

"غلبی کہو —— مٹکا بھر تک!"

ندیم نے ویسے ہی ہنستے ہوئے کہا،

"نا بھائی، ہمارے ہاں اس کا چلن نہیں ہم تو جو پیتے ہیں وہی پلائیں گے"!

شاہد نے ذرا روٹھتے ہوئے کہا،

"یار کس بے وقوف نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ کلب کے ممبر بن جاؤ، تمہیں تو چاہیے

تھا کہ ——— جا کے آباد کرو مسجد ویراں کوئی !"

ندیم نے آخری گھونٹ پی کر گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا،

"جی یہ بھی ہو جائے گا کسی دن انشاء اللہ !"

دفعتہً شاہد نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا

"یار ایک شکایت ہے تم سے !"

ندیم نے مذاق کے موڈ میں جواب دیا،

"مجھے اپنی اس بدقسمتی پر بہت افسوس ہے !"

"مذاق نہیں واقعتہً شکایت ہے تم سے، صرف مجھی کو نہیں بہتوں کو، اور یہ شکایت

روز بروز بڑھتی جا رہی ہے !"

"(سنجیدہ ہو کر) کیا شکایت ہے ؟"

"یہ کہ تم عورتوں کا احترام نہیں کرتے، ان کی توہین کرتے ہو !"

"پہلی بات صحیح ہے، دوسری غلط، ——— بے شک میری نظر میں عورتیں

کسی خاص احترام کی مستحق نہیں ہیں، لیکن یہ قطعاً غلط ہے کہ میں ان کی توہین کرتا ہوں،!

——— توہین تو میں کسی بھنگی یا چمار کی بھی نہیں کر سکتا، وہ بھی میری طرح

انسان ہیں،!"

"تعجب ہے !"

مجھے تعجب اس بے جا شکایت پر ہے، ——— لیکن شکایت کی نوعیت

کیا ہے یہ بھی بتا دو !"

"نوعیت کیا ہوتی؟ کوئی خاتون جب تم سے ملتی ہے تو سرد مہری کا اظہار کرتے ہو!"

"جب میں کسی خاتون سے نہیں ملتا تو کوئی خاتون مجھ سے کیوں ملتی ہے؟"

"کیوں نہیں ملتے یہ کیا حماقت ہے؟"

"میں تو ملنے کو حماقت سمجھتا ہوں ——— خیر آگے؟ کوئی اور شکایت بھی ہے ———؟"

"ہاں کیوں نہیں، کئی اور شکایتیں بھی ہیں!"

"کئی شکایتیں ہیں، ہائیں اور شکایتیں!؟"

"ہاں بھئی، مثلاً، جب کوئی خاتون تمھارے پاس آتی ہے، تو تم کھڑے کیوں نہیں ہوتے حالانکہ یہ بات ایٹی کیٹ میں داخل ہے کہ بیٹھا ہوا مرد پاس آتی ہوئی عورت کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے!"

"بات تو صحیح ہے، لیکن میں اسے شکایت ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں!"

"یہ بھی ایک قسم کی دھاندلی اور سینہ زوری ہے، جرم کرو، اور اسے تسلیم کرنے سے انکار کرو!"

"ذرا تو ہوش ہو کہا جرم کیسا؟ آخر اس تصنع اور نمائش کی ضرورت کیا ہے؟ احترام کا تعلق دل سے ہوتا ہے، یا اٹھنے بیٹھنے سے اگر کوئی خاتون احترام کی مستحق ہو تو میں تم سے زیادہ اس کا احترام کرنے کو تیار ہوں، لیکن ہر عورت کو دیکھ کر بیٹھے بیٹھے کھڑا ہو جاؤں، میں اس کرتب کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوں، سمجھ گئے جناب؟"

"جی بہت اچھی طرح سمجھ گیا! ——— لیکن دوسروں کو سمجھا نہ سکوں گا!"

"انھیں میرے پاس بھیج دینا میں سمجھا دوں گا!"

"اچھا خیر یہ تو ہُوا، ——————"

"ابھی کچھ اور بھی باقی ہے؟"

"ہاں ایک خاص بات، بلکہ خاص الخاص بات!"

"وہ بھی فرما دیجیے! —————— ارشاد؟"

"افسر وز بیگم، تم سے بہت خفا ہیں!"

"انھیں مجھ سے خفا ہونے کا کیا حق ہے جبکہ میرا ان سے کوئی ربط و تعلق نہیں یہ تو وہی بات ہوئی کہ آ بیل مجھے مار!"

"وہ کہتی ہیں تم بڑے غیر مہذب اور ناشائستہ آدمی ہو!"

"وہ جو چاہیں کہہ سکتی ہیں، بہر حال میری ان کے متعلق یہ رائے نہیں ہے، میرا خیال ہے وہ بڑی شائستہ اور مہذب خاتون ہیں!"

"کل کچھ دیر کے لیے وہ تمھارے پاس آئی تھیں؟"

"آئی چلی گی، —————— کئی دفعہ آ چکی ہیں!"

"مگر توہین تو تم نے کل ہی کی، اس سے پہلے کی ہوتی تو وہ مجھ سے ضرور ذکر کرتیں!"

"میں نے قطعاً توہین نہیں کی!"

"واہ، وہ خود کہہ رہی تھیں!"

"یہ کہ میں نے ان کی توہین کی؟"

"ہاں اور کیا، —————— کہہ رہی تھیں وہ تمھیں تنہا تنہا دیکھ کر، محض از راہ اخلاق چلی آئیں، تم نے پہلی بدتمیزی یہ کی کہ انھیں دیکھ کر کھڑے نہیں ہوئے،

"اور دوسری بدتمیزی؟"

"دوسری بدتمیزی یہ کی کہ ان سے بہت سرد مہری سے پیش آئے!"

"بس یا کچھ اور بھی؟"

"بہت کچھ ـــــــــ انھوں نے سینما چلنے کی فرمائش کی، تم نے معذرت میں ایک لفظ کہے بغیر صاف انکار کر دیا!"

"تو کیا اصرار کر لیتا؟ چلا جاتا؟"

"یقیناً چلا جانا چاہیے تھا۔ ایک خاتون خود فرمائش کرے، اور تم رد کر دو؟ اور خاتون بھی کون افروز بیگم جیسی عورت، جسے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، جسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، جس پہ امراجان دیتے ہیں، جس سے ذرا ملنا باعث نشاط و مسرت سمجھتے ہیں ـــــــــ امّاں تم آدمی ہو یا پتھر؟"

"میں آدمی ہوں یا پتھر یہ فیصلہ تو بعد میں ہوگا، سوال یہ ہے کہ ایک غیر خاتون کو ایک اجنبی مرد سے ملنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے ساتھ سینما دیکھنے کا شوق ظاہر کرنے کی کیا حاجت تھی؟ ممکن ہے یہ چیزیں ای کیٹ میں داخل ہوں، لیکن میں ایسے ای کیٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں، وہ افروز بیگم ہوں، یا کوئی اور خاتون، میں ہرگز ان سے ملنے، ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے ان کے ساتھ کہیں آنے جانے کو تیار نہیں ہوں، یہ بات کان کھول کر سن لیجیے!"

"وہ تو سن لی، لیکن ایک سوال کا جواب دو!"

"کیا ہے جناب کا وہ سوال؟"

"تم عورتوں سے نفرت تو نہیں کرتے ہو؟ ـــــــــ سچ کہنا!"

"میں عورتوں سے نفرت کرتا ہوں یا نہیں، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، اس پر کسی کو معترض ہونے جرح کرنے، یا پوچھ گچھ کرنے کا اختیار نہیں ہے!"

"میرا خیال تو کچھ ایسا ہی ہے ـــــــــ معاف کرنا!"

"کرو معاف، اس لیے کہ تمھارا خیال کچھ زیادہ غلط بھی نہیں ہے!"

"لا حول ولا قوۃ! بخدا میں پہلے ہی یہ سمجھے بیٹھا تھا، لیکن بڑا احسان ہوگا، اگر بتا دو ایسا کیوں ہے؟"

"نہیں اس بحث میں حصہ لینا میں مناسب نہیں سمجھتا !"

"تمھاری والدہ تو زندہ ہوں گی ؟"

"نہیں !"

"کوئی چھوٹی یا بڑی بہن یقیناً ہوگی، اور اس سے محبت بھی کرتے ہوگے !"

"نہیں کوئی بہن بھی نہیں ہے بدقسمتی یا خوش قسمتی سے !"

"شادی تو قطعاً ہو چکی ہوگی، کیا اپنی بیوی سے بھی جو بہر حال عورت ہے تم محبت نہیں کرتے ؟"

"دیمنا کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریبان سے !" ——— بیوی کیسی اور کس کی ؟"

"پھر تو واقعی تمھیں عورت سے بیزار ہونا چاہیے !"

"شکر ہے کہ اب مجھے سمجھے تو کسی حد تک !"

"تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مس دارو والا کو مایوس ہو جانا چاہیے، !"

"مس دارو والا ؟ ——— یہ نام تو میں نے آج ہی سنا ہے، لیکن انھیں مایوس ہونے کی وجہ ؟"

"تم مس دارو والا کو نہیں جانتے ؟ عجیب شخص ہو بھئی !"

"واقعی نہیں جانتا، اور جاننا چاہتا بھی نہیں، ——— کوئی اور ذکر کرو !"

"خدا کے بندے مس دارو والا، ایک پارسی لڑکی ہے، فن موسیقی کی استاد، فن رقص میں لاجواب، اس سے بڑی سوسائٹی گرل تو سارے فرید پور میں کوئی نہیں، نہ جانے کہاں کہاں تک اس کی پہنچ ہے !"

"ہوگی ——— لیکن کیوں اس کا ذکر کیے جا رہے ہو ؟"

"بھئی وہ تم سے ملنا چاہتی ہے، ہمارے کلب کی ممبر ہے، کبھی کبھی آجاتی ہے، جب آتی ہے تو فتنے جگاتی ہوئی آتی ہے، دلوں پر پاؤں رکھتی ہوئی، بلکہ دلوں کو قدموں سے کچلتی ہوئی، قسم خدا کی قیامت ہے، کل وہ آئی تھی، کہیں باہر چلی گئی تھی اس لیے کافی عرصے کے بعد آئی ہو رجسٹر میں نئے ممبروں کا نام دیکھا، تمھارے نام پر ٹھٹکی، اپنے گلاب کی پتی کے سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اور تعجب کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے کہا،

"شاید مسٹر ندیم قریشی، ہیں جن کا ذکر افروز کر رہی تھی!"

میں نے کہا،

"جی ہاں یہ قریشی ذات شریف ہیں!"

بیچاری پارسی چھوکری "ذات شریف" کو کیا سمجھتی، صرف "شریف" اس کے پلّے پڑا کہنے لگی،

"آپ انھیں شریف کہتے ہیں لیکن افروز تو کہتی ہے، بڑے رُوڈ RUDE ہیں، ایٹی کیٹ تک سے ناواقف، لیکن میں ایسے لوگوں سے ملنا پسند کرتی ہوں، کیا آپ ملا دیں گے؟"

"میری جو شامت آئی تو وعدہ کر لیا، اب سوچتا ہوں کیا جواب دوں گا محترمہ کو؟"

"آسان ترکیب یہ ہے کہ میں کلب کی ممبری چھوڑے دیتا ہوں، پھر نہ فیروز بیگم کو شکایت رہے گی اور نہ مس دارو والا کو، مجھ جیسے عجیب و غریب آدمی کے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوگی، نہ تمھارا وقت ضائع ہوگا آدھے گھنٹے سے زیادہ تو ہو گیا ہوگا یہاں بیٹھے بیٹھے!"

یکایک شاہد اٹھ کھڑا ہوا،

"بھئی اب تم بھگتو ہم چلے۔!"

(۹)

شاہد تو دوسری طرف نکل گیا، اس کے جاتے ہی افروز بیگم اور مس دارو والا آ گئیں، ندیم کو کبھی مس دارو والا سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن ان کے لباس اور وضع قطع سے اس نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہی ہے وہ ذات گرامی جس کے ذکر میں شاہد صاحب لطف اندوز ہو رہے تھے،

ندیم نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے دونوں خواتین کو خوش آمدید کہا۔

"آیئے مس افروز، تشریف رکھئے،!"

افروز پاس کی کرسی پر بیٹھ گئی، دوسری کرسی پر مس دارو والا نے قبضہ کر لیا، ندیم نے بیرے کو آرینج اسکواش کے دو اور گلاس لانے کا حکم دیا، افروز نے کہا،

"کیوں تکلف کرتے ہیں آپ؟"

مس دارو والا نے ٹوکا،

"مسٹر ندیم کے اخلاق کو تم تکلف کہتی ہو، اور تکلف کو بد تہذیبی، آخر تمہیں خوش کس طرح رکھا جا سکتا ہے؟ ——— مسٹر ندیم آپ افروز کی باتوں پر دھیان نہ دیجئے، منگایئے ہم پئیں گے، پیاس بھی لگ رہی ہے اس وقت بے طرح،!"

ندیم نے بغیر کسی جھجک کے گرم جوشی کے ساتھ کہا۔

"جی ہاں ابھی لیجئے ———

اتنے میں بیرے نے دو گلاس آرنج کے سامنے لاکر رکھ دیئے، مس دارو والا نے اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے افروز سے کہا،

"پیتی کیوں نہیں؟"

افروز نے بھی گلاس اٹھایا اور سپ کرنے لگی،

مس دارو والا نے پوچھا،

"کہیئے مسٹر ندیم، آپ کا وقت کس طرح کٹتا ہے؟"

ندیم نے بہت مختصر سا جواب دیا،

"بہت اچھی طرح ——— صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے ——— عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے!"

مس دارو والا کو ہنستے ہنستے اچھو پڑ گیا،

"پھر بھی دفتر سے اٹھنے کے بعد آپ کا پروگرام کیا ہوتا ہے؟"

"گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے یہاں آجاتا ہوں، یہاں سے ہوٹل چلا جاتا ہوں، وہاں کچھ دیر مطالعہ کرتا ہوں، پھر سو جاتا ہوں!"

"کس ہوٹل میں رہتے ہیں آپ؟"

"ایک معمولی سا ہوٹل ہے، کاسموپلیٹن!"

"معمولی کیوں بہت اچھا ہے!"

"آپ کے کمرہ کا نمبر کیا ہے؟"

"نمبر بدلتا رہتا ہے، فی الحال ۲ ہے!"

"بدلتا کیوں رہتا ہے؟"

"جب کبھی دو چار روز کے لیے دورے پر جاتا ہوں، تو کمرہ چھوڑ دیتا ہوں، واپسی پر جو کمرہ خالی مل جاتا ہے اسی میں رہ پڑتا ہوں، ایک عرصہ سے یہی معمول ہے!"

"مسٹر ندیم آپ کی زندگی قابلِ رشک ہے !"

افروز اب تک خاموش بیٹھی تھی کہنے لگی !

"خود مسٹر ندیم کیا کم قابلِ رشک ہیں !"

ندیم کچھ جھینپ سا گیا،

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا !"

افروز نے جواب دیا،

"سیدھی سی بات ہے، ———— آپ میں اتنی کشش ہے کہ لوگ خود بخود کھنچ کھنچ آپ کے پاس آتے ہیں، اس پر دوسروں کو رشک ہوتا ہے، اور جنہیں آپ منہ نہیں لگاتے وہ دل ہی دل میں خون کے آنسو روتے ہیں !"

ندیم نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا،

"مس افروز اگر آپ یہ فیصلہ کر کے آئی ہیں کہ مجھے بنائیں گی، تو میں تیار ہوں، اور بھی جو چاہے کہہ لیجیے، ورنہ میں کتنی کشش رکھتا ہوں یہ بات مجھ سے زیادہ کسے معلوم ہو گی ؟ رہا یہ کہ جنہیں میں منہ نہیں لگاتا تو وہ خون کے آنسو روتے ہیں، یہ بے شک عجیب بات ہے حتی الامکان میری کوشش ہوتی ہے کہ کسی کو مجھ سے شکایت کا موقع نہ ملے، !"

افروز مسکرانے لگی، اس نے برق پاش نگاہوں سے ندیم کو دیکھا، گردن کو ذرا سا خم دے کر اس نے کہا،

لیکن مسٹر ندیم یہ تو مان لیجیے کہ آپ بے مروت ہیں !"

ندیم نے بھی مسکرانے کی کوشش کی،

"آپ کے کہنے سے مانے لیتا ہوں !"

افروز نے اور زیادہ بے تکلف ہوتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

نہیں سچ مچ مان لیجیے،

ندیم اس پر آمادہ نہ ہو سکا،

"یہ تو مشکل ہے مس افسروز،!"

وہ شکوہ سنج ہوتی ہوئی بولی،

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کل میں نے آپ سے سینما چلنے کی فرمائش کی تھی؟"

"بالکل واقعہ ہے، مجھے اسی طرح یاد ہے جس طرح اس وقت آپ میرے سامنے بیٹھی ہیں،!"

"مگر آپ نے کیا جواب دیا تھا؟"

"میں نے انکار کر دیا تھا!"

"انکار؟ ——— مجھ سے؟ افروز سے؟"

"جی ہاں آپ ہی سے، مس افروز سے،!"

"آپ نے ذرا نہ سوچا کہ یہ انکار کتنا دل شکن ثابت ہوگا میرے لیے؟ آپ کے اس انکار سے میرا سارا پروگرام درہم برہم ہوکر رہ جائے گا،؟"

"آپ کا پروگرام کیا تھا اسے تو میں نہیں جانتا، لیکن آپ کی دل شکنی واقعی میرے لیے حیرت انگیز ہے، ابھی آپ اور مس داروالا تشریف لائی تھیں، میں نے آج ہی اسکوائش پیش کرنے کی عزت حاصل کی تھی، فرض کیجیے آپ کہہ دیتیں میں نہیں پیوں گی، تو کیا میری دل شکنی ہو جاتی؟ میں پروا بھی نہیں کرتا!"

"آپ پروا بھی نہ کرتے؟"

"قطعاً نہیں،!"

"مسٹر ندیم آپ کو سمجھنا بہت مشکل ہے، آپ تو عجیب آدمی ہیں، سوسائٹی کا یہ معمولی اصول بھی آپ کو نہیں معلوم کہ عورت کی پیش کش کبھی اور کسی حالت میں رد نہیں کی جاتی!"

"جی ہاں یہ اصول تو معلوم ہے، لیکن میں ان لوگوں میں ہوں، جو کسی اصول پر صرف اسی وقت عمل کرتے ہیں جب وہ اس کے قائل ہوں۔ میں اس اصول کو مہمل سمجھتا ہوں، میں بھی مرد وزن میں مساوات کا قائل ہوں، اور آپ بھی، بلکہ ساری دنیا، ایک طرف مساوات کے نعرے، دوسری طرف فرق مراتب، کتنی مہمل بات ہے؟ کسی وقت اگر شاہد کی پیش کش میں مسترد کر سکتا ہوتا تو مس افروز کی کیوں نہیں کر سکتا؟"

یک بیک مس دارو والا کا نقرئی قہقہہ فضا میں گونجا،

"گڈ، گڈ!"

اور وہ پھر ہنسنے لگی۔

ندیم نے اسے ہنستے دیکھ کر سوال کیا "

"کیا بات ہے مس دارو والا؟ کس بات پر آپ بے تحاشہ ہنسنے لگ گئیں؟"

مس دارو والا نے ہنستے ہوئے جواب دیا،

"بڑا دلچسپ جواب دیا آپ نے افروز کو" ——————— کیوں افروز اب بھی کچھ کہہ سکتی ہو؟"

افروز نے مس دارو والا سے کچھ نہیں کہا، ندیم سے بولی،

"آپ کا خیال ہے آپ جیت گئے؟"

ندیم نے سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا،

میرا نہیں مس دارو والا کا خیال ایسا ہی معلوم ہوتا ہے"!"

"اچھا شکست و فتح کا ذکر چھوڑیئے، اب میں ایک نئی پیش کش کرتی ہوں!"

"وہ کیا؟ آپ پیش کش کرتی ہیں؟"

"جی ہیں، ——————— چلئے ذرا ساحل سمندر پر چلتے ہیں۔ ———————

مس دارو والا بیچ میں بول پڑی،

"ہاں افروز یہ خوب کہی تم نے، میرا بھی بڑا جی چاہتا تھا، ذرا لطف رہے گا،

مسٹر ندیم اس پیش کش کو تو منظور کر ہی لیجیے، یہ کسی ایک کی طرف سے نہیں، دو کی طرف سے ہے، میں بھی افروز کے ساتھ ہوں!!"

ندیم نے بڑے ٹھنڈے لہجہ میں جواب دیا،

"میں نہیں جا سکوں گا،!!"

افروز اور مس دارو والا دونوں کا چہرہ اتر گیا، دونوں نے تقریباً متفق اللفظ ہو کر پوچھا،

"کیوں؟ ——— اس میں بھی کوئی قباحت ہے؟"

ندیم نے سگرٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا،

"قباحت کا تو کوئی سوال نہیں، اپنا اپنا مزاج، اور اپنا اپنا ذوق ہے!!"

افروز تلملا گئی"

"یعنی آپ ڈرتے ہیں سمندر کی لہریں آکر آپ کو کھینچ نہ لے جائیں؟"

ندیم نے بھی اسی انداز میں کہا،

"نہ میں موجوں سے ڈرتا ہوں، نہ طوفانوں سے، نہ دریا سے خائف ہوں نہ سمندر سے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ جو چیز آپ کو مرغوب ہو مجھے بھی مرغوب ہو، جو چیز آپ کو پسند ہو میں بھی اسے پسند کرنے لگوں؟ آپ کو چمن آرائی میں لطف آتا ہے، سمندر پر ٹہلنے میں کشش محسوس ہوتی ہے، اٹھتی ہوئی، بپھرتی ہوئی سرکش اور تند موجوں کا نظارہ بھاتا ہے، پھولوں، قہقہوں اور نغموں میں کیف محسوس ہوتا ہے، ساحل سمندر پر محو خرام، مردوں عورتوں اور بچوں کو دیکھ کر شگفتگی سی پیدا ہوتی ہے، میں بدقسمتی سے ان تمام جذبات لطیف سے محروم ہوں، میرے لیے اتنی ہی تفریح کافی ہے کہ ہوٹل سے دفتر دفتر سے کلب اور کلب سے ہوٹل جاؤں، کچھ وقت گزاروں اور پھر جا کر مطالعہ

کروں، اور سدا رہوں'' !

افروز اور مس دارو والا نے بڑے انہماک اور توجہ سے ندیم کی باتیں سنیں، پھر افروز نے ایک ٹھنڈی سانس لی، اور بولی،

''میں سمجھ گئی ندیم صاحب'' !

''جو کچھ سمجھا کیجیے اسے سمجھا بھی دیا کیجیے'' !

مس دارو والا کو پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا، افروز نے کہا،

''میرا خیال ہے، آپ کا دل گھائل ہے، آپ نے چوٹ کھائی ہے کہیں'' !

یہ کہکر اس طرح اس نے جیسے چور پکڑ لیا ہو، ندیم کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگی، ندیم نے اپنے چہرے پر کوئی کیفیت طاری کیے بغیر سادگی سے کہا،

''مس افروز یہ آپ کا خیال ہے کہ مرض عشق نے مجھ پہ حملہ کیا ہے اور میں کسی کو دل دے بیٹھا ہوں، ——''

مس دارو والا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا،

عشق کرنا، محبت کرنا کسی کو چاہنا تو بڑی اچھی چیز ہے'' !

افروز نے اس مصرعہ پر گرہ لگائی،

''بلکہ حاصل حیات ہے' وہ زندگی ہی کیا جو چاہنے یا چاہے جانے کے بغیر بسر ہو'' !

لیکن ندیم نے دونوں کو ساکت کر دیا، اس نے کہا،

''میں کسی سے محبت نہیں کرتا، میں کسی پہ عاشق نہیں، نہ میرے دل میں کوئی غم ہے، نہ کسی کی یاد میں آہیں بھرتا ہوں، نہ اختر شماری کرتا ہوں، کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ محبت کوئی چیز ہے اور مجھے یہ کر کے دیکھنا چاہیے، کہ کیا چیز ہے؟'' مسکراتے ہوئے ''لہذا مس افروز اپنے الفاظ واپس لیجیے'' !

ندیم کی یہ باتیں سنکر سناٹا چھا گیا، افروز اور مس دارو والا دونوں پر ایک عالم

دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں اور یہ نگاہیں پکار پکار کر یہ کہہ رہی تھیں یا اللہ یہ شخص کس مٹی سے بنا ہے، اتنا طرحدار اور بانکا آدمی، اور اتنا ٹھس، اتنا بے حس، لطیف جذبات وحیات سے اس درجہ محروم، ؟

مس دارو والا ندیم کے خاموش ہونے کے بعد گویا ہوئی،

"لیکن جو لوگ اس طرح بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہیں، وہ جب مبتلائے محبت ہوتے ہیں تو ان کی حالت بڑی قابل رحم ہوتی ہے ——— کیوں افروز یاد ہیں وہ مسٹر احمد، ؟"

افروز نے افسردہ تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

"ہاں یاد ہیں! "

مس دارو والا نے اور یاد دلاتے ہوئے کہا،

مگر جب وہ مبتلائے عشق ہوئے تو دیوانگی کی حالت طاری ہو گئی، سب کچھ لٹانے پر تیار ہو گئے، کئی مرتبہ تو خودکشی پہ آمادہ ہو گئے، آخر خدا خدا کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور زرینہ سے شادی ہو گئی تب جا کے آدمی بنے ———

افروز نے اسی طرح کہا،

"ہاں، ——— "

مس دارو والا نے ندیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا،

"اچھا مسٹر ندیم، ساحل سمندر کو چھوڑیئے، اب دل بھی نہیں رہا، اب میں ایک اور تجویز پیش کرتی ہوں اسے قبول کرنے میں تو غالباً کوئی عذر نہ ہوگا آپ کو۔!"

ندیم نے آمادگی اور مستعدی کے ساتھ جواب دیا،

"کسی قابل قبول تجویز کے ماننے میں مجھے عذر نہیں ہو سکتا، فرمایئے!"

مس دارو والا گویا ہوئی،

"مجھے اپنے گھر جانا ہے، جو آپ کے ہوٹل کے قریب ہی ہے، اور افروز اپنے گھر جائے گی جو راستہ میں پڑتا ہے، ہم دونوں کو ڈراپ کر دیجئے اب تو غالباً آپ کے اٹھنے کا بھی وقت آگیا ہوگا، !"

ندیم نے کچھ تامل کے بعد کہا،

"جی ہاں اٹھنے کا وقت آگیا ہے اور اس میں کچھ زیادہ قباحت بھی نہیں تھی کہ آپ دونوں کو راستہ میں ڈراپ کر دیا جاتا، لیکن ایک مشکل ہے، ——— ——— !"

افروز نے تیوری چڑھا کر سوال کیا،

"آپ کی تکلیفیں کبھی ختم بھی ہوں گی؟ ——— اب نئی مشکل کیا پیش آئی ہے؟"

ندیم ہنسنے لگا، اس نے کہا،

"شوفر ڈرائیور نہیں ہے، !"

مس دارو والا نے پوچھا،

"تو کیا آپ کار پر نہیں آئے ہیں؟"

"آیا تو کار ہی پر ہوں، !"

"پھر اسے کس نے ڈرائیو کیا تھا؟"

"خود میں نے؟"

"پھر کیا قباحت ہے؟"

"قباحت یہ ہے کہ میں کسی ایسی خاتون کو کار میں ساتھ لے کر نہیں جا سکتا جس سے میرا کوئی خاص علاقہ نہ ہو، !"

مس دارو والا کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی، افروز پیکر غضب بن کر اٹھی،

اس نے مس دارو والا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا،

"آؤ چلیں، ! "

"ندیم نے دونوں کو رخصت ہوتے دیکھا، اور مسکرا کر خاموش ہو گیا، گویا دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ ———— رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت، ———— ! "

---

(۱۰)

افروز خفا ہوکے چلی گئی، مس دارو والا بھی اس کے ساتھ رخصت ہوگئی، ندیم نے دونوں میں سے اخلاقاً بھی کسی کو نہیں روکا، اطمینان سے بیٹھا سگرٹ پیتا رہا، راستہ میں افروز نے مس دارو والا سے کہا،

"دیکھ لیا تم نے اس گنوار کو، ؟"

مس دارو والا مسکراتی ہوئی بولی،

"ہاں بھئی دیکھ لیا، !"

افروز گویا ہوئی،

"کیا خیال ہے ان ذات شریف کے متعلق تمہارا ؟"

مس دارو والا نے شریر نظروں سے اسے دیکھا پھر بولی،

"تم بتاؤ پہلے، !"

افروز نے جل کر کہا،

"میرے خیال میں تو پہلے درجے کا گنوار، اور اجڈ ہے، !"

مس دارو والا بولی،

"بھئی ہمیں تمہاری رائے سے اختلاف ہے / ——— معاف کرنا، !"

افروز حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی،

"پھر سے تو کہنا؟ ——— تمھیں اختلاف ہے میری رائے سے؟"

مس دارو والا نے جواب دیا،

"تو اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے؟ ——— ہے پھر؟"

افروز سنبھل گئی،

"نہیں میں خفا نہیں ہوتی، بس ——— لیکن تمھاری اس رائے پر تعجب ضرور ہے،!"

مس دارو والا نے کہا،

"سچ پوچھو تو تعجب مجھے خود بھی ہے،!"

"پھر بھی اپنی رائے پہ قائم ہو؟"

"ہاں افروز، ——— شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مردوں کی چاپلوسی، تملق، خوشامد، ریاکاری، بوالہوسی سے تنگ آگئی ہوں، ایک کھرا، اور اکھڑ قسم کا آدمی ملا، تو دل اس کی طرف کھینچنے لگا،!"

افروز چلتے چلتے رک گئی،

"دل اس کی طرف کھینچنے لگا، ——— کیا تم محبت کرنے لگیں اس سے؟"

مس دارو والا نے، ہنستے ہوئے اور قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا،

"اتنا بڑا دعویٰ ایک ہی ملاقات کے بعد تو نہیں کر سکتی، لیکن اگر کچھ روز کے بعد، سنو کہ میں ندیم سے محبت کرتی ہوں تو یقین کر لینا،!"

لیکن افروز اب تک اپنی جگہ ایک مورت کی طرح کھڑی تھی،

"یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ ——— کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟"

مس دارو والا نے پھر دو قدم پیچھے ہٹ کر اس کا ہاتھ پکڑا، اور ساتھ لے کر چلتی ہوئی بولی،

"کیوں نہیں ہو سکتا، دنیا میں کیا نہیں ہوتا،؟ ——— یہ بتاؤ

تمھارے نسیم صاحب کا کیا حال ہے' ؟"

"اچھے ہیں" ! "

"خوب نبھ رہی ہے تم دونوں میں ؟ "

"ہاں نبھ رہی ہے' ! "

"اور شادی ؟ ——————— وہ بھی تو ہونی چاہیے ، یہ خوش خبری کب سننے میں آ سکے گی ؟ "

"اگر ہوئی تو کسی دن یہ خوش خبری بھی سن لوگی" ! "

"سنا ہے شاہد صاحب بھی تمھاری فکر میں ہیں ، ——— کیا سچ ؟ "

"وہ کس کی فکر میں نہیں ہیں ؟ "

مس دارو والا ہنسنے لگی ،

"سچ کہتی ہو ، عجیب ڈھل مل یقین آدمی ہے ، اس کمبخت کو عارضی طور پر بھی محبت کرنا نہیں آتی ۔ ! "

افروز سوال کیے بغیر نہ رہ سکی ،

"کیا محبت عارضی بھی ہوتی ہے ؟ "

مس دارو والا نے اپنے پرس کو اچھالتے ہوئے کہا ۔

"کسی طرح کی ہوتی ، عارضی ، مستقل ، وقتی ، ——————— کیا تم نے کسی سے محبت نہیں کی کبھی ؟ کم از کم عارضی محبت تو کر چکی ہو ، اس کی گواہی میں دے سکتی ہوں" ! "

افروز کچھ جھینپ سی گئی !

"چھوڑو یہ ذکر ، ——————— میں محبت کی قائل ہی نہیں ہوں" ! "

"مس دارو والا ہنسنے لگی ،

"خدا کے لیے ایسا نہ کہو ، ورنہ نسیم صاحب زہر کھالیں گے ، اور شاہد صاحب

خودکشی کرلیں گے، اور نہ جانے کتنے دوسرے صاحبان جان سے جائیں گے، !!" ——— ——— تم سے کوئی ایک آدمی تو محبت نہیں کرتا، جب تم نے طلاق لے لی ہے، ایک دنیا امنڈی پڑ رہی ہے تم سے اظہارِ عشق کے لیے، اور بھئی سچ پوچھو تو تم ہو بھی اس قابل کہ من مندر کی دیوی بنا لیا جائے تمہیں، وہ کون سی خوبی ہے جو تم میں نہیں، ؟ اگر میں مرد ہوتی تو تمہارے لیے نہ جانے کتنوں سے ڈوئل لڑ چکی ہوتی،

افروز نے ایک زور کی چٹکی لی، اور کہا،

"بہت زبان چلنے لگی ہے !"

مس دارو والا اس چٹکی سے تلملا گئی، پھر کہنے لگی،

"بڑی ظالم ہو افروز تم، میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا، جو اتنی زور کی چٹکی لی، سچ خون جھلک آیا ہوگا بازو پر، دیکھوں ؟"

افروز نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا،

"گھر جا کر دیکھ لینا، ——— ہاں یہ تو بتاؤ آج کل کس سے رومان چل رہا ہے ——— ؟"

مس دارو والا گویا ہوئی،

"بھئی میں نے خود سے تو کبھی کسی سے رومان لڑایا نہیں، لوگوں کی خود ہی شامت آجاتی ہے، اور وہ آہیں بھرنا، آنسو ٹپکانا، تحفے دینا شروع کر دیتے ہیں، تو مجھے بھی ترس آجاتا ہے، پھر جب ان کا یہ جوشِ جنوں کسی اور طرف منتقل ہو جاتا ہے، میں بھی انھیں بھول جاتی ہوں، خدا کی اس وسیع دنیا میں احمقوں کی کمی تو ہے نہیں، ایک سے ایک پڑا ہے، کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا ہے"!"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم ؟"

"تم جیسی پیاری سہیلی سے جھوٹ بول سکتی ہوں ؟"

"تو سیٹھ غنی بھی بھائی اسماعیل جی سے جو پینگ رہے تھے وہ بھی اسی قسم کے تھے؟"

"ہاں بالکل اسی طرح کے!"

"لیکن انھیں تو دعویٰ ہے کہ عشق کرتے ہیں تم سے؟"

"پہلے یہ دعویٰ سب کے سامنے کیا کرتے تھے، اب صرف میرے سامنے کرتے ہیں۔ اور کچھ دنوں بعد میرے سامنے بھی نہیں کریں گے!"

افروز کو بے ساختہ ہنسی آگئی، وہ بولی:

"بھی عجیب چیز ہو تم بھی، کتنی صفائی سے ساری باتیں اگل دیتی ہو!"

"ہاں لیکن صرف تمھارے سامنے اس لیے کہ تم پر اعتماد کرتی ہوں، مردوں کے ساتھ تمھارا رویہ چاہے جیسا ہو، لیکن ایمان کی کہوں گی، سہیلیوں کی دوستی اور غمخواری میں تمھارا کوئی جواب نہیں۔ مرتے مرتے نہیں بھول سکتی کہ کئی مرتبہ جب مالی مشکلات میں گرفتار ہوئی تو بغیر کہے تم اپنی پرس بھول کر میرے یہاں چلی گئیں، اور پھر کبھی بھولے سے بھی اس کا نام نہ لیا، اس طرح کم از کم چار سو کی میں تمھاری مقروض ہو چکی ہوں، کئی مرتبہ ایسے موقعے آئے کہ میں یہ رقم آسانی سے واپس کر سکتی تھی، آج کل بھی اس پوزیشن میں ہوں، لیکن تمھاری طبیعت جانتی ہوں اگر کبھی واپسی کا نام بھی لیا تو خفا ہو جاؤ گی، اور تم میں یہ بڑا عیب ہے کہ خفا ہونے کے بعد منتی بڑی مشکل سے ہو!"

"خواہ مخواہ کی بکواس نہ کرو، ان باتوں کا یہ کیا موقع تھا؟"

"اچھا چپ ہوئی جاتی ہوں!"

"سچ کہنا کیا ندیم پر تمھاری طبیعت مائل ہے؟"

"دیکھو افروز تم سے جھوٹ بولنا گناہ سمجھتی ہوں ——— میرا جواب ہاں کے سوا کچھ نہیں ہے!"

"لیکن تم تو کہتی تھیں آج تک تم نے کسی سے رومان نہیں لڑایا!"

"ہاں۔ ——— پہلا تجربہ کر رہی ہوں۔ دعا کرو مجھے کامیابی ہو!" ——— لیکن ایک بات تو بتاؤ"!"

"اجازت لینے کی ضرورت نہیں پوچھو"!"

"تم تو ندیم کی طرف راغب نہیں ہو"

"اگر میرا جواب ہاں ہو تو ؟"

"یقین کرو، پھر میں یہ خیال دل سے نکال دوں گی"!" ——— تمہارے لیے میں سب کچھ کر سکتی ہوں"!"

"شکریہ ——— لیکن سوال یہ ہے کیا اس خیال کو دل سے نکال بھی سکو گی ——— ؟"

"ہاں ابھی موقع ہے ؟"

"وہ کس طرح ؟"

"آج اس کے پاس بیٹھ کر میں نے ایسا محسوس کیا جیسے بے ساختہ میں اس کی طرف کھنچی جا رہی ہوں، میں نے بھی سوچا، چلو آج تک دوسرے مجھ سے محبت کرتے آئے تھے، ایک دفعہ میں اگر اس سمندر میں غوطہ لگاؤں تو کیا حرج ہے ؟ یا ڈوبے یا پار بھیے لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ تمہارا منظور نظر ہے تو اب میں اس سے کبھی نہیں ملوں گی، فرید پور کلب میں آنا چھوڑ دوں گی، جہاں اسے دیکھوں گی چپکے سے کھسک جاؤں گی، اگر کبھی مڈبھیڑ بھی ہو گئی تو وہ خود پہل کرنے سے رہا، میں بھی نہیں بولوں گی، انجان بن جاؤں گی، چلئے بات ختم"!"

"یہ سب تم کر لو گی ؟"

"ہاں، فردوس تمہارے لیے کر لوں گی، اور ابھی یہ میرے لیے بڑی آسانی سے ممکن ہے، کیونکہ ابھی تو صرف ایک خیال ہے جو ذہن و دماغ میں گردش کر رہا ہے"۔

میری اس سے پیہم اور مسلسل ملاقاتیں نہیں ہوئیں، یہ خیال محبت کی شکل تو اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جب ہم بار بار ایک دوسرے سے ملیں، ہمیں بار بار ایک دوسرے کے قریب کا موقع میسر آئے، لیکن اگر اس کا موقعہ ہی نہ آنے دیا جائے تو ظاہر ہے یہ خیال اپنی موت آپ مر جائے گا!"

"لیکن میرے لیے اتنا بڑا ایثار کیوں؟"

"کہہ تو چکی ہوں، میرے دل میں تمہاری عزت ہے اور محبت ہے"!"

"حالانکہ میں جانتی ہوں کہ جو لوگ دل سے مجبور ہو جائیں انھیں چھوڑ کر دوسرے لوگ مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے"!"

"افروز یہ میں بھی جانتی ہوں"!"

"پھر بھی ——————— ؟"

"ہاں پھر بھی اس لیے کہ جو لوگ تمھیں اچھا نہیں جانتے، میں خود انہیں اچھا نہیں سمجھتی"!"

"یہ تو ظلم ہے تمہارا؟"

"یہ نہ کہو افروز، میں جھوٹ نہیں بولتی"!"

"کیا یہ بھی سچ ہے؟"

"ہاں ——————— روزِ روشن کی طرح سچ"!"

"نہ جانے کس طرح ——————— اپنی سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔"

"افروز! تمھیں وہی لوگ برا سمجھتے ہیں جو صرف یہ جانتے ہیں کہ تم نے ایک شوہر سے طلاق لے لی، لیکن جو لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ شوہر کیسا تھا، اور کس قدر مجبور ہو کر تم نے طلاق لی، وہ تم سے ہمدردی رکھتے ہیں، تمھیں صرف وہی لوگ مکروہ نظروں سے دیکھتے ہیں،

جو یہ دیکھتے ہیں کہ تم آزادانہ غیر مردوں سے ملتی، اور ان پر ڈورے ڈالتی ہو، لیکن جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ تم مجبور ہو کر کرتی ہو، بغیر اس کے تم اپنے فالج زدہ باپ کا علاج نہیں کر سکتیں، اپنی مدقوق ماں کی زندگی کا سامان مہیا نہیں کر سکتیں، اپنی ننھی سی بچی کی تعلیم و تربیت کا بندوبست نہیں کر سکتیں، وہ تمھیں قابل معافی سمجھتے ہیں، جن لوگوں نے یہ رائے قائم کر رکھی ہے تمھارے بارے میں کہ صرف غمزہ فروش ہو، وہ تمھیں للچائی ہوئی نظروں سے بھی دیکھتے ہیں، اور برا بھی کہتے ہیں، لیکن جن کے سامنے تمھارا یہ روپ ہے کہ تم مصیبت زدہ لوگوں کو دیکھ کر تڑپ جاتی ہو، وہ تمھاری عزت نہ کریں تو کیا کریں، ؟ جو لوگ نہایت بے ایمانی کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ تم صرف لوگوں کو پھانسنے کے لیے ہوٹلوں میں آتی ہو، وہ تمھیں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، لیکن میں جانتی ہوں تم صرف شوہر کی تلاش میں آتی ہو، ایک ایسے آدمی کی جستجو میں جو شریف ہو، نیک ہو، انسان ہو، اور تمھیں اپنا لے، تمھاری پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو آدمی تمھاری طرف بڑھتا ہے جسے تم قبول کرتی ہو، وہ ہمیشہ کے لیے تمھارا ہو جائے۔ تمھاری ناموس اور آبرو کا محافظ بن جائے، لیکن جب ناموس اور آبرو کا سودا کرنے لگتا ہے، اور تم کسی طرح اسے ڈھرے پر نہیں لا سکتیں، تو ہتھیار ڈال دیتی ہو، ——— افروز میں غلط تو نہیں کہتی ؟"

مس دارو والا نے یہ کہہ کر افروز پر نظر ڈالی تو اس کی آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں گر رہی تھیں، وہ بے تاب ہو کر اس کے آنسو پونچھنے لگی،

"ارے، ——— تم رو کیوں رہی ہو ؟"

افروز نے گلوگیر آواز میں کہا،

"آنسو ہمدردی کے سامنے نکلتے ہیں ——— لیکن یہ میری کمزوری تھی معاف کرنا، !"

مس دارو والا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے، اس نے گفتگو کا موضوع بدلتے

ہوئے پوچھا،

"کیا نسیم صاحب شادی پر آمادہ ہیں؟"

افروز نے روہانسی آواز میں جواب دیا،

"خدا جانے، !"

"آخر کہتے کیا ہیں؟"

"شراب پیتے ہوئے، جوا کھیلتے ہوئے، ریس میں حصہ لیتے ہوئے، تماش بینی کرتے ہوئے، باپ سے ذرا بھی نہیں ڈرتے، لیکن جہاں شادی کا نام آیا، والد محترم کے پرجلال چہرے کا تصور کر کے لرزہ بر اندام ہو گئے، !"

"اگر ندیم سے امید ہو، تو یہاں کوشش کر لو، میں نہ صرف یہ کہ راستہ سے ہٹ جاؤں گی، بلکہ ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گی، !"

"نہیں، ———— وہ تمہیں مبارک، !"

"یعنی ———— ؟"

"یہ تو تم نے دیکھ ہی لیا، وہ کس قسم کا آدمی ہے، ایسے آدمی کو رام کرنا بہت مشکل ہے، اور یہ مشکل اگر آسان ہوئی بھی تو ایک مدت لگ جائے گی اس میں ———— اک عمر چاہیے، کہ گوارا ہو نیش عشق، !"

"پھر؟ ———— کیا ارادہ ہے؟"

"دیکھتی ہوں نسیم صاحب کے ساتھ کب تک گزرتی ہے، !"

"نہیں افروز یہ ٹھیک نہیں، زندگی کا ایک مستقل ڈھرا بننا چاہیے، باعزت طور پر، !"

"لیکن جو چیز اپنے بس ہی میں نہ ہو؟"

"مایوس کیوں ہوتی ہو؟"

"اس لیے کہ عمر گذری جا رہی ہے؛ میں دیکھتی ہوں کہ بڑھاپا وقت سے بہت پہلے دوڑا چلا آ رہا ہے میری طرف! ——— حالانکہ چاہتی یہ تھی کہ موت وقت سے پہلے آئے!!"

مس وارد والا نے اپنا دست نازک افروز کے منہ پہ رکھ دیا،

"خاموش،!!"

افروز خاموش ہو گئی، پھر اس نے پوچھا،

"کیا بات ہے؟"

مس وارد والا نے کہا،

"چپ رہو، ایسی باتیں نہیں کیا کرتے، ——— تم زندہ رہو گی، بہت دن زندہ رہو گی، عزت آبرو کے ساتھ زندہ رہو گی،!"

افروز کے ہونٹوں پہ ایک پھیکا سا تبسم نمودار ہوا،

"تم نے ہاتھ دیکھے بغیر، قسمت کا حال بتانا شروع کر دیا،!"

مس وارد والا ہنسنے لگی،!

(۱۱)

دوسرے روز ندیم ناشتہ سے فارغ ہو کر لباس بدل کر دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا، ملازم نے آکر اطلاع دی،

"ایک صاحبہ آپ سے ملنے آئی ہیں"!

ندیم چونک پڑا،

"صاحبہ؟ ——— کوئی خاتون ملنے آئی ہیں مجھ سے؟"

ملازم نے تسلیم کر لیا،

"جی وہی ہیں"!

ندیم نے سوال کیا،

"جی وہی ہیں! ——— کیا تم انھیں جانتے ہو؟"

وہ بے چارہ گھبرا گیا، کہنے لگا،

"نہیں صاحب میں کیا جانوں گا بھلا ایسی بڑی ہستیوں کو"!

ملازم سے جھک جھک کرنا ندیم نے غیر ضروری سمجھا، اور دوسرے کمرہ میں پہنچا جسے ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کرتا تھا، یہاں ایک سمن بر اور پری پیکر خاتون اس کے انتظار میں ٹہل رہی تھی ——— جیسے سیماب کہ کسی پہلو قرار نہیں،

ندیم نے دیکھتے ہی پہچان لیا، یہ مس دارو والا تھی، اس نے حیرت کے ساتھ پوچھا،

"مس دارو والا آپ؟"

وہ مسکرانے لگی، اور قیامت کی ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا،

"کیا آپ کو شبہ ہے کچھ؟"

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی، ندیم نے جواب دیا،

"نہیں شبہ کا کیا سوال، البتہ اس بات پر حیرت ضرور ہے کہ آپ نے تکلیف کیسے فرمائی یہاں تک آنے کی،؟"

مس دارو والا اب تک کھڑی تھی، یکایک وہ کرسی پر دھم سے بیٹھ گئی، کہنے لگی،

"مسٹر ندیم آپ تو کچھ عجیب سے آدمی ہیں، کھڑے کھڑے میری ٹانگیں دکھنے لگیں، اخلاقاً ہی کہہ دیا ہوتا کہ بیٹھ جاؤ، بہرحال آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ گھر سے ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل آئی یہاں منیجر سے آپ کے کمرہ کا نمبر پوچھا، پھر آپ کے ملازم سے ملاقات ہوئی، اور اس طرح یہاں پہنچ گئی،!"

ندیم بھی پاس ہی کی کرسی پر بیٹھ گیا، اس نے قدرے ناگواری کے ساتھ کہا،

"خوب، ——— خیر یہ تو فرمایئے تشریف آوری کیسے ہوئی،؟"

مس دارو والا نے کہا،

"محض آپ سے ملنے کے لیے،؟"

"مجھ سے ملنے کے لیے،؟ ——— لیکن میرا خیال ہے ہمارے درمیان کوئی خاص مراسم نہیں ہیں، ———"

"جی ہاں خاص مراسم تو نہیں ہیں، لیکن کیا ہو بھی نہیں سکتے،؟"

"(سخت پریشان ہو کر) ہونے کو دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا، لیکن مراسم اور تعلقات رفتہ رفتہ اور تدریجی طور پر ایک مدت میں قائم ہوتے ہیں، میری تو آپ سے صرف ایک ہی ملاقات ہوئی ہے، !"

"(مسکراتے ہوئے) نہیں مسٹر ندیم غلط بیانی سے کام نہ لیجیے، ایک نہیں دو، ایک ملاقات کل کلب میں ہوئی تھی، دوسری آج، !"

"(بے حد زیادہ حواس باختہ ہو کر) آپ ٹھیک کہتی ہیں، !"

"ٹھیک سے بیٹھیے، آپ تو اس طرح بیٹھے ہیں جیسے کہیں جانے والے ہوں، !"

"جی ہاں مجھے دفتر جانا ہے، اور میں اوقات کا بہت پابند ہوں، !"

"کیا کسی دن ناغہ نہیں کرتے آپ؟"

"اگر کوئی ایسی ہی سخت و شدید ضرورت ہو، !"

"کیا میرا آپ کے پاس آنا، یہاں موجود ہونا ایسی سخت و شدید ضرورت نہیں ہے کہ ناغہ کرنے کا سبب بن سکے، !"

"نہیں مس دارو والا، میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو آپ سے زیادہ سمجھتا ہوں، !"

"اچھا اگر یہ بات ہے تو شوق سے جائیے، لیکن کوئی ایسا وقت بتائیے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کر سکیں، یا کہیں سیر و تفریح کو جا سکیں، یا آپ میرے ہاں کھانا کھائیے یا میں آپ کے ہاں آجاؤں ڈنر پر، !"

ندیم حیرت سے یہ باتیں سن رہا تھا، کس روانی اور بے تکلفی سے یہ عورت اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے کا وقت مانگ رہی تھی، سیر و تفریح کی پیش کش کر رہی تھی، کھانا کھلانے پر بھی تیار تھی، اور کھانے پر بھی، یہ تو کچھ عجیب قسم کی عورت تھی، گویا پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑی ہے، گربہ کشتن روز اول، اگر آج ہی غلط فہمی رفع نہ کی گئی، تو اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا یہ سوچ کر بڑے ٹھنڈے اور ملائم لہجہ میں گویا ہوا،

معاملہ اب حد سے گزرتا جا رہا تھا، ندیم نے کہا،

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں"؟"

وہ کہنے لگی، لیکن، کافی دیر تک تبسم کی بجلیاں گرانے کے بعد،

"سچ ——————— یہ واقعہ ہے مسٹر ندیم کہ آپ سے صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوئی لیکن وہ میرے لیے یادگار اور ناقابل فراموش بن گئی ہے، اور اب یہ میرے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے کہ آپ سے راہ و رسم نہ پیدا کروں، ——————— آپ کو پورا حق ہے کہ اپنے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ کریں، خود سے کبھی نہ ملیں، میرے گھر کبھی نہ آئیں، مجھے اپنے ہاں کبھی نہ بلائیں، لیکن اگر میں ملنا چاہوں، تو ہرگز اسے باور نہیں کر سکتی کہ آپ اتنے گئے گزرے ہیں، اور اخلاق سے اتنے عاری ہیں کہ ملنے سے انکار کر دیں گے"!"

ندیم ابھی اس گفتگو کے جواب میں کچھ نہیں کہہ پایا تھا کہ وہ اٹھی اور کہنے لگی،

"آپ کے دفتر کو دیر ہو رہی ہے، تشریف لے جائیے، میں فرائض میں حارج نہیں ہونا چاہتی، کلب میں تو خیر ملاقات ہوتی ہی رہے گی، لیکن اس کے علاوہ اگر ملنے کا جی چاہا، اور یہ صاف صاف عرض کر دوں کہ ضرور چاہے گا، تو دفتر آجایا کروں گی ——————— "

ندیم حیرت سے یہ باتیں سن رہا تھا، ابھی اس کے ہوش و حواس پورے طور پہ بحال نہیں ہوئے تھے کہ وہ اٹھی، اپنا پرس اٹھایا اور بل کھاتی، مسکراتی، کمرہ سے باہر نکل گئی،

بڑی دیر تک وہ اپنی کرسی پر گم سم بیٹھا رہا، اس طرح کے حادثہ سے وہ آج تک کبھی دوچار نہیں ہوا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس سے کس طرح

"دیکھیے مس دارو والا، میں آپ کو صاف صاف بتا دوں، میرے وقت کا زیادہ حصہ دفتر میں، یا دفتری کاموں میں صرف ہوتا ہے، لہٰذا یہ مشکل ہے کہ کوئی خاص وقت معین کر سکوں کہ آپ تشریف لائیں اور ہم بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں، سیر و تفریح کے لیے کہیں جانے کا بالکل عادی نہیں ہوں، کلب میں جو وقت صرف ہوتا ہے، اس سے زیادہ تفریح کا میں طالب بھی نہیں ہوں، رہا آپ کا میرے ہاں، یا میرا آپ کے ہاں کھانا کھانا، تو یہ محض رسمی چیز ہے، لہٰذا قطعاً غیر ضروری،"

ان صاف اور واضح باتوں سے مس دارو والا کی ذرا بھی حوصلہ شکنی نہیں ہوئی اس نے کہا،

"اچھا خیر سیر و تفریح، یا کھانے پینے پر میں زیادہ اصرار نہیں کرتی، یہ چیزیں بعد میں جب چاہیں ہو سکتی ہیں، لیکن کبھی کبھی مل بیٹھنا، تو یہ جرم ہے، نہ معیوب، نہ قابل اعتراض، آپ کی بے پناہ مصروفیتوں کا مجھے اندازہ ہو گیا ہے، لہٰذا وقت مقرر کرنے کا مطالبہ بھی واپس لیتی ہوں، جب جی چاہے گا دفتر میں آ کر مل لیا کروں گی، اگر آپ کو فارغ دیکھوں گی تو کچھ دیر بیٹھ جاؤں گی ورنہ واپس آ جاؤں گی!"

بھاگنے کا راستہ ہر طرف سے مسدود دیکھ کر، ندیم جیسا چڑچڑا اور تنک مزاج شخص بھی چکرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا جواب دے، آخر اس نے ذرا تامل کے بعد کہا،

"لیکن مس دارو والا اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

وہ بولی،

"مسٹر ندیم ہر کام ضرورت ہی کے ماتحت نہیں کیا جاتا، آپ مجھ میں کوئی کشش نہیں محسوس کرتے ہیں، لہٰذا مجھ سے ملنے کے پروگرام بھی نہیں بناتے، میں آپ میں ایک طرح کی جاذبیت پاتی ہوں، اس لیے ——————"

اور کیوں کر عہدہ برآ ہُوا جا سکتا ہے، ؟ آخر اضطراب و پریشانی کے عالم میں دفتر روانہ ہوگیا، !

لیکن راستہ بھر ایک عجیب بے کلی سی طاری رہی اس پر، رہ رہ کر آج کی عجیب و غریب باتیں یاد آرہی تھیں، اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس نئی مصیبت سے عہدہ برآ ہونے کی آخر کیا صورت ہے ؟

میری ذاتی اُلجھنیں کیا کم تھیں کہ ایک یہ مصیبت نازل ہوگئی۔ ٭

(۱۴)

ندیم دفتر آیا تو کچھ مضطرب اور پریشان سا تھا، مس داروالا نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا، اس کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا، تو ان دل فریب اداؤں اور میٹھی باتوں کے سحر میں گرفتار ہو کر فوراً سر بہ سجدہ ہو جاتا وہ تو ندیم تھا، جسے گویا صنف نازک سے ایک بیر سا تھا اور اگر بیر نہیں تھا تو کوئی خاص دلچسپی بھی نہ تھی، اس لیے ایک ہی جھٹکے میں اس دام ہمرنگ زمین سے نکل آیا، لیکن حواس اب تک بجا نہیں تھے، وہ سوچ رہا تھا۔ اگر یہ عورت پھر میرے پاس ہوٹل میں آ گئی، یا دفتر میں پہنچ گئی تو کیا کروں گا؟ افروز کو اپنے حسن و رعنائی پہ ناز تھا، اس نے مجھ سے لگاوٹ کی باتیں کیں، میں نے ٹیڑھے میڑھے جواب دیے، وہ بھی پیچھے ہٹ گئی، بات ختم، لیکن یہ عورت جس کا نام مس داروالا ہے، یہ تو کسی طرح ہار ماننی ہی نہیں، آخری چارۂ کار یہ ہے کہ اس کے ساتھ سخت درشت برتاؤ کروں، ڈانٹ دوں کسی دن، لیکن دفتر میں یا ہوٹل میں، یا کلب میں اس طرح کی حرکت مجھے بدنام بھی تو کر دے گی،!

پھر ———— ؟

اسی بات کو سوچتے سوچتے اس نے گھنٹی بجائی، روشن خاں حاضر ہوا، تو کہا،

"مس شہلا"!

روشن خاں چلا گیا اور شہلا آ گئی، اب وہ ندیم سے خائف اور لرزہ براندام نہیں

تھی، جس روز سے دونوں میں "دوستی" کا پیمان بندھا تھا، پوری وضعداری اور شرافت کے ساتھ دونوں اس نئے رشتے کو نباہ رہے تھے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا کہ دوستی کی جڑیں زیادہ گہری ہوجاتی رہی تھیں، اور دوستی کا یہ استحکام کسی آئندہ منصوبے کا پیش خیمہ بھی نہیں تھا، اس لیے کہ شہلا کو آج تک ندیم کی آنکھوں میں کوئی جذبہ نظر نہیں آیا تھا، اس کی باتوں میں جو بعض وقت بڑی دیر تک جاری رہتی تھیں، کسی طرح کی لگاوٹ کے آثار نہیں نظر آتے تھے، اس کے انداز و اطوار میں کوئی بات ایسی نہیں تھی، جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان وہ رشتہ قائم کر دیتی ہے، جو صرف مرد اور عورت ہی کے درمیان قائم ہو سکتا ہے، خود شہلا کا بھی یہی حال تھا، بے شک وہ عورت تھی، نوجوان تھی، قبول صورت تھی، آزاد اور خود مختار تھی، وہ چاہتی تو اپنے پیچھے عاشقان صادق کا ایک مجمع لگا لیتی، لیکن مراد کی بے وفائی نے اس کا شیشۂ دل چکنا چور کر دیا تھا اب وہ کسی مرد کی طرف التفات کا جذبہ اپنے اندر نہیں پاتی تھی۔ بلکہ اگر کوئی مرد اس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا تو معاً اسے مراد یاد آجاتا تھا اور وہ خیال کرنے لگتی تھی یہ بھی ویسا ہی چالباز ہوگا جیسا مراد تھا، لہٰذا ندیم کی جنس لطیف سے بے پروائی نے اسے بہت مطمئن کر دیا تھا اور اس دوستی کے رشتے سے صرف مطمئن تھی، بلکہ اسے کافی بھی سمجھتی تھی، اس سے آگے بڑھنا وہ چاہتی ہی نہیں تھی،

کاپی اور پنسل لے کر وہ اپنے ساتھ آئی تھی۔ ندیم نے کہا،

لکھیئے مس شہلا ——

وہ بولنے لگا،

سکریٹری صاحب فرید پور کلب،

میں آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ بعض وجوہ سے اب میں کلب کی ممبری نہیں جاری رکھ سکوں گا، لہٰذا میرا نام ممبری کی فہرست سے خارج کر

دیا جائے، اس عرصہ میں آپ نے اور کلب کے اسٹاف نے اور ممبر حضرات نے میرے ساتھ اخلاق و محبت کا جو برتاؤ کیا اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا،!"

ندیم بیٹھا بولتا گیا اور شہلا شارٹ ہینڈ میں لکھتی گئی، جب لکھ چکی تو وہ کہنے لگا

"اسے فوراً ٹائپ کر کے میرے دستخط کرا لیجیے، اور ابھی روشن خاں کے ہاتھ بھیج دیجیے،!"

یہ اتنے فیصلہ کن لہجہ میں کہا کہ وہ کچھ بول نہ سکی، چند منٹ میں ٹائپ کر کے لے آئی، ندیم نے ایک نظر اس پر ڈالی اور دستخط کر دیئے،!"

"ٹھیک ہے، بس اب فوراً بھیج دیجیے،!"

لیکن شہلا کرسی پر بیٹھ گئی، ندیم نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف —— دیکھا اور گویا ہوا،

"کچھ کہنا ہے ؟"

وہ بولی!

"میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کلب کی ممبری سے کیوں مستعفی ہوئے جا رہے ہیں آپ ؟"

ندیم نے اسے گھور کر دیکھا، پھر پوچھا،

"تو کیا میں غلطی کر رہا ہوں،؟"

"میرا خیال تو یہی ہے،!"

"وہ کیسے ؟"

"آپ کتنی زیادہ محنت کرتے ہیں کون نہیں جانتا، مسٹر جانسن ذرا دیر کو آ کر بیٹھے، اور چلے گئے، مسٹر ایڈورڈ لندن ایسے گئے ہیں کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتے

"ہمارا کام آپ ہی پر پڑتا ہے،" ———

"یہ تو ٹھیک ہے؛ مگر کلب کی ممبری کا اس سے کیا تعلق!"

"کیوں نہیں ہے؟ ——— اگر آپ تفریح نہیں کریں گے، تو کیا اس کا اثر صحت پر نہیں پڑے گا؟"

ندیم ہنسنے لگا۔

"مس شہلا صحت کیا چیز ہوتی ہے اسے میں نے کبھی نہیں سوچا، مجھے زندگی سے زیادہ موت مرغوب ہے، پھر میں صحت کی پروا کیوں کروں؟ کلب میں آنا جانا میں نے اس لیے نہیں شروع کیا تھا کہ طول عمر کا کوئی نسخہ تھا جس پر عمل کر رہا تھا! اس لیے جانے لگا تھا کہ ذرا آب و ہوا بدل جایا کرے گی، لیکن اب کچھ حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ وہاں نہ جانا، جانے سے زیادہ مفید ہے،"!

ندیم کے ان الفاظ میں غم جھلک رہا تھا،!

شہلا اپنے دل سے یہ سوال کیے بغیر نہ رہ سکی،

"یہ کس طرح کا غم ہو سکتا ہے؟"

دل سے یہ سوال اس لیے کیا کہ ندیم سے نہیں کیا جا سکتا تھا،

ندیم نے پیمان دوستی استوار کرنے کے بعد، بارہا شہلا سے باتیں کی تھیں، لیکن آج تک کبھی ان باتوں میں وہ سوز، وہ درد، نظر نہیں آیا تھا، جو آج جھلک رہا تھا؟

"کیوں؟"

مجھے زندگی سے زیادہ موت مرغوب ہے،!"

یہ الفاظ ندیم کے منہ سے کیوں نکلے؟ یہ الفاظ تو میرے تھے، یہ تو مجھے کہنا چاہیے تھے، ان پر تو میرا حق تھا، زندگی میرے لیے ایک صحرا ہے،

ایک ویرانہ ہے، ایک درد ہے، ماں اور بھائی بہن کا خیال نہ ہوتا تو شاید خودکشی بھی کر لیتی، لیکن جو شخص ہزاروں روپے ماہوار کما رہا ہے، جو اپنی ہر خواہش پوری کر سکتا ہے، جسے خدا نے ایسا جمال، ایسی رعنائی، ایسی کشش عطا کی ہے کہ بے جرم کیے نہ جانے کتنوں کو اسیرِ دام کر سکتا ہے، وہ زندگی سے اتنا بیزار ہے کہ اس کے مقابلہ میں موت کو عزیز رکھتا ہے۔

یہ معمہ کیا ہے؟

کیا یہ راز کسی طرح حل ہو سکتا ہے؟

شہلا کے ہاتھ میں ندیم کا دستخط کیا ہوا کاغذ تھا، اور وہ خاموش بیٹھی ہوئی باتیں سوچ رہی تھی کہ ندیم نے کہا،

"آپ تو کچھ سوچنے لگیں،!"

اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

"سوچ یہ رہی ہوں کہ آپ کو کلب کی ممبری سے بہر حال استعفیٰ نہیں دینا چاہیے!"

ندیم بگڑ گیا،

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، آپ کو اس پر غور کرنے کی ضرورت؟"

برجستہ شہلا نے کہا،

"اس لیے کہ ہم دونوں دوست ہیں!!"

ندیم یک بیک نرم پڑ گیا، مسکرانے لگا،

"یہ تو ٹھیک ہے، ———— اور مجھے آپ کی دوستی پر اعتماد بھی ہے اور ناز بھی، جس دن سے ہماری دوستی قائم ہوئی ہے، میں نے آپ کو بہت ادنچا بے غرض اور شریف قسم کا دوست پایا ہے، حالانکہ مرد اور عورت کی دوستی بے حد خطرناک ہوتی ہے!!"

یہ کہہ کر اس نے ایک قہقہہ لگایا،

شہلا کہنے لگی،

"جہاں تک اس دوستی کا تعلق ہے، نہ آپ مرد ہیں، نہ میں عورت ہوں، ——

————"

ندیم کا قہقہہ اور بلند ہو گیا، اس نے پوچھا،

"پھر کیا ہیں ہم لوگ ؟"

شہلا نے جواب دیا،

"صرف دوست، ———— اور دوستی، جنس اور صنف کی قید سے بے نیاز ہوتی ہے"!

یک بیک ندیم سنجیدہ ہو گیا،

"آپ سچ کہتی ہیں مس شہلا، کم از کم ہم دونوں کی دوستی واقعی جنس اور صنف کے امتیاز سے ماورا ہے، اور آپ کی یہی خوبی مجھے سب سے زیادہ پسند ہے کہ آج تک آپ نے یہ نہیں ثابت ہونے دیا کہ وہ کمزوریاں آپ میں موجود ہیں، جو لازمی طور پر عورت میں ہوا کرتی ہیں"!

شہلا کے ہونٹوں پر بھی تبسم کھیلنے لگا،

"شکریہ ————"

ندیم نے پھر گھنٹی بجائی،

روشن خاں حاضر ہوا، دستخط کیا ہوا کاغذ، مع ٹائپ شدہ لفافے کے شہلا کے سامنے رکھا تھا، اس نے وہ کاغذ اٹھایا، تہ کیا لفافے میں رکھا اور روشن خاں کو دیتے ہوئے کہا،

"جاؤ، فرید پور کلب میں شاہد کو یہ دے آؤ"!

روشن خاں خط لے کر چلا گیا، شہلا نے کہا،

"آخر آپ اپنی ضد پوری کر کے رہے، !"

کچھ سوچتے ہوئے ندیم نے کہا،

"مس شہلا میں ایک عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں، !"

شہلا گھبرا گئی،

"کچھ بتایئے تو سہی، !"

ندیم نے پر زور لہجہ میں کہا،

نہیں، ——————— اس کا امداوا آپ کے پاس نہیں ہے — ——————— میں نے کلب سے علیٰحدگی اختیار کر لی ہے اگر ضرورت ہوئی تو میں ہوٹل بھی بدل لوں گا، پھر بھی کام نہ چلا تو کمپنی سے استعفا دے دوں گا، اور فریدپور چھوڑ دوں گا، !"

شہلا نے اضطراب کے ساتھ پوچھا،

"لیکن یہ سب کچھ کیوں کریں گے آپ؟ کوئی وجہ؟ کوئی سبب؟"

بے ساختہ ندیم کے منہ سے نکلا،

"مس دارو والا"

اور بے ساختہ شہلا نے سوال کیا،

"مس دارو والا، ؟ ——————— یہ کون ہے؟"

ندیم نے جواب دیا،

"حوا کی بیٹی، !"

شہلا ہنسنے لگی،

"وہ تو اس کے نام سے ظاہر ہے، کچھ اور بھی تو کہیے، !"

ندیم نے کہا،

"اور یہ کہ لوگوں کا خیال ہے بہت خوب صورت ہے، !!"

شہلا نے جیسے بات کی تہ پالی، بولی،

"میں سمجھ گئی، !!"

ندیم نے سوال کیا،

"مجھے بھی بتائیے، کیا سمجھا ہے آپ نے"

شہلا نے مسکراتے ہوئے کہا،

"پہلے میری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے، پھر ہمدردی !!"

ندیم حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا، کچھ بولا نہیں، پھر آہستہ آہستہ یہی الفاظ دہرائے،

"مبارک باد؟ ہمدردی؟ ——————— کس سلسلہ میں؟"

شہلا نے اور زیادہ خوش ہوتے ہوئے کہا،

"آپ کسی مس وارڈ والا کے نشۂ محبت میں سرشار ہیں، وہ ذرا آپ کو آزما رہی ہے۔ کچھ عشوے، کچھ غمزے، کچھ ادائیں، ان چیزوں سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ آپ سے محبت نہیں کرتی، آپ کی محبت کو ٹھکراتی ہے جلد بازی میں بددلی اور مایوس ہو کر، آپ نے سوچا کلب بھی الغط، ہوٹل بھی غلط، کمپنی بھی قابل ترک اور غریب لیدی بھی ناقابل سکوت ——————— لیکن یہ آپ کی غلط فہمی ہے، وہ آپ کو چاہتی ہے، !!"

ندیم کا چہرہ پھر ویسا ہی خوفناک ہو گیا جیسا کئی مرتبہ شہلا دیکھ چکی تھی ابھر آنکھوں سے انگارے برسنے لگے، پھر چہرہ بھبھوکا ہو گیا، پھر تیوریاں چڑھ گئیں، یہ منظر دیکھ کر شہلا لرز گئی، اور دل ہی دل میں کہنے لگی،

"خدا خیر کرے، ——— میں نے کیا کہہ دیا، کیا ہو گا؟"

ندیم نے اپنے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے بڑے ٹھنڈے لہجہ میں سکون کے ساتھ کہا،

"مس شہلا آپ نے میری توہین کی ہے، آپ نے مجھے گالی دی ہے، آپ نے میرے منہ پر جوتا مارا ہے، ——— اور یہ سب باتیں میں نے اس لیے برداشت کرلی ہیں کہ آپ کو دوست کہہ چکا ہوں، ——— "

شہلا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا،

"مسٹر ندیم ——— "

ندیم نے جھلائے ہوئے لہجہ میں ذرا سختی سے کہا،

"نہیں مس شہلا آپ کچھ نہ کہیے، !"

شہلا خاموش ہو گئی، پھر ذرا دیر رک کر ندیم نے کہا،

"آپ نے یہ نہ سوچا کہ میں محبت کر سکتا ہوں؟ حالانکہ اس لفظ سے مجھے نفرت ہے، آپ نے یہ نہ سوچا کہ میں کسی عورت کی طرف مائل ہو سکتا ہوں، حالانکہ خوب صورت یا بدصورت جوان یا بوڑھی کسی قسم کی عورت کو دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دوں، اتنی نفرت ہے مجھے اس جنس سے، آپ نے یہ نہ سوچا کہ اگر واقعی میرا دماغ خراب ہو جاتا، اور میں محبت کرنے لگتا تو اس سے کرتا، جس میں وہ تمام خرابیاں بظاہر موجود ہیں جو ایک عورت میں ہونی چاہئیں لیکن آپ بھی جب تک عورت کی حیثیت سے رہیں، معلوم نہ ہوں گی کہ میرا کیا رویہ رہا آپ کے ساتھ، یہ رویہ اس دن سے بدلا ہے، جس دن سے آپ اپنی نسائیت سے الگ ہو کر میری دوست بنی تھیں، پھر آپ نے کس طرح یہ سوچ لیا کہ مس دارو والا یا کسی اور مس یا بیگم، یا خاتون یا بانو سے میں عشق کر سکتا ہوں، اور اس عشق میں اتنا آگے بڑھ سکتا ہوں کہ مجنوں بن جاؤں، مس شہلا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، اگر اس کرسی کو جس پر آپ بیٹھی ہیں عشق ہو سکتا ہے تو مجھے بھی ہو سکتا ہے یہ میز جس پر آپ کہنی ٹیکے ہوئے ہیں اگر کسی سے محبت کر سکتی ہے تو میں بھی کر سکتا ہوں،

اس کمرہ کی دیواریں جو ہمیں گھیرے کھڑی ہیں اگر مبتلائے الفت ہو سکتی ہیں، تو میں بھی اس آزار میں مبتلا ہو سکتا ہوں، ———— لیکن اگر یہ نہیں ہو سکتا، ———— بتلایئے ہو سکتا ہے؟"

بیٹھے ہوئے انداز میں شہلا نے کہا،

"نہیں ہو سکتا!"

ندیم نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا،

"لیکن اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ندیم بھی گرفتار محبت نہیں ہو سکتا!"

ذرا دیر چپ رہ کر ندیم نے پوچھا،

"آپ نے سمجھ لیا، میں نے کیا کہا ہے؟"

وہ مدھم آواز میں بولی،

"جی سمجھ لیا!"

ندیم نے پھر سوال کیا،

"یقین بھی کر لیا؟"

وہ اسی طرح گویا ہوئی،

"جی ہاں یقین بھی کر لیا!"

ایک اور سوال کیا ندیم نے،

"اب تو یہ خیال غالباً میرے بارے میں کبھی نہیں آئے گا؟"

اس نے جواب دیا،

"کبھی نہیں آئے گا!"

ندیم خوش ہو گیا، اس نے جیب سے سگرٹ کیس نکالا۔ اور سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا،

"شکریہ، ——————— اگر آپ یہاں بیٹھنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن اگر کوئی کام ہو اور جانا چاہیں تو جا سکتی ہیں، !"

شہلا نے منہ سے کچھ نہ کہا، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کمرہ سے نکلی اور اپنے کیبن میں جا کر بیٹھ گئی، !، ٭

---

(۱۳)

شہلا گھر پہنچی تو ندیم کی باتیں اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں، آج پھر اس کی بیزاری کا یہ عالم تھا کہ خلافِ معمول نہ خسرو کی طرف اس نے توجہ کی، نہ فوزیہ کی باتوں سے دلچسپی لی اور نہ ماہ خاتون کے پاس زیادہ دیر بیٹھی چپ چاپ کھانا کھایا اور کورس کی کتابیں لے کر سب سے الگ بیٹھ گئی، خسرو اور فوزیہ نے اپنی باتوں میں اسے الجھانا چاہا، اس نے جھوٹ موٹ غصہ کرتے ہوئے کہا،

"اب تم لوگ چلتے ہو یا لگاؤں ایک چپت؟"

دونوں ہنستے ہوئے اس طرح بھاگ گئے جیسے کسی قفس سے کوئی چڑیا پھر سے اڑ جائے،

شہلا کے سامنے کتاب ابھی رکھی تھی، لیکن اس کا دماغ ندیم کی عجیب و غریب پریشانیوں کا سبب سوچنے میں مصروف تھا، اس نے اپنے دل سے پوچھا،

آخر کیا بات ہے کہ عورتوں کے سلسلے میں ندیم کا رویہ اتنا جارحانہ ہے۔

اور آج ایک نئی بات معلوم ہوئی۔

یعنی یہ شخص جو قہر و جلال کا پیکر نظر آتا ہے اس کی آنکھیں پرنم بھی ہو سکتی ہیں،

لیکن آنکھوں کا مائل بہ گریہ ہونا رقتِ قلب کے سبب تو بہرحال نہیں تھا، اس کا دعویٰ ہے اور میں اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں اس دعوے کو صحیح سمجھنے پر مجبور ہوں کہ اسے نہ صرف یہ کہ عورت ذات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی کراہت بھی ہے۔

یہی راز معلوم کرنے کی جستجو میں لگی ہوئی ہوں، مگر آج تک یہ معمہ حل نہ ہو سکا، جو شخص مسٹر جانسن کے ساتھ گھنٹوں قہقہے لگا سکتا ہے جو مسٹر ایڈورڈ کے سامنے نشاط و انبساط کا پیکر بنا رہتا ہے، جو اپنے دوسرے دوستوں کی مجلس میں بلبل ہزار داستاں کی طرح چہکتا ہے، کیا بات ہے کہ کسی عورت پر اس کی نظر پڑی اور اس کی تیوریاں چڑھ گئیں، آنکھیں سرخ ہو گئیں، گلے کی رگیں پھول گئیں اور آداب شائستگی کو طاق نسیاں پر رکھ کر وہ غیر مہذب بن گیا،

بے چاری کیتھرائن نے اسے دل ہی دل میں اپنا محبوب بنا لیا تھا، گھنٹوں اور پہر دل میرے پاس آکر اس کی باتیں کرید کرید کر پوچھا کرتی تھی، مجھے اس کی حماقت اور سادہ لوحی پہ ہنسی آتی تھی، لیکن ہر سوال کا جواب دینا ہی پڑتا تھا، نہ جانے کتنے دنوں کی منصوبہ بندی کے بعد اس نے فرعون کے دربار میں حاضر ہونے کی جرأت کی، لیکن ایسی ڈانٹ پڑی کہ بھاگتے بن پڑی، پھر نہ اس نے مجھ سے کچھ کہا نہ میں نے اس کے دل مجروح کی خیریت پوچھی، وہ مجھے دیکھ کر جھینپ سی جاتی ہے، میں بھی آنکھیں چار نہیں کرتی، کسی کو شرمندہ کرنے سے کیا فائدہ؟"

اور اب تنہا ہوں، کوئی مس وارڈ والا ہیں، وہ بے چاری بھی نہ جانے کتنی آرزوئیں اور حسرتیں لے کر ہوٹل میں پہنچی تھیں، مگر ان کی تو دال ہی نہیں گلی، واپس چلی گئی،

مگر کیتھرائن اور مس وارڈ والا میں فرق ہے، وہ ماتحت تھی، ڈانٹ کھا کر بھاگ کھڑی ہوئی، یہ ایک معزز خاتون ہیں ان کے ساتھ وہ سلوک تو نہیں کیا جا سکتا جو کیتھرائن کے ساتھ کیا گیا، یا مجھ تاکردہ گناہ کے ساتھ روا رکھا گیا تھا، میں نے تو کسی طرح کی کوئی بات کی ہی نہیں تھی، محض میرا عورت ہونا جرم ہو گیا،

سوال یہ ہے کہ ندیم صاحب اگر دنیا کی ہر عورت سے بیزار متنفر اور بدگمان ہیں تو اس دنیا میں زندگی کس طرح بسر کر سکیں گے؟،

کتنا اچھا ہوتا اگر یہ مرد کی بجائے عورت ہوتے، پھر کوئی سوال ہی نہیں تھا، ظاہر

ہے اپنے آپ سے نفرت تو نہ کرتے ؟،

بہر حال دیکھنا چاہیے، اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے

میں تو واقعی ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے ندیم صاحب نہ صرف کلب کو، دفتر کو، ہوٹل کو چھوڑ جائیں گے بلکہ اس شہر کو بھی داغ مفارقت دے جائیں گے، اور یہ برا ہوگا۔ مجھے ایک انسان کی حیثیت سے بہر حال ان کے ساتھ ہمدردی ہے، ان میں جہاں کچھ برائیاں ہیں، وہاں خوبیاں بھی ہیں، اور انسان وہی ہے جو گناہوں اور اچھائیوں کا مجموعہ ہو، ورنہ یا تو فرشتہ ہوگا، یا شیطان، انسان تو بہر حال نہیں کہلایا جا سکتا،

اب ایک نیا خیال بھی میرے دل میں کروٹ لے رہا ہے،

کہیں ندیم صاحب بھاگتے تو نہیں پھر رہے ہیں؟

آج یہاں کل وہاں، کبھی اس شہر میں، کبھی اُس شہر میں،

یہ خیال میرے دل میں یوں آیا کہ کو کمپنی میں بہت بڑے منصب پر فائز ہیں، ہزاروں روپے ماہوار کی آمدنی ہے، لیکن ہوٹل چھوڑنے کا نام نہیں لیتے، حالانکہ اگر مستقل قیام کا ارادہ تھا تو مکان لے کر سکھ اور آرام سے رہنا چاہیے تھا، ہوٹل پھر ہوٹل ہے، گھر پھر گھر، ہوٹل میں وہ آرام نہیں مل سکتا جو گھر میں مل سکتا ہے، اگرچہ بیوی نہ ہو، اور صرف نوکر ہی گھر کو چلاتے ہوں،

اس کے معنی یہ ہیں کہ ندیم صاحب پر سفر سوار ہے، وہ جب چاہیں گے، ہوٹل کا بل چکا کر اسٹیشن جائیں گے اور وہاں سے ریل میں بیٹھ کر کسی نئے شہر میں پہنچ جائیں گے، نیا دانہ نیا پانی، نیا شہر نئی فضا،

آج جس روانی اور بے باکی سے انھوں نے شہر تک کے چھوڑ دینے کا ......

.... ذکر کیا تھا اس سے تو میں اسی نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ نہ جانے کہاں سے اور کتنے شہروں کو اپنے قیام سے نوازتے ہوئے فرید پور تشریف لائے ہیں، اور یہاں سے نہ جانے

کہاں کہاں تشریف لے جائیں گے،

یہ بات آج تک نہ معلوم ہو سکی کہ اس شخص کا وطن کہاں ہے؟ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ بیوی کا تو سوال ہی نہیں، لیکن ماں باپ، بھائی بہن ہیں یا نہیں؟ غریب کیتھرائن نے پہلی ملاقات میں کچھ شان بے تکلفی دکھاتے ہوئے یہی سوال تو کیا تھا۔

"مسٹر ندیم! آپ رہنے والے کس شہر کے ہیں؟"

کیتھرائن کا خیال تھا، ندیم صاحب جس شہر کا نام لیں گے وہ اس کی تعریف شروع کر دے گی، کہ ہاں بڑا اچھا شہر ہے، وہاں کی آب و ہوا بڑی عمدہ ہے، وہاں کے لوگ بھی بڑے اچھے ہوتے ہیں، جی چاہتا ہے کبھی میں بھی وہاں جاؤں، کرسمس میں یا کسی اور چھٹی کے موقع پر مسٹر ندیم اگر آپ گئے تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی،،

لیکن بیچاری یہ کچھ نہ کہہ سکی، دل کی دل ہی میں رہ گئی، سوال سنتے ہی ندیم صاحب برس پڑے، بڑے تیکھے انداز میں فرمایا،

"مس کیتھرائن آئندہ میرے پاس آنے کی تکلیف نہ کیجئے، اور یاد رکھیے کہ کوئی ایسا سوال جس کا تعلق آپ کی ڈیوٹی سے نہ ہو، میں نہیں سننا چاہتا، یہ وارننگ ہے، پہلی اور آخری اگر آپ نے اس کی خلاف ورزی کی تو مسٹر ایڈورڈ اور مسٹر جانسن بھی اگر آپ کی سفارش کریں گے تو میں اسے رد کر دوں گا، نہیں میں آپ کا بیان صفائی سننا نہیں چاہتا جلیئے تشریف لے جائیے ——— شکریہ!"

وہ منظر جب یاد آتا ہے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں، کیتھرائن جو اپنے آپ کو ملکہ کلوپیٹرا سے کم نہ سمجھتی تھی، اس بری طرح ندیم کے آفس سے نکلنے پر مجبور ہو گئی، بدقسمتی سے میں اپنے کیبن میں بیٹھی ٹائپ کر رہی تھی اور خود بخود یہ ساری باتیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، کیتھرائن کو بہرحال میرے کیبن ہی سے ہو کر جانا تھا کسی طرح مجھ میں یہ جرأت نہ کر سکی کہ کیبن سے جب وہ گزرے تو میری اور اس کی آنکھیں چار ہوں،

جب مسٹر ندیم اس کا شکریہ ادا کر کے الوداع کہہ رہے تھے میں چپکے سے دوسری طرف کھسک گئی، پھر جب وہ چلی گئی، تب واپس آئی،

لیکن میں یہ باتیں کیوں سوچ رہی ہوں ؟

ندیم صاحب رہیں یا جائیں، مجھے اس سے کیا سروکار ؟

مجھے امتحان دینا ہے، کسی دوسرے کے معاملات و مسائل پہ غور کرنے میں اپنا وقت کیوں ضائع کروں ؟

دفعتہً گھڑی نے گیارہ بجائے، اس نے کتاب بند کی اور جمائی لیتی ہوئی بستر پہ لیٹ گئی خدا کرے صبح وقت پہ آنکھ کھل جائے۔

(۱۴)

صبح کو شہلا کی آنکھ دیر سے کھلی، لیکن جلدی جلدی ناشتہ کرکے ٹھیک وقت پر وہ دفتر پہنچ گئی، جاتے ہی روشن خاں سے پوچھا،

"کیا صاحب آ گئے؟"

روشن خاں نے نسوار کی ڈبیا کھولتے ہوئے جواب دیا،

"نہیں آیا ——————"

شہلا کرسی پر بیٹھی اور اپنا ٹائپ رائٹر ٹھیک کرنے لگی، روشن خاں نے نسوار کی چٹکی منہ میں ڈالنے کے بعد پھر شہلا کو مخاطب کیا اور فرمایا،

"صاحب فون پر بولا تھا، دیر سے آئے گا"

شہلا نے ٹائپ شروع کر دیا تھا، کوئی جواب نہیں دیا، روشن خاں اپنا ڈنڈا سنبھالتے ہوئے کیبن سے باہر جا کر اسٹول پر بیٹھ گئے،

کوئی پندرہ منٹ کے بعد شہلا کے کان میں آواز آئی، روشن خاں کسی سے کہہ رہے تھے،

"ہم تم سے بولتا ہے صاحب نہیں آیا"

اس کے جواب میں ایک شیریں آواز شہلا کے کان میں گونجی،

"لیکن صاحب کب آئیں گے؟ وقت تو ہو گیا"

روشن خاں نے جواب دیا،

"ہم نہیں جانتا کب آئے گا، وہ اپنی مرضی کا بادشاہ ہے"

وہی شیریں نسوانی آواز پھر بلند ہوئی،

"تو میں انکا انتظار کروں گی ۔۔۔۔۔ ان کے دفتر میں بیٹھ کر!"

روشن خاں نے فرمایا،

"تم انتظار کر سکتا ہے، شام تک انتظار کرو، ہم منع نہیں کرتا، لیکن صاحب کے دفتر میں نہیں بیٹھنے دے گا"

اسی عورت نے روشن خاں سے پوچھا،

"لیکن جو لوگ تمہارے صاحب سے ملنے آتے ہیں، وہ کہاں بیٹھتے ہیں؟ کیا یہیں کھڑے رہتے ہیں؟"

روشن خاں نے حاضر جوابی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا،

"صاحب ہوتا ہے تو جو ملنے آتا ہے، اسے اپنے کمرے میں بلا لیتا ہے، نہیں ہوتا تو جو ملنے آتا ہے واپس چلا جاتا ہے، تم بھی واپس چلا جاؤ، پھر آنا"

اب شہلا ضبط نہ کر سکی، وہ جلدی سے اٹھی اور کیبن سے باہر آئی، اس نے دیکھا روشن خاں ہر قسم کے جذبات سے عاری فیصلہ کن موڈ میں اپنا ڈنڈا سنبھالے کھڑے ہوئے ہیں، اور ان کے سامنے ایک نہایت خوب صورت اور سحر طراز عورت حیران و مضطرب کھڑی سوچ رہی ہے کہ اس وحشی سے کس طرح نپٹے، صورت دیکھتے ہی شہلا نے پہچان لیا، یہ کوئی پارسی خاتون ہے اور ظاہر ہے اس کا نام مس دارو والا ہی ہو سکتا ہے اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا،

"آپ میرے کیبن میں تشریف لے آیئے"

مس دارو والا نے برہم نظروں سے روشن خاں کو دیکھا اور شہلا کے کیبن میں آگئی

شہلا نے پوچھا،

"کیا میں آپ کا نام دریافت کر سکتی ہوں؟"

مشکوک اور مشتبہ نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی بولی،

"مجھے مس دارو والا کہتے ہیں"

"کیا آپ مسٹر ندیم سے ملنا چاہتی ہیں"

"جی ہاں مجھے انھیں سے ملنا ہے"

"کتنا اچھا ہوتا اگر آپ نے اپائنٹمنٹ کر لیا ہوتا، خواہ مخواہ زحمت اٹھانی پڑی آپ کو، وہ تو یہاں ہیں"

"یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ وہ نہیں ہیں، لیکن بہرحال آئیں گے"

"جی ہاں آنا تو چاہیے، کیوں نہ آئیں گے؟"

"تو کیا آپ مجھے اجازت دیں گی کہ ان کے آنے تک میں یہاں بیٹھی انتظار کرتی رہوں؟"

شہلا نے سوچا میرا کیا حرج ہے؟ اگر یہ عورت ندیم صاحب کے انتظار میں بیٹھنا چاہتی ہے، بیٹھے، لیکن معاً اسے وہ باتیں یاد آگئیں جو کل ندیم نے مس دارو والا کے بارے میں انتہائی برہمی اور اشتعال کے عالم میں کہی تھیں، اس نے سوچا کہیں اس عورت کے ساتھ اخلاق کا برتاؤ میرے لیے وبال جان نہ بن جائے، ندیم صاحب اگر پوچھ بیٹھے، تمہیں کیا حق تھا اس عورت کو اپنے پاس بٹھانے کا، تو میں کیا جواب دوں گی؟، نہیں، اتنی بڑی ذمہ داری میں اپنے سر نہیں لے سکتی، یہ سوچ کر اس نے کہا،

"مس دارو والا، آپ جیسی سحر طراز خاتون سے مل کر کیا کہوں مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے، جی چاہتا ہے آپ یونہی بیٹھی رہیں اور میں آپ کا دیدۂ زیبا تکتی رہوں، لیکن ـــــــــ!"

شہلا کی زبان سے اپنے حسن اور رعنائی کی تعریف سن کر مس دارو والا نے پندار کو

بڑی لیکن پہنچی تھی،" اس نے سوچا تھا، ایک خوبصورت عورت ہو غالباً مسٹر ندیم کی پرائیویٹ سیکرٹری بھی ہے، مجھ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، تو ندیم بہرحال مرد ہے، وہ کہاں تک بھاگے گا، اور کب تک اسیر دام نہ ہوگا؟" شہلا کی ان باتوں کو فال نیک سمجھ کر بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا، مگر "لیکن" کا لفظ سن کر اس کی نخوت ابھر آئی اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا،

"میں سننا چاہتی ہوں، لیکن کے بعد آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

شہلا نے اور زیادہ نرمی اور ملاطفت کے ساتھ کہا،

"لیکن یہ ایک تجارتی کمپنی ہے، یہاں ضابطوں اور قاعدوں کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی ہے، آپ دیکھ رہی ہیں میں ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھی ہوں، دفتر کے ضروری اور عام کاغذات خطوط ڈاکومنٹ مجھے ٹائپ کرنا ہیں، جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے یقین ہے آپ کسی کاغذ پر چھپتی نظر بھی نہیں ڈالیں گی، نہ یہاں کے خط و کتابت سے آپ کو کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے، لیکن ہر تھوڑی دیر کے بعد، ہماری کمپنی کے ریذیڈنٹ ڈائرکٹر مسٹر جانسن گشت کرتے ہیں، انھوں نے اگر آپ کو میرے پاس بیٹھے دیکھ لیا تو آپ کا کچھ نہ بگڑے گا، میری شامت آجائے گی، میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے، بوڑھی ماں، چھوٹی بہن، ننھا سا بھائی، ان سب کی کفالت میرے ذمہ ہے، اور اپنے تعلیمی مصارف بھی، اگر مجھے یہاں سے رخصت کر دیا گیا تو آپ ہی سوچئے، مجھ غریب کا کیا حشر ہوگا؟ ——— پھر بھی اگر آپ بیٹھنا چاہیں تو شوق سے بیٹھیے جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا۔"

ان الفاظ نے مس دارہ والا پر اثر کیا، چہرہ کی خشونت کم ہو گئی، اس نے کہا،

"نہیں، میں اپنی وجہ سے آپ کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتی، ایک گھنٹہ کے

بعد پھر آجاؤں گی"

شہلا نے بڑی گرمجوشی سے ان خیالات کا خیر مقدم کیا، اس نے کہا،

"گو میں نادم ہوں کہ آپ کو اپنے پاس نہ بٹھا سکی لیکن مشکور بھی ہوں کہ آپ نے میری مجبوریوں کو محسوس کر لیا، گھنٹہ بھر کے بعد شوق سے تشریف لایئے، یقیناً اس وقت تک ندیم صاحب آجائیں گے، نہ جانے کیا بات ہے جو آج اب تک نہیں آئے"

یہ بات شہلا عمداً گول کر گئی کہ ندیم صاحب کا فون آچکا ہے کہ وہ آج ذرا دیر سے آئیں گے، وہ کوئی ایسی بات اس عورت کے علم میں لانا نہیں چاہتی تھی جو ندیم کے سامنے اس کے منہ سے نکل جائے اور ایک نئی آفت کا پیش خیمہ ثابت ہو،

شہلا کے الفاظ نے وہی اثر کیا جس کی اس کو توقع تھی، مس دارو والا نے کہا،

"اب میں جاتی ہوں، تھوڑی دیر کے بعد پھر آؤں گی، لیکن کیا آپ میرا ایک کام کر دیں گی؟"

باتیں وہ شہلا سے کر رہی تھی اور نظر دروازہ پر لگی ہوئی تھی کہ شاید اس اثنا میں وہ یوسف گم گشتہ آہی جائے،

شہلا کو یہ کیفیت دیکھ کر ترس آیا، اور ایک طرح کی ہمدردی سی پیدا ہو گئی، لیکن مجبور تھی ہمدردی کے سوا اور اس کے بس میں کیا تھا، بڑے خلوص سے وہ گویا ہوئی،

"ضرور، ضرور، اگر آپ کا کوئی کام میں کر سکوں تو بڑی خوشی ہوگی مجھے، فرمائیے کیا حکم ہے"

شہلا کے ان مخلصانہ الفاظ سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، اس نے کچھ رکتے رکتے کہا،

"صرف یہ تکلیف دینا چاہتی ہوں کہ جب مسٹر ندیم آئیں تو انھیں بتا دیجیے گا، میں آئی تھی، اور تاکید کر دیجیے گا کہ میرا انتظار کریں"

شہلا ہنسنے لگی، اس نے کہا،

"کیا میرا یہ کہہ دینا کافی نہیں ہوگا کہ آپ آئی تھیں ——— کیا اس کے بعد تاکید کی ضرورت بھی ہے؟ نہیں مس دارو والا آپ کے حسن بے جمال کی توہین کا ارتکاب مجھ سے نہیں

ہو سکتا، مسٹر ندیم کو یہ مزید بتا دوں گی کہ آپ آئی تھیں، اور تھوڑی دیر کے بعد پھر آئیں گی، لیکن یہ تاکید ہرگز نہیں کروں گی کہ وہ آپ کا انتظار کریں، کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کی اطلاع پانے کے بعد وہ انتظار کیے بغیر رہ سکیں؟ میرا خیال تو یہ ہے کسی مصروفیت کے باعث اگر آپ تھوڑی دیر کے بعد نہ آسکیں اور رات کو دس بجے بھی آپ یہاں پہنچیں، تو مسٹر ندیم آپ کے انتظار میں اختر شماری کر رہے ہوں گے"

مس دارو والا نے پیار بھرے انداز میں ایک ہلکی سی چپت شہلا کے گال پہ لگائی اور ہنستی ہوئی بولی،

"کیا اس کمرہ کی چھت کے نیچے بیٹھ کر بھی مسٹر ندیم اختر شماری کر سکتے ہیں؟ کیا اس چھت میں کوئی ایسا روزن ہے جس سے جگمگاتے ہوئے ستارے نظر آتے ہیں؟ —

— نا ممکن"

شہلا بھی ہنسنے لگی! اس نے کہا،

"ارے واقعی، چھت کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا، معاف کیجیے گا غلطی ہوئی، اچھا میں اپنے الفاظ بدل کر یوں کہتی ہوں، اس کمرہ میں بیٹھ کر مسٹر ندیم آپ کے انتظار میں خواہش کے باوجود اختر شماری کرنے سے مجبور ہوں گے لیکن ان کے نالہ و شیون کی آوازیں آپ بغیر جھیل اسے سن لیں گی، ——— کیا اب بھی کوئی اعتراض ہے آپ کو؟"

"جی نہیں بالکل نہیں"

اور پھر وہ، ہنستی ہوئی چلی گئی، ٭

سوز و ساز

•

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

•

(1)

دفتر بند ہونے سے کوئی پانچ منٹ پہلے ندیم آیا، شہلا جانے کی تیاری کر رہی تھی، اسے دیکھ کر اس نے کاغذات سنبھالے اور دستخط کرانے کے لیے اندر پہنچی، ندیم کرسی پہ کچھ عجیب بے کلی کے انداز میں بیٹھا تھا، بال الجھے ہوئے، چہرہ مضمحل، سوٹ پہ استری تک نہیں، کوٹ کرسی کے پیچھے ٹانگ رکھا تھا، پنکھا تیزی سے چل رہا تھا اور وہ پسینہ میں شرابور بیٹھا ہوا لکھ رہا تھا۔ شہلا نے کاغذات کا ڈھیر اس کے سامنے رکھ دیا اور کھڑی ہو گئی، ندیم نے کاغذات کی طرف توجہ نہ کی اور شہلا سے کہا،

"بیٹھ جائیے"

وہ بیٹھ گئی، ندیم نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا،

"کہیے کوئی نئی خبر؟"

شہلا چپ رہی پھر اس نے کہا،

"وہ آئی تھیں، مس دارو والا! کئی پھیرے کر چکی ہیں!"

ندیم کے چہرہ پر حیرت، اضطراب اور برہمی کے آثار پیدا ہوئے، اس نے پیشانی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا،

"وہ یہاں بھی آئی تھی؟"

شہلا نے اپنے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار کیے بغیر جواب دیا،

"جی ہاں! کئی مرتبہ آ چکی ہیں، ان سے اور روشن خاں سے اچھی خاصی کھٹ پٹ بھی ہو گئی۔"

ندیم نے چونکتے ہوئے سوال کیا،

"کیا مطلب؟ روشن خاں سے کھٹ پٹ؟ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

شہلا نے بہت ٹھنڈے اور سنجیدہ دل سے جواب دیا،

"بات یہ ہے کہ وہ اندر آپ کے کمرہ میں بیٹھ کر انتظار کرنا چاہتی تھیں ——————"

ندیم پوری بات نہ سن سکا اعتراضی لہجہ میں اس نے کہا،

"لاحول ولا قوۃ، یا میرے کمرہ میں بیٹھ کر انتظار کرنے کیا معنی؟ غالباً روشن خاں نے انکار کیا ہوگا اور آپ نے ازراہ اخلاق اجازت دے دی ہوگی، حالانکہ آپ جانتی ہیں، یہ باتیں میں قطعاً پسند نہیں کرتا"

شہلا نے اور زیادہ نرم لہجہ میں کہا،

"آپ تو پہلے سے ایک رائے قائم کر لیتے ہیں، مجھے کیا حق تھا کہ آپ کے اصول، عادت اور مزاج کو جانتے ہوئے اتنا بڑا خطرہ مول لوں کہ کسی اجنبی کو یہاں لا کر بٹھا دوں، یقین کیجئے نہ روشن خاں نے اجازت دی، نہ میں نے، البتہ چونکہ روشن خاں اکھڑ آدمی ہے اس لیے ذرا دیر میں نے کیبن میں بٹھا کر اخلاق و مروت کی باتیں کیں، معذرت چاہی اور رخصت کر دیا"

ندیم نے کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا،

"مس شہلا مجھے معاف کر دیجئے۔ نہ جانے کیا بات ہے، آپ کی اتنی عزت کرنے کے باوجود بلا ارادہ کبھی آپ سے الجھ پڑتا ہوں، کبھی سخت سست کہہ دیتا ہوں اور بعد میں شرمندہ ہوتا ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ بہر حال آپ عورت ہیں، اس لیے وہ کمزوریاں بھی آپ میں ہوں گی، جن کے باعث اس

جس سے مجھے ایک بیر سا ہو گیا ہے "

شہلا نے کوئی جواب نہیں دیا، ندیم نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

" آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا، یا تو کہیے کہ میری اس بیہودگی کو آپ نے معاف کر دیا، یا کہہ دیجیے کہ نہیں کیا، میں ہرگز دوبارہ معافی نہیں مانگوں گا "

شہلا نے ندیم کے چہرے پر پھر وہی آشفتگی دیکھی جو اسے جنون کے درجے تک پہنچا دیا کرتی تھی، اس نے کہا،

" آپ نے ایک مرتبہ بھی معافی کیوں مانگی، نہ میں نے مطالبہ کیا تھا، نہ اس کی ضرورت تھی "

ندیم کو جیسے ایک نیا موضوعِ گفتگو ہاتھ آ گیا، اس نے سوال کیا،

" آپ نے مطالبہ کیوں نہیں کیا؟ ضرورت کیوں نہیں تھی؟ "

شہلا نے کچھ سوچتے ہوئے رک رک کر کہا،

" مطالبہ اس لیے نہیں کیا کہ آپ افسر ہیں ماتحت، اور ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ آپ دفعتہً برہم ہوتے ہیں اور فوراً ہی خوش ہو جاتے ہیں۔ آپ کی برہمی کی میں عادی ہو چکی ہوں، جس طرح اس دفتر میں کچھ فرائض میرے ذمہ عائد ہوتے ہیں اور حتی الامکان دیانت داری کے ساتھ انھیں انجام دینے کی کوشش کرتی ہوں، اسی طرح ایک فریضہ میرا یہ بھی کہ آپ جب بیجا ہیں برہم ہوں اور میں اسے خاموشی کے ساتھ برداشت کر لوں، رہی آپ کی خوشی تو وہ اتنی مختصر اور گریزپا ہوتی ہے کہ اس سے میرے اس فریضہ کی بجاآوری میں کوئی تخفیف نہیں ہوتی، اور اگر ہوتی بھی ہے تو بالکل ناقابلِ لحاظ! "

جب تک شہلا یہ باتیں کرتی رہی، ندیم اسے غور سے دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا۔

" انسان کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ وہ خود اپنی نظر میں ذلیل ہو جائے اور

مس شہلا مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ یہ سزا آپ کئی مرتبہ مجھے دے چکی ہیں۔ اس وقت بھی میرا جی چاہ رہا ہے، اپنا سر نوچ لوں، یہ جوتے اتار دوں اور اپنا سر لہولہان کر لوں ان سے، میں ایسا محسوس کرتا ہوں، آپ میں وہ گمبھیر سکون ہے جو کسی بڑے درخت کے سائے میں کسی تھکے ہوئے مسافر کو ہوتا ہے، آپ میں وہ صبر ہے جو چنگیز اور ہلاکو کے دل میں بھی انسانیت کی عظمت پیدا کر سکتا ہے، آپ اس چاندنی کی طرح ہیں، جس میں ٹھنڈک ہوتی ہے، فرحت ہوتی ہے، لطافت ہوتی ہے، لیکن مس شہلا آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ میرے یہ الفاظ اظہارِ عشق کی تمہید ہیں، قطعاً نہیں، میں آپ سے محبت نہیں کرتا، میں کسی سے محبت نہیں کرتا، میں محبت کر ہی نہیں سکتا، یہ الفاظ ایک مرد ایک عورت سے نہیں کہہ رہا ہے، ایک دوست دوست سے کہہ رہا ہے، کیا آپ میرا مطلب سمجھ گئیں؟"

شہلا نے ندیم کی اس تقریر کے جواب میں اپنے مخصوص انداز اور مخصوص لب و لہجہ میں کہا،

"سمجھ گئی ——————— آپ نہ کہتے تو بھی میرا خیال یہی تھا، لیکن میری یہ درخواست ضرور ہے کہ بار بار یہ الفاظ نہ دہرایا کیجئے، ان سے میری خودی اور خودداری مجروح ہوتی ہے، جو آپ کی پوزیشن ہے وہی میری ہے، جس نظر سے آپ عورت کو دیکھتے ہیں، اسی نظر سے میں مرد کو دیکھتی ہوں، لیکن شاید اتنے پرجوش اور پرخروش انداز میں اپنے تاثرات اور محسوسات آپ کے سامنے میں نے کبھی ظاہر نہیں کیے، معاف کیجئے گا شاید آپ کو غلط فہمی ہے کہ خدا نے صرف اس لیے آپ کو پیدا کیا ہے کہ عورتیں آپ کو چاہیں اور جان دیں، اور اس غلط فہمی کے اسباب مس دارو والا جیسی عورتوں نے پیدا بھی کر دیے ہیں، لیکن جس طرح ہر مرد ندیم نہیں ہوتا، اسی طرح ہر عورت مس دارو والا بھی نہیں ہوتی، میں آپ کو ایک انسان کی حیثیت سے دیکھتی ہوں اس سے زیادہ اور اس سے آگے نہ کبھی میں نے سوچا ہے نہ سوچوں گی، سوچنے اور غور کرنے کے لیے خود

میرے ذاتی مشکلات و مسائل کیا کم ہیں کہ میں ایک نیا دردِ دل پر پیدا کر لوں ، ندیم صاحب !
میری طرف سے آپ بالکل بے فکر رہیے، خدانخواستہ آپ لنگڑے لُنجے ، لولے
اندھے اور بہرے ہو جائیں تو بھی میں آپ سے نفرت نہیں کروں گی، اور اگر فضلِ ربی سے
آپ کی رعنائی اور زیبائی آپکو یوسفِ ثانی بنا دے تو بھی محبت نہیں کروں گی، ایک انسان
کی حیثیت سے میرے دل میں آپ کی جو جگہ ہے وہ مجھے ہر وقت آپ کی ہر خدمت پر
آمادہ رکھے گی اور ایک مرد کی حیثیت سے میں سوا اس کے کہ نہایت حقارت کے ساتھ آپ
کو ٹھکرا دوں اور کچھ نہیں کر سکتی، میں نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ ہر روز بلکہ دن میں کئی
کئی مرتبہ جو وسوسے آپ کے دل میں میرے متعلق پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان کا خاتمہ ہو
جائے، شاید میری یہ گفتگو کسی درجہ میں آپ کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوئی ہو، اس کی
معافی چاہتی ہوں، یہ بھی ہو سکتا ہے، جوشِ کلام میں کوئی ایسا لفظ میرے منہ سے
نکل گیا ہو، جو آپ کی شان کے خلاف ہو، اس کے لیے بھی معذرت کرنے میں مجھے کوئی
تامل نہیں، ایک بات اور عرض کر دوں، اس سلسلہ میں کم از کم میں آئندہ کچھ نہیں کہوں
گی اور اگر آپ نے کہا، استعفا دے دوں گی، مجھے نہیں معلوم کہ آپ خدا کے قائل ہیں
یا نہیں، لیکن میرا سر اس کے سامنے دن میں پانچ مرتبہ جھکتا ہے، میں اس پر ایمان
رکھتی ہوں، مجھے یقین ہے، استعفا دینے کے بعد خدا میرے رزق کا کوئی اور سامان پیدا
کر دے گا، لیکن آپ اس کے عذاب سے نہیں بچ سکیں گے ۔"

شہلا کی تقریر انتہائی محویت اور استغراق کے عالم میں ندیم سن رہا تھا، اس دوران
میں اس کا ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا، کئی منٹ تک وہ خاموش بیٹھا رہا،
پھر اس نے کہا!

"مس شہلا میں آپ کی صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں، آپ نے جو کچھ کہا، اس کا ایک
ایک لفظ میرے دل پر نقش ہو گیا ہے، اطمینان رکھیے آئندہ انشاء اللہ آپ کی خودی

اور خودداری کو میری طرف سے کوئی ٹھیس نہیں پہنچے گی، ——— مجھے امید ہے کہ اس تلخ تقریر کے باوجود جو آپ نے کی ہے ہمارے درمیان بے لوث دوستی کا جو پیمان استوار ہو چکا ہے وہ قائم رہے گا ۔"

شہلا نے بغیر کسی تامل کے کہا،

" اپنی طرف سے تو میں یقین دلا سکتی ہوں، لیکن اپنے بارے میں آپ خود ہی کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں"

ندیم نے کہا،

"میں آپ سے یہی سننا چاہتا تھا، میرے دل کا بوجھ اتر گیا ——— اگلی باتیں بھول کر ذرا مجھے دوستانہ مشورہ تو دیجئے، اس اللّٰہ کی بھیجی مس درروالا سے کس طرح اپنا پیچھا چھڑا دوں ! ہاں ایک بات تو میں نے آپ کو بتائی ہی نہیں، کچھ ایسی باتیں چھڑ گئیں کہ جو بات خاص طور پر آپ سے کہنے آیا تھا، وہ نہ کہہ سکا ——— میں نے ہوٹل چھوڑ دیا ہے"

شہلا نے چونکتے ہوئے پوچھا،

" آپ نے ہوٹل چھوڑ دیا؟ کیوں ؟"

"محض اس عورت کے تعاقب کی وجہ سے ۔ وہاں بھی پہنچ گئی ۔"

تو پھر اب کہاں قیام ہے آپ کا ؟"

تو اب مجبوراً ہوٹل میں پناہ لی ہے !"

شہلا ہنسنے لگی ۔ اس نے کہا،

" ایسا معلوم ہوتا ہے ہاتھ دھو کر یہ عورت آپ کے پیچھے پڑ گئی ہے"

" وہ تو ٹھیک ہے، مگر اب سوال یہ ہے کہ دفتر تو نہیں چھوڑ سکتا ، یہاں اگر

آئی تو کیا کروں گا "

"(مسکراتے ہوئے) مل لینے میں ہرج کیا ہے؟ مل لیجیے گا!"

" نہیں مس شہلا، یہ مناسب نہیں ہے"

"میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ اس سے خائف کیوں ہیں اتنے، جس طرح محض خیالی اندیشوں کے ماتحت آپ مجھے بار بار جھنجھوڑ چکے ہیں، اسے کیوں نہیں صاف اور سخت الفاظ میں منع کر دیتے کہ نہ ملا کرے آپ سے"

" دیکھیے اپنا ذکر کر کے آپ نے پھر مجھے شرمندہ کر دیا"

"میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں، لیکن میرے سوال کا جواب دیجیے "

"آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ عورت شہر کے اونچے طبقوں میں رسائی رکھتی ہے، غنی سیٹھ سے اس کے بڑے گہرے مراسم ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ غنی سیٹھ ہی کے بل پر ہماری کمپنی قائم ہے، اس کو دھتکار دینے کے معنی یہ ہیں کہ کمپنی اور غنی سیٹھ کے درمیان تعصب پیدا ہو جائے گی، اور اسی وجہ سے میں کمپنی کو نقصان پہنچانا پسند نہیں کرتا "

" یہ مشکل تو واقعی بہت ٹیڑھی ہے، ایک بات میں اور آپ کو بتاؤں جو شاید ابھی آپ کے علم میں نہیں آئی ہے۔"

" وہ ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے، ضرور بتائیے! "

"غنی سیٹھ کمپنی کے چالیس فیصد حصے خریدنے پر آمادہ ہو چکے ہیں، آج ہی کیتھرائن کہہ رہی تھی کہ اس مسئلہ پر مسٹر جانسن سے اور ان سے فون پر بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی، غالباً مسٹر جانسن چاہتے یہ ہیں کہ غنی سیٹھ یہ حصے خرید لیں تو وہ مستقل طور انگلستان واپس چلے جائیں اور اس روپے سے جو انھیں ملے گا کوئی نیا کاروبار وطن میں شروع کریں اور وہ ایسا کر سکتے ہیں! اس لیے کہ کیتھرائن کہہ رہی تھی کہ وہ پندرہ فیصد حصے رکھتے ہیں "

ندیم کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر اس نے کہا،

"یہ ایک اور نئی مشکل پیدا ہو گئی، اس کے معنی یہ ہیں کہ جانسن کے جانے کے بعد غنی سیٹھ ریذیڈنٹ ڈائرکٹر ہو جائیں گے، اور پھر وہ جب چاہے میرے کمرہ میں آ سکتی ہے، میں اس کی پذیرائی پر مجبور ہوں گا، مجھے اس سے اخلاق برتنا پڑے گا، مجھے اس کے سامنے جھکنا پڑے گا، ———— لیکن نہیں مس شہلا! میں ایسا نہیں ہونے دونگا، اگر کمپنی کے حصے بکے، جانسن یہاں سے گیا، غنی سیٹھ اس کی جگہ آئے تو میں قطعاً استعفا دے دوں گا"

"آپ استعفا دے دیں گے؟ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے"

"مس شہلا یہی ہو گا!"

(۲)

دوسرے روز وقت مقررہ پر شہلا بھی آگئی اور ندیم بھی، شہلا نے ٹائپ رائٹر سنبھالا اور کل کا بچا ہوا کام ختم کرنے لگی، اتنے میں روشن خاں کی آواز اس کے کان میں آئی،

"اپنا نام بتاؤ! ہم صاحب کو بولے گا، "

دوسری آواز جو پردہ گوش سے ٹکرائی، یہ تھی،

"یہ کارڈ لے جا کر انھیں دے دو "

شہلا نے آواز سے پہچان لیا، آنے والا کون ہے، وہ دروازہ پر پہنچی، اس نے مس دارو والا کو لا کر اپنے کمرہ میں بٹھایا اور اس کا کارڈ لے کر ندیم کے پاس پہنچی اور نہایت خاموشی کے ساتھ وہ کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا، ندیم نے کارڈ پر ایک نظر ڈالی اور تلخ لہجہ میں کہا،

" بھیج دیجیے!"

ذرا دیر میں مس دارو والا تمام حربوں سے مسلح تشریف لائیں، آتے ہی نہایت بے تکلفی کے ساتھ فرمایا،

"ہیلو! مسٹر ندیم، کل آپ کہاں غائب تھے؟ میں کئی مرتبہ آئی، ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا، صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے، شکر ہے آج ملاقات ہو گئی،"

ندیم نے سرد مہری کے ساتھ کہا،

"تشریف رکھئے ——— کوئی ضروری کام البادر پیش آگیا تھا کہ نہ آسکا، بڑی زحمت ہوئی آپ کو"

"دو مرتبہ جب یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ نہیں آئے تو مجھے تشویش پیدا ہوئی کہ کہیں مزاج ناساز تو نہیں ہے، ہوٹل پہنچی، وہاں پتہ چلا کہ آپ کہیں اور منتقل ہو گئے ہیں"

"جی ہاں! وہ ہوٹل میرے لیے کچھ تکلیف دہ سا ہو گیا تھا، عافیت اسی میں نظر آئی کہ اسے چھوڑ دوں، یہ معلوم کر کے مجھے اور تکلیف ہوئی کہ آپ وہاں بھی گئیں تھیں۔ شاید کوئی ضروری کام ہوگا کہ اتنے چکر کاٹنا پڑے آپ کو، فرمایئے کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی؟"

ایک قہقہہ لگاتی ہوئی وہ بولی،

کوئی خاص کام تو نہ تھا، لیکن تھا بھی، آپ سے ملنا کیا خاص کام نہیں ہے؟ صرف ملنے آئی تھی۔

ندیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے، کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر کہنے لگا،

"بدقسمتی سے آج بھی میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں، اگر دس منٹ دیر کر کے آپ پہنچتیں تو ملاقات نہ ہوتی"

یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، اور اس طرح لباس ٹھیک کرنے لگا کہ گویا اب جایا ہی چاہتا ہے، وہ بھی کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔

"آپ کدھر جائیں گے؟"

اس سیدھے سادے سوال پر ندیم کو پھر چکر آ گیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کہے؟، لیکن بہرحال بات بنانی تھی، کہنے لگا۔

"ارے صاحب! ہم جیسے جہاں گردوں کے بارے میں آپ یہ کیا پوچھتی ہیں کہ

کہاں جانا ہے؟ نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننا ہے، یہ کاروباری دنیا بھی عجیب ہوتی ہے، آپ تو غالباً گھر تشریف لے جائیں گی۔"

"سوچ رہی ہوں گھر جاؤں یا غنی سیٹھ کے پاس! یا کسی سہیلی کے ہاں، بہرحال اس وقت تک وقت گزاری کرنی ہے جب تک آپ واپس نہ آجائیں، کب تک آجائیں گے آپ؟ میں ٹھیک اسی وقت پہنچ جاؤں گی۔"

ایک مرتبہ پھر ندیم مخمصے میں پڑ گیا، کچھ سوچا پھر کہا

"یہ کہنا مشکل ہے کہ کب تک واپس آؤں گا، ممکن ہے پندرہ منٹ میں آجاؤں، ممکن ہے ایک گھنٹہ میں، ہوسکتا ہے اتنی کا وقت گزر جائے اور نہ پہنچ سکوں؟"

ان باتوں سے وہ ذرا بھی بددل نہ ہوئی رکھنے لگی،

"تو پھر آپکے ساتھ کیوں نہ چلوں، آپکو جہاں جہاں جانا ہے جائیے گا، میں کار میں بیٹھی رہونگی پھر ساتھ ساتھ لوٹینگے"

غصے کے مارے ندیم کا یہ حال تھا کہ اگر اسکا بس چلتا تو اس عورت کا گلا گھونٹ دیتا، لیکن وہ مجبور تھا کہنے لگا،

"نہیں یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا، آپ کہاں کہاں جائینگی کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اگر ملاقات ضروری ہے تو پھر کسی دن سہی"

نہایت آزادگی کے ساتھ اس نے کہا،

"ہاں کیوں نہیں ہو سکتا، ایسا کیجیے شام کو کلب ہی میں ———"

ندیم نے قطع کلام کرتے ہوئے بتایا۔

"لیکن کلب کی ممبری سے تو بعض وجوہ کے باعث میں استعفا دے چکا ہوں، وہاں تو ہماری ملاقات نہیں ہو سکتی"

"تو ایسا کیجیے کہ شام کو آٹھ بجے میٹرو پول میں پہنچ جائیے، میں وہاں موجود ملوں گی ڈنر بھی وہیں رہے گا اور فرانس کے رقاصوں کا جو طائفہ آیا ہے اس کی فن کاری سے بھی ذرا لطف اٹھائیں گے"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ مجھے دنیا میں کسی چیز سے اتنی نفرت نہیں ہے جتنی رقص

سے، ذرا غور تو کیجئے، رقص کرتے ہوئے خواہ وہ کوئی مرد ہو یا عورت کیسی مضحکہ خیز حرکتیں اسے کرنا پڑتی ہیں"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، پھر بولی،

"مسٹر ندیم واقعہ یہ ہے کہ آپ کی شخصیت بالکل منفرد ہے، ہر معاملہ میں آپ کا ذوق، آپ کا مزاج بالکل جدا ہے، اور آپ کی یہی ادا مجھے پسند ہے ——— اچھا یوں کیجئے، میرے گھر آجایئے، وہاں بڑی پر سکون فضا ملے گی آپ کو!"

آپ کے گھر پر؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے"

"کیوں؟، یہ ناممکن کیوں ہے؟"

"ناممکن اس لیے ہے کہ میں صرف اس صورت میں کسی کے گھر جا سکتا ہوں کہ اسے بھی اپنے گھر بلا سکوں، ہوٹل میں اگر قیام ہوتا تو بڑے شوق سے میزبانی کے فرائض پہلے ادا کرتا، پھر مہمان بن کر آپ کے ہاں آتا، لیکن اب میں ایک دوست کے ہاں منتقل ہو گیا ہوں، اور وہاں اس طرح کا انتظام ممکن نہیں ہے"

کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر اس نے پوچھا،

"رقص سے آپ کو نفرت ہے، میرے گھر پر آپ نہیں آسکتے، اپنے ہاں مجھے نہیں بلا سکتے، پھر آخر صورت کیا ہے ملاقات کی؟، کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے، اس میں توہین ہے آپ کی؟"

ندیم نے بے تکلفانہ جواب دیا،

"اتنا احمق بھی نہیں ہوں کہ عزت افزائی کو توہین سمجھوں، جب تک کسی مکان یا ہوٹل کا بندوبست نہیں ہو جاتا، آپ جب چاہیں یہاں دفتر میں تشریف لا سکتی ہیں"

وہ خوش ہو گئی، اس نے کہا،

"میں کل دو بجے آؤں گی، کیا آپ ملیں گے ؟"

ندیم نے جواب دیا،

"شوق سے آیئے ضرور ملوں گا" ؟

---

(۳)

وقت کی پابندی شہلا جیسی فرض شناس لڑکی سے بھی اتنی کبھی نہ بن آئی ہوگی، جتنی
مس دارو والا نے اس سلسلہ میں چستی دکھائی، گھڑی نے ادھر ٹن سے دو بجائے کہ ان کا
چہرہ زیبا نمودار ہوا، شہلا نے گرم جوشی اور تپاک کے ساتھ استقبال کیا، اور اسے
بٹھا کر ندیم کو اطلاع دینے چلی گئی، ذرا دیر میں واپس آئی اور خندہ جبینی کے ساتھ گردن
خم کرکے کہا،

"تشریف لے جایئے، شاید وہ آپ کا انتظار ہی کر رہے تھے،،
وہ مسکراتی ہوئی اٹھی اور ایک ادائے جانستاں سے ناگن کی طرح لہراتی ندیم کے
کمرہ میں داخل ہوگئی، ندیم نے اسے دیکھتے ہی کہا،
"آیئے! آپ تو قابل رشک حد تک وقت کی پابند ہیں"
شوخ نظروں سے ندیم کی طرف دیکھتی ہوئی وہ کہنے لگی،
"صرف آپ کی حد تک!"
اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی، اس کے بعد ذرا سنجیدہ چہرہ بنا کر گویا
ہوئی،

"مسٹر ندیم! میں دیکھتی ہوں آپ کی زندگی بالکل بے کیف اور بے رنگ ہے،
حالانکہ آپ جیسا آدمی اگر چاہے تو نہ جانے کتنوں سے اپنی پرستش کرا سکتا ہے،

نہ فلم اور تھیٹر سے آپ کو دلچسپی ہے، نہ کلب میں آپ کوئی جاذبیت محسوس کرتے ہیں، نہ کسی کو اپنے ہاں بلاتے ہیں، نہ کسی کے ہاں جاتے ہیں، گھر سے نکلے دفتر، دفتر سے اُٹھے گھر، یہ کیا زندگی ہے؟"

ندیم نے سگرٹ کا ایک لمبا سا کش لگاتے ہوئے کہا،

"ہر شخص کی زندگی کا سانچہ کچھ الگ سا ہوتا ہے، اور وہ اس سے خوش اور مطمئن بھی رہتا ہے، میری یہ بے کیف اور بے رنگ زندگی جسے دیکھ کر آپ اور میرے کئی دوسرے دوست گھبرا اٹھتے ہیں، مجھے بہت پسند ہے"

وہ ہنسنے لگی، پھر گویا ہوئی،

"میں سمجھ گئی، کیا راز ہے آپ کی اس زندگی کا"

اب ندیم کی باری تھی اس نے بھی ایک قہقہہ لگایا،

"راز؟، کیا میری زندگی کا کوئی ایسا راز بھی ہو سکتا ہے جو آپ کے علم میں آ گیا ہو،؟"

وہ ایک ادائے دلنواز کے ساتھ بولی،

"جی ہاں! کیوں نہیں ——— وہ راز یہ ہے کہ شاید اب تک آپ کی زندگی میں کوئی عورت داخل نہیں ہوئی، مسٹر ندیم قدرت نے مرد اور عورت کو بے مقصد اور بے نتیجہ نہیں پیدا کیا ہے، وہ اگر چاہتی تو اس دنیا میں صرف مرد ہی مرد ہوتے، یا عورتیں ہی عورتیں ہوتیں، لیکن کم و بیش مساوی تعداد میں یہ جنسیں پیدا کر کے وہ یہ بتانا چاہتی ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے وابستہ رہیں، محبت کریں، کیف و نشاط حاصل کریں، زندگی کی صعوبتوں اور مشکلوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں، آلام و افکار کی تاریکی میں نور کی روشنی بن کر عورت نمودار ہو اور مرد کی تسکین اور دل جوئی کرے، اس کا دل بڑھائے، اس میں ہمت اور ولولہ پیدا کرے اور ان نعمتوں

سے بہرہ ور ہونے کے بعد کارنامۂ حیات میں مرد کود پڑے اور وہ کچھ کر دکھلائے جو اس کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، آپ کی یہ خاموشی، یہ تنہائی اعلان جنگ ہے قدرت کے خلاف، اس کے مقاصد کے خلاف، میں نہایت خاموشی سے جیسے ایک چور چوری کرنے سے پہلے کسی گھر کا جائزہ لیتا ہے میں آپکا گہرا مطالعہ کر رہی ہوں اور اس نظریہ پر پہنچی ہوں کہ گو ہر اعتبار سے آپ کی زندگی کامیاب ہے، لیکن اس میں ایک ایسا خلا ہے جس نے آپ کی زندگی کو ویران بنا دیا ہے، میں اس خلا کو پر کر سکتی ہوں، آیئے مسٹر ندیم اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیجئے ہم دونوں کی محبت ایک نئی دنیا پیدا کرے گی، جس میں غم جھانک نہ سکے گا، جہاں فکر کی رسائی نہ ہوگی، جہاں کوئی اندیشہ نہ ہوگا، جہاں مسرت ہوگی اطمینان ہوگا، سکون ہوگا، یہ دنیا ایک مثالی دنیا ہوگی، دوسرے لوگ ہم پر رشک کریں گے، خوش قسمتی سے قدرت نے مجھے اور آپ دونوں کو اپنی مہربانیوں سے مالامال کیا ہے، آپ اپنی جنس میں لاجواب ہیں، میں اپنی صنف میں بے مثال ہوں، یہ لاجواب اور بے مثال اتحاد دنیا کو اپنے قدموں پر جھکا سکتا ہے، مسٹر ندیم آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔"

خاموشی کے ساتھ ندیم یہ باتیں سنتا رہا، وہ اپنی تقریر کر کے چپ ہو گئی، اور پر امید نظروں سے اسے دیکھنے لگی، لیکن وہ ابتک خاموش تھا، آخر خاموشی کا یہ طلسم توڑنے پر وہ مجبور ہوئی، اس نے کہا۔

"مسٹر ندیم آپ کیا سوچنے لگ گئے"،

ندیم نے چونک کر سر اٹھایا اور کہا،

"سوچنے کا اتنا بڑا ذخیرہ آپنے فراہم کر دیا ہے کہ شاید مدت تک وہ کام دے گا"

اس نے گھور کر ندیم کو دیکھا اور ذرا تیکھے لہجہ میں کہا،

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

ندیم نے جواب دیا،

"اس وقت جو گفتگو آپ نے کی ہے، اسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا"

یہ الفاظ سنکر وہ خوش ہوگئی، اس کے چہرہ پر رونق آگئی، تیکھا پن رخصت ہو گیا،

ندیم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا،

"آپ کی ان باتوں میں بڑی گہرائی ہے، بڑا اونچا فلسفہ ہے، زندگی کی ٹھوس حقیقتیں ہیں، سوچتا ہوں اتنی مختصر سی عمر میں اتنا کچھ آپ نے کیسے حاصل کر لیا، لیکن یہ خدا کی دین ہے، ——————"

اس کے چہرہ کی رونق اور بڑھ گئی، وہ محبت بھری نظروں سے ندیم کو دیکھنے لگی،

وہ کہہ رہا تھا،

"اپنے بے مثال ہونے کے بارے میں آپ نے جو کچھ کہا اس پر میں صاد کرتا ہوں واقعی بڑی فیاضی سے قدرت نے آپ کو دولت حسن عطا کی ہے، "

یہ الفاظ سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے الفاظ نے کیف و سرور کی ایک نئی دنیا اس کے سامنے کردی ہے، ندیم نے کہا،

"لیکن میرے بارے میں آپ نے جو کچھ فرمایا، وہ اگر بالکل غلط نہیں تو بڑی حد تک مبالغہ سے لبریز ہے، ——————"

وہ قطع کلام کرتی ہوئی بولی،

"نہیں مسٹر ندیم! نہ میں جھوٹ بولتی ہوں، نہ مبالغہ میری عادت میں داخل ہے، میں نے جو کچھ کہا ہے، اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے، کلب کے در و دیوار اس کے گواہ ہیں، افروز سے اور کئی دوسری سہیلیوں سے اکثر آپ کا ذکر ہوتا ہے، —————— ——————"

ندیم نے یک بیک سوال کیا،

"مس افروز اور آپ کی دوسری سہیلیاں میرا ذکر کرتی رہتی ہیں؟ میرا؟ کیوں آخر؟"

خوشی کے نشہ سے سرشار ہوتی ہوئی وہ کہنے لگی،

اس لیے کہ آپ اس قابل ہیں کہ ہر جگہ اور ہر محفل میں یاد کیے جائیں، ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد کون ہے جو آپ کو بھول سکے، اپنی خوبیاں آپ کو نہیں معلوم، جس طرح اپنی برائیاں کسی کو نہیں محسوس ہوتیں، وہ دوسرے ہی لوگ ہوتے ہیں جو کسی کے بارے میں اچھا یا برا ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، اور سچ پوچھئے تو وہی فیصلہ صحیح اور آخری بھی ہوتا ہے"،

ندیم نے بظاہر ان الفاظ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا،

"جس انداز میں آپ نے اپنا دعویٰ پیش کیا ہے، کوئی بڑے سے بڑا وکیل بھی اسے رد نہیں کر سکتا، لہذا مانے لیتا ہوں کہ بحث میں آپ سے جیتنا مشکل ہے، امید ہے میرا یہ اعتراف شکست آپ کو مطمئن کر دے گا، اس لیے، کہ شاید آپ مجھے شکست دینے پر تلی ہوئی ہیں"،

بے تحاشہ اور بے ساختہ وہ ہنسنے لگی، ہنستے ہنستے بڑی مشکل سے اس نے کہا،

"اوہ مسٹر ندیم، کیا چیز ہیں آپ بھی، ہار جیت کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا، بہر حال میں خوش ہوں کہ میری باتوں کا کسی حد تک آپ نے اثر قبول کیا!"

ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا،

"جی ہاں! میں نے اثر قبول کیا، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں اثر قبول کرنے پر مجبور ہو گیا، ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان مزاحمت کرتا ہے مگر ناکام ہوتا ہے۔

میں نے آپ کا اثر قبول کرنے کی ذہنی طور پہ شدید مزاحمت کی تھی، لیکن اتنی ہی شدید ناکامی سے مجھے دوچار ہونا پڑا۔"

ایک مرتبہ وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور گویا ہوئی،

"مسٹر ندیم آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں، بہرحال میں خوش ہوں کہ ہماری آج کی ملاقات بے نتیجہ نہیں رہی، اور شاید وہ دن جلد آجائے گا جب افروز کی پیش گوئی پوری ہو جائے گی، اگرچہ اب تک میں پیشگوئیوں کو ماننے سے انکار کرتی رہی ہوں"

ندیم نے ذرا چونک کر دریافت کیا،

"مس افروز کی پیش گوئی؟ کیا انھوں نے کوئی پیش گوئی بھی کی تھی؟"

ہنستے ہوئے اس نے بتایا،

"جب بار بار اس نے مجھے آپ کا ذکر کرتے دیکھا تو کہنے لگی"

"یقیناً تم مسٹر ندیم کو جیت لوگی اور تم دونوں زندگی کے ایسے رشتہ میں بندھ جاؤ گے کہ پھر دنیا کی کوئی طاقت تم کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے گی،

افروز نے جب یہ بات کہی تھی تو میں نے ہنس کر ٹال دیا تھا، اگرچہ اس وقت بھی میرا دل اس کی صداقت سے انکار کر سکا تھا، اور اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے کہ افروز نے پردۂ غیب پر ہمارا نوشتۂ قسمت دیکھ کر یہ بات کہی، کیوں مسٹر ندیم سچ ہے نا یہی بات؟"

ندیم نے یکسر توجہ بن کر یہ باتیں سنتے ہوئے جواب میں کہا،

"مستقبل کے بارے میں کچھ کہنا بہت مشکل ہوتا ہے، مس افروز نے جو کچھ فرمایا، کاش وہ صحیح ہو سکتا ہے، بہرحال دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے،

جیسے کسی پر بجلی گر پڑی ہو، ندیم کے ان الفاظ نے وہیں اثر کیا، بے قرار اور بے کل ہو کر مضطرب لہجہ میں اس نے کہا،

"مسٹر ندیم! میں بالکل نہیں سمجھ سکی۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ فی الحال دو تین مہینے کے لیے میں جا رہا ہوں، اور اگر آپ کی کشش واقعی کوئی چیز ہے اور یہ آپ بھی مانیں گی کہ بڑی چیز ہے، تو پھر واپس آؤں گا، شاید ہمیشہ کے لیے؟"

"آپ سچ کہتے ہیں؟"

"اگر آپ مجھے سچا سمجھتی ہوں۔"

ندیم نے بہت زیادہ شائستہ لہجہ میں جواب دیا،

"بات یہ ہے کہ میں ایک مسافر ہوں، اور آپ جانتی ہیں مسافر ہوا کے جھونکے کی طرح آتا ہے اور چلا جاتا ہے، نہ اسے قرار ہے نہ ثبات۔"

وہ اور زیادہ پریشان اور مضطرب ہو کر دریافت کرنے لگی،

"لیکن اب تو آپ یہیں مقیم ہیں، کیا اس کا بھی امکان ہے کہ آپ اپنی یہ بندھی اور خوش گوار زندگی ترک کر کے کہیں اور چلے جائیں؟"

ندیم نے کچھ تامل کرتے ہوئے کہا،

"جی ہاں! ارادہ کچھ ایسا ہی ہے"

وہ تقریباً چیخ پڑی، اس نے کہا،

"کیا آپ چلے جائیں گے؟ یہ شہر چھوڑ دیں گے؟"

ندیم نے جذبات سے یکسر عاری ہو کر مختصر سا جواب دیا،

"آپ کا خیال صحیح ہے، میں یہ شہر چھوڑ رہا ہوں، یہاں سے جا رہا ہوں"

ندیم کے یہ الفاظ سن کر وہ چند لمحوں تک بے حس و حرکت بیٹھی رہی، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، پھر اس نے اپنی قوت گویائی پر قابو پاتے ہوئے پوچھا،

"ارادہ کہاں کا ہے؟"

"فی الحال لندن تک"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی!"

"یہ کیا غضب کرتی ہیں آپ، میں اتنا خود غرض نہیں ہوں کہ آپ سے یہ شہر چھڑا دوں، جس نے آپ کو شہرت دی، دولت دی، اور نہ جانے کیا کیا دیا"

"میں آپ کے لیے سب کچھ چھوڑ دوں گی، نہ میں شہرت کی بھوکی ہوں، نہ کسی اور چیز کی"

(۴)

اس گفتگو کے بعد مس وارد والا نے ندیم سے پر تپاک مصافحہ کیا اور رخصت ہو گئی اس کے جاتے ہی ندیم نے شہلا کو بلوایا، وہ حسب معمول کاپی اور پنسل لے کر آموجود ہوئی، ندیم نے کہا،

"مس شہلا آپ کی اس پنسل اور کاپی کو دیکھ کر تو اب مجھے وحشت ہونے لگی ہے، براہ کرم دونوں چیزوں کو اپنی میز پر جا کر پٹک دیجیے، اور پھر تشریف لائیے!"

شہلا اپنے کیبن میں واپس گئی، کاپی اور پنسل رکھ کر پھر حاضر ہوئی، ندیم نے کہا،

"بیٹھ جائیے، آج بہت ضروری باتیں کرنا ہیں آپ سے"

شہلا بیٹھ گئی اور سوالیہ نظروں سے ندیم کو دیکھنے لگی، ندیم نے کہا،

"میری اور اس عورت کی گفتگو آپ نے سنی تھی؟"

شہلا نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا،

"بالکل نہیں، یہ میری عادت کے خلاف ہے! یہ ضرور ہے کہ بعض بعض باتیں آپ کے یا اس کے منہ سے نکلی ہوئی میرے کانوں میں پڑ گئیں، لیکن وہ اتنی بے ربط تھیں کہ میں ان سے کوئی نتیجہ نہ اخذ کر سکی"

ندیم نے تحسین و تعریف کی نظر سے شہلا کو دیکھا اور کہا

"آپ کی خوبیاں حد بیان سے باہر ہیں"

شہلا نے مسکراتے ہوئے کہا،

"کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا! "

ندیم نے سنجیدہ لب و لہجہ میں شہلا کو مخاطب کیا،

"مس شہلا، میں وہی کہتا ہوں جو میرا مقصد ہوتا ہے، یہ نہ سمجھئے گا، آپ کو خوش کرنے کے لیے میں نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں، واقعی میرے تاثرات یہی ہیں "

شہلا کچھ دیر خاموش رہی، پھر اس نے کہا،

"کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں آپ کی تردید کر دوں، ———————— لیکن آپ کچھ خاص باتیں کرنا چاہتے تھے، وہ تو رہ گئیں اور غیر ضروری باتیں شروع ہو گئیں"

ندیم نے آہستہ سے کہا،

"مس شہلا ایک راز کی بات بتاتا ہوں آپ کو "

شہلا کا چہرہ سرخ ہو گیا، وہ سوچنے لگی، آج ندیم کس طرح کی باتیں کر رہا ہے، کیا وہ اپنا اصول توڑ دے گا؟ اگر ایسا ہوا تو کیا میں بھی اپنا اصول توڑ دوں گی؟ نہیں، یہ سوچ کر اس کا چہرہ پھر پُرسکون ہو گیا، اس نے کہا،

"اگر اپنے راز کا امین آپ مجھے بنانا چاہتے ہیں تو یہ میرے لیے باعثِ فخر ہے، فرمائیے! "

ندیم نے اور زیادہ آہستہ سے کہا، تقریباً سرگوشی کے انداز میں،

"مس شہلا وہ راز یہ ہے کہ میں آج رخصت ہو رہا ہوں "

شہلا چونک پڑی،

"آپ رخصت ہو رہے ہیں؟ کیوں؟ کہاں؟ کس لیے؟ "

ندیم نے بہت تھکے ہوئے لہجہ میں کہا،

"مس شہلا، یہ شہر بھی مجھے راس نہ آیا، مجھے دولت ملی، عزت ملی، شہرت ملی،

لیکن جس طرح یہاں آنے سے پہلے کئی دوسرے شہروں میں یہ چیزیں مجھے مل جاتیں اور میں انھیں ٹھکرانے پر مجبور ہو گیا تھا، اسی طرح فرید پور میں بھی یہ چیزیں میرا دل تڑپا گئیں، مجھ پر پھر وحشت طاری ہو رہی ہے، میری وحشت کو مس دارو والا نے پھر پیدا کر دیا ہے، وہ اگر قائم رہی تو بڑھتی جائے گی، خوفناک صورت اختیار کرلے گی، ممکن ہے میں اسے قتل کر دوں، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ یہ شہر چھوڑ دوں، ملک خدا تنگ نیست، پائے گدا لنگ نیست۔"

شہلا نے دیکھا ندیم کا چہرہ پھر بھیانک ہو گیا ہے، ایسا ہی بھیانک جیسا اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ کر وہ لرزہ براندام ہو چکی تھی، اس نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

"مسٹر ندیم، اگر یہ بات ہے، اور آپ اس منزل پہ پہنچ چکے ہیں تو ضرور چلے جائیے۔"

"ہاں میں چلا جاؤں گا، آج ہی جاؤں گا۔"

"میں آپ کی رائے سے اتفاق کرتی ہوں، آج ہی چلے جائیے، میں نہیں چاہتی کہ آپ کو روکنے کی کوشش کر کے کوئی نیا خطرہ آپ کے لیے پیدا کر دوں خدا آپ کو سلامت رکھے، میری دلی دعا یہ ہے کہ آپ جہاں بھی رہیں، مطمئن رہیں، صرف ایک بات سوچ کر میں لرز جاتی ہوں ———"

"کہیے، کہیے، مس شہلا کیا سوچ کر آپ لرز جاتی ہیں؟"

"بات یہ ہے کہ میں آپ کی مزاج داں بن چکی ہوں، آپ کی میٹھی اور کڑوی ہر طرح کی باتیں انگیز کرنے کا اپنے آپ کو میں نے عادی بنا لیا ہے، پھر خوش قسمتی سے ہمارے درمیان نہایت بے لوث قسم کی دوستی کا مضبوط رشتہ بھی قائم ہو چکا ہے، آپ یہاں رہتے تو میں معاف کیجیے گا آپ کی وحشت کو جس کا دورہ اکثر پڑا کرتا ہے، شاید کنٹرول

یں رکھ سکتی ! میرے بس میں ہوتا تو صرف اس موقع کو پیش نظر رکھ کر آپ کے ساتھ جہاں جہاں بھی آپ جاتے ، جاتی ، لیکن آپ اپنے حالات سے مجبور ہیں ، میری مجبوریاں میرا راستہ روکے کھڑی ہیں ، میں آپ کو روک نہیں سکتی (آپ اگر کسی نئے شہر میں جاکر کہیں خدانخواستہ اس دورہ سے بے بس ہو کر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے آپ کی جان یا آبرو پر بن آئی تو مجھے بہت صدمہ ہوگا ، یہی سوچ کر میں کانپ اٹھتی ہوں ، میرا بدن لرز جاتا ہے "

ندیم بڑے انہماک اور توجہ سے شہلا کی باتیں سنتا رہا ، پھر اس نے کہا ،

" آپ کی باتوں میں جو خلوص ہے اسے میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکوں گا ، میں یہاں سے تنہا جا رہا ہوں ، لیکن آپ کا یہ نہ بھولنے والا خلوص میرا رفیق راہ ہوگا ، آپ میری وحشت کے جس دورہ سے اتنی خائف ہیں ، مطمئن تو میں بھی اس سے نہیں ہوں ، لیکن مجھے یقین ہے کہ جب کبھی یہ دورہ مجھ پر پڑا تو شاید آپ کے یہ الفاظ مجھے یاد آجائیں گے اور میں اپنی جان یا آبرو کو جس کی میری نظر میں کوئی قطعاً اہمیت نہیں ہے خطرہ میں نہیں پڑنے دوں گا "

شہلا اور ندیم دونوں اس وقت جذباتی ہو گئے تھے ، لیکن یہ جذباتیت وہ نہیں تھی جو ایک محبوب اور محبت کرنے والے کے درمیان کسی نازک مرحلہ پر رخصت کے وقت ظہور میں آتی ہے ، یہ وہ جذباتیت تھی جو دو نہایت عزیز اور مخلص دوستوں کی لامعلوم مدت کے لیے جدائی کے موقع پر چھپائے نہیں چھپتی ، شہلا نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا ،

" آپ کے ان الفاظ سے میری ڈھارس بندھ گئی ہے ، اب میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھ سے ایک عہد کریں شاید یہ اتنا بڑا مطالبہ کرنے کی میں جرأت نہ کرتی ، لیکن آپ کے الفاظ سے زیادہ آپ کے لب و لہجہ نے مجھ میں یہ حوصلہ پیدا کیا ہے — — بتائیے ، کیا آپ عہد کرنے پر تیار ہیں ؟ "

ندیم نے یکسر آمادگی اور سپردگی کے لہجہ میں کہا،

"آپ جو عہد لینا چاہیں لے سکتی ہیں، مجھے قطعاً کوئی تامل نہ ہوگا۔"

اپنے جذبات پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہوئے شہلا نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے، پھر ذرا دیر کے بعد گویا ہوئی،

"عہد کیجیے کہ کبھی اور کیسی حالت میں خواہ وحشت کا کیسا ہی سخت دورہ کیوں نہ پڑے آپ حد سے تجاوز نہ کریں گے، اگر آپ کو میرے اخلاص پر اعتماد ہے اور واقعی میرے اخلاص کو ناقابل فراموش سمجھتے ہیں تو ایسے موقع پر وہ آپ کے لیے روک بن جائے گا۔"

ندیم اٹھ کھڑا ہوا، اور بے مقصد طور پر کمرہ میں ٹہلنے لگا، پھر یکایک وہ شہلا کے پاس آیا اور اس کے قریب کھڑے ہو کر گویا ہوا،

"میں عہد کرتا ہوں!"

شہلا کے چہرہ پر فکر و پریشانی کے جو بادل چھائے ہوئے تھے، یہ الفاظ سنکر وہ چھٹ گئے، خوشی سے اس کا چہرہ دمکنے لگا، اس نے کہا،

"اگر مجھ جیسی مفلس کو کوئی خزانہ بھی مل جاتا تو اس قدر خوشی نہ ہوتی جتنی آپ کے اس عہد سے ہوئی ——————— یہ بتایئے آپ نے یہ فیصلہ اس قدر جلد کیوں کر لیا؟، آج ہی کیوں جا رہے ہیں؟"

ندیم نے جواب دیا،

"ہوائی جہاز پر اتفاقاً ایک سیٹ آج مل گئی اور اس کے بعد بارہ دن تک کوئی سیٹ خالی نہیں ہے اور اتنی طویل مدت، آپ خود تسلیم کریں گی ایک بہت بڑے خطرہ کا مقابلہ کرتے ہوئے مجھے یہاں نہیں گزارنی چاہیے۔"

"پھر تو مجبوری ہے، خیر آج سہی، کیا مسٹر جانسن نے آپ کا استعفا منظور کر لیا

________ ؟"

"میں اتنا احمق نہیں تھا کہ استعفادے کر ایک نیا سین پیدا کرتا، میں نے ایک ہفتہ کی چھٹی لی ہے، لندن پہنچ کر استعفا بھیج دوں گا، مسٹر جانسن، اگر وہ اس وقت تک ہوئے تو اسے منظور کرنے پر مجبور ہوں گے"

"آپ کا طیارہ کس وقت جاتا ہے"

"ٹھیک گیارہ بجے رات کو، دس بجے تک مجھے ہوائی اڈہ پر پہنچ جانا چاہیے، ساڑھے نو بجے مجھے اپنے ہوٹل سے رخصت ہو جانا چاہیے، نو بجے مجھے کھانے پر بیٹھ جانا چاہیے، آٹھ بجے سے سامان سفر کی تیاری میں مجھے لگ جانا چاہیے، (گھڑی دیکھ کر) اب چھ بجنے والے ہیں، لہٰذا شہر ہوتا ہوا کچھ ضروری چیزیں خرید کر ٹھیک وقت پر مجھے ہوٹل پہنچ جانا چاہیے ________"

"آپ کس وقت تک ہوٹل پہنچ جائیں گے، کیا سات بجے تک۔۔؟"

"جی ہاں، اندازہ تو یہی ہے"

"میں آپ کو وہاں ملوں گی"

"نہیں مس شہلا اتنی زحمت نہ کیجیے"

"میں ہوائی اڈے بھی جاؤں گی اور جب تک آپ کا طیارہ پرواز نہ کر جائے وہیں رہوں گی، یہ میرا فیصلہ ہے، ہمیشہ اپنا فیصلہ منوانے کی کوشش نہ کیا کیجیے، کبھی کبھی دوسروں کا فیصلہ بھی مان لیا کیجیے"

"مجھے سچ تو یہ ہے، آپ کے آنے سے خوشی ہوگی، میں تو صرف اس لیے منع کر رہا تھا کہ اتنے ناوقت آپ کیوں زحمت کریں؟"

اس گفتگو کے بعد ندیم دفتر سے باہر چلا گیا، تھوڑی دیر کے بعد شہلا بھی اپنے گھر چلی گئی، وہاں سے ٹھیک وقت پر وہ ندیم کے ہوٹل پہنچ گئی، وہ موجود تھا، گرم جوشی

اور تپاک کے ساتھ اس سے استقبال کیا، شہلا نے سامان سفر ٹھیک کرانے میں اس کی پوری مدد کی، جب سب کچھ ٹھیک ہو گیا تو ندیم نے کہا،

"مس شہلا اگر آپ نہ آئیں تو میں نہ جانے کتنی چیزیں یہیں چھوڑ جاتا، ایک جاسوس کی طرح آپ نے کونا کونا چھان مارا اور ساری چیزیں لا کر ایک جگہ ڈھیر کر دیں، آیئے اب کھانا کھائیں"

بغیر کسی عذر کے شہلا کھانے کی میز پر بیٹھ گئی، کھانے کے دوران مختلف باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد وقت مقررہ پر یہ لوگ ہوائی اڈہ پر پہنچ گئے، کسٹم وغیرہ کے مراحل طے کرنے میں کافی دیر لگ گئی، سامان طیارے پہ بار کر دیا گیا اور یہ دونو پھر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے، شہلا نے پوچھا،

"کبھی کبھی خط تو لکھتے رہیں گے آپ؟"

ندیم نے جواب دیا،

"کوشش تو یہ کروں گا کہ نہ لکھوں، لیکن امید نہیں کہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکوں گا"

اتنے میں اعلان ہوا کہ مسافر طیارے میں بیٹھ جائیں، ندیم شہلا سے رخصت ہو کر طیارے میں جا کر بیٹھ گیا، بی او اے سی کے بھاری بھرکم طیارے نے رن وے کا ایک چکر کاٹا، تھوڑا سا بلند ہوا، پھر تیزی سے اونچائی کی منزلیں طے کر تا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، شہلا اس وقت تک کھڑی رہی جب تک طیارے کی سرخ اور سبز بتیاں اسے نظر آتی رہیں، ٭

انکشاف

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

(۱)

دوسرے روز شہلا اپنے کیبن میں آکر بیٹھ گئی، اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا، کام دینے اور کام لینے والا دور دراز سفر پہ شاید ہمیشہ کے لیے جا چکا تھا، روشن خاں کا چہرہ بھی لٹکا ہوا تھا، وہ بار بار اپنی لاٹھی زمین پہ پٹکتا اور ٹہلنے لگتا، سارے آفس میں ندیم کے چلے جانے کی خبر پھیل چکی تھی،

شہلا خاموش اور کسی حد تک افسردہ بیٹھی تھی، گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کرکے یاد آرہے تھے، گزری ہوئی باتیں ناخوش گوار ہوں تو بھی ان کی یاد میں ایک خاص لطف آتا ہے، شہلا یہی لطف حاصل کر رہی تھی،

اسے یاد آیا ندیم سے پہلی ملاقات کن حالات اور کس فضا میں ہوئی تھی، چہرے پہ شرافت کی جھلک لیکن باطن میں سختی اور درشتی، رعونت اور تکبر، خود نمائی اور خود پسندی،

پھر اسے وہ دن یاد آیا جب مسٹر ایڈورڈ کے حسب ہدایت وہ ندیم سے ملنے اس کے ہوٹل گئی تھی، اور ندیم نے دل شکن باتیں کر کے اسے خود اپنی نظروں میں ذلیل کر دیا تھا،

پھر اسے وہ دن بھی یاد آیا جب ندیم نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا،

پھر وہ دن بھی یاد آیا جب وہ انتہائی ذہنی اضطراب کے عالم میں اسے نظر آیا تھا، اس دارو دار نے اسے ایک مہلک فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا،

اور پھر وہ دن جب وہ اسے الوداع کہنے ہوائی اڈہ پر گئی تھی،

وہ سوچ رہی تھی، ندیم صاحب عجیب و غریب صفات کے آدمی ہیں، بعض وقت ان پر جب دورے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو جارحانہ رنگ غالب آجاتا، آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، اعصاب تن جاتے، معلوم ہوتا یا خود کشی کر لیں گے یا کسی کو مار ڈالیں گے،

لیکن جب یہ کیفیت دور ہوتی، دوستی کے موڈ میں آتے ہیں تو پھر ان سے اچھا اور بہتر دوست کوئی نہیں ہے،

یہ سب کیا ہے ؟،

یہ سب کیوں ہے ؟،

شاید یہ ایسا راز ہے جو کبھی حل نہیں ہو سکے گا، اس لیے کہ ندیم صاحب گئے، اب وہ واپس نہیں آئیں گے،

پھر وہ سوچنے لگی، آج یہ کمرہ کتنا سونا سونا، ویران ویران سا نظر آتا ہے، جب وہ تھے تو ان کی تلون مزاجی کے باوجود ایک طرح کی زندگی رواں دواں نظر آتی تھی، لیکن اب وہ زندگی نہیں ہے،

روشنی عیاں ہے لیکن کوئی اسے گھنٹی بجا کر بلاتا نہیں ہے،

میں ہوں، لیکن نہ آج کوئی دستخط کرنے والا ہے، نہ لیٹر ڈکٹیٹ کرانے والا ہے، معمولی سی بات پر الجھ پڑنے والا ہے،

لیکن اب سوال یہ ہے کہ میرا حشر کیا ہوگا،

”کیا حضرت باقر مجھے جواب دے دیں گے؟ یا کسی نئے منیجر کے تقرر تک میری ملازمت قائم رکھیں گے؟ اگر جواب دے دیا تو ——————“

اتنے میں کیتھرائن، ہنستی مسکراتی، بل کھاتی آئی اور قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی، اس کے ہاتھ میں کاغذات کا ایک پلندا تھا، اس نے کہا،

"مس شہلا میں تمہیں مبارکباد دینے آئی ہوں،"

شہلا چونک پڑی اس نے پوچھا،

"مجھے مبارک باد دو گی؟ کس بات کی؟"

کیتھرائن نے ایک قہقہہ لگایا اور گویا ہوئی،

"مسٹر ندیم شاید ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے گئے، مسٹر جانسن کو افسوس ہے کہ ایک ایسے انتہا قابل اور حاضر دماغ شخص ہاتھ سے نکل گیا، میرا خیال ہے کہ ایک دیوانہ کچھ دن یہاں ٹھہرا، پھر جدھر منہ اٹھا چل دیا، لیکن تمہیں یقیناً مسرت ہوگی کہ ایسے آدمی سے نجات مل گئی جو وبال جان بنا ہوا تھا، کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ مبارک باد دینے میں کیوں آئی تھی؟"

شہلا غور سے اس کی باتیں سنتی رہی پھر اس نے کہا،

"مسٹر جانسن کا افسوس بجا ہے، تمہارا خیال بھی غلط نہیں، لیکن مجھے ندیم صاحب کے جانے سے مسرت ہوئی ہے یہ غلط ہے۔"

کیتھرائن نے گھور کر شہلا کو دیکھا اور پھر مسکراتی ہوئی بولی،

"کیوں؟ کیا مسٹر ندیم کا برتاؤ تمہارے ساتھ غیر شریفانہ نہیں تھا؟"

شہلا نے جواب دیا،

"تم اسے غیر شریفانہ کہہ سکتی ہو، میرے نزدیک ضرورت سے زیادہ سخت تھا، لیکن کیتھرائن کوئی ایسی بات ضرور تھی، جسے میں نہیں جانتی اور نہ شاید کبھی جان سکوں گی۔ جس نے ندیم صاحب کے ذہنی اور طبعی توازن میں خلل ڈال دیا تھا۔"

کیتھرائن کچھ سوچتی ہوئی بولی،

"ہو سکتا ہے تمہارا خیال صحیح ہو، پھر تو مسرت کے بجائے افسوس کرنے کو جی چاہتا ہے، کتنا طرحدار آدمی تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنی جان سے اور ہم جیسیوں کی صورت سے بیزار

وہ سوچ رہی تھی، ندیم صاحب عجیب و غریب صفات کے آدمی سلتے، بعض وقت ان پر جب دورے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو جارحانہ رنگ غالب آجاتا، آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، اعصاب تن جاتے، معلوم ہوتا یا خود کشی کر لیں گے یا کسی کو مار ڈالیں گے،

لیکن جب یہ کیفیت دور ہوتی، دوستی کے موڈ میں آتے ہیں تو پھر ان سے اچھا اور بہتر دوست کوئی نہیں ہے،

یہ سب کیا ہے ؟،

یہ سب کیوں ہے ؟،

شاید یہ ایسا راز ہے جو کبھی حل نہیں ہو سکے گا، اس لیے کہ ندیم صاحب گئے، اب وہ واپس نہیں آئیں گے،

پھر وہ سوچنے لگی، آج یہ کمرہ کتنا سونا سونا، ویران ویران سا نظر آتا ہے، جب وہ تھے تو ان کی تلون مزاجی کے باوجود ایک طرح کی زندگی رواں دواں نظر آتی تھی، لیکن اب وہ زندگی نہیں ہے،

روشن خاں ہے لیکن کوئی اسے گھنٹی بجا کر بلاتا نہیں ہے،

میں ہوں، لیکن نہ آج کوئی دستخط کرنے والا ہے، نہ لیٹر ڈکٹیٹ کرانے والا ہے، نہ معمولی سی بات پر الجھ پڑنے والا ہے،

لیکن اب سوال یہ ہے کہ میرا حشر کیا ہوگا،

"کیا منظر تبا ؟ سن مجھے جواب دے دیں گے ؟ یا کسی نئے تجربے تقرر تک میری ملازمت قائم رکھیں گے ؟ اگر جواب دے دیا تو ——————"

اتنے میں کیتھرائن، ہنستی مسکراتی، بل کھاتی آئی اور قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی، اس کے ہاتھ میں کاغذات کا ایک پلندا تھا، اس نے کہا،

"مس شہلا میں تمہیں مبارکباد دینے آئی ہوں"

شہلا چونک پڑی اس نے پوچھا،

"مجھے مبارکباد دوگی؟ کس بات کی؟"

کیتھرائن نے ایک قہقہہ لگایا اور گویا ہوئی،

"مسٹر ندیم شاید ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے گئے، مسٹر جانسن کو افسوس ہے کہ ایک ایسا نہایت قابل اور حاضر دماغ شخص ہاتھ سے نکل گیا، میرا خیال ہے کہ ایک دیوانہ کچھ دن یہاں ٹھہرا، پھر جدھر منہ اٹھا چل دیا، لیکن تمہیں یقیناً مسرت ہوگی کہ ایسے آدمی سے نجات مل گئی جو وبال جان بنا ہوا تھا، کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ مبارکباد دینے میں کیوں آئی تھی؟"

شہلا غور سے اس کی باتیں سنتی رہی، پھر اس نے کہا،

"مسٹر جانسن کا افسوس بجا ہے، تمہارا خیال بھی غلط نہیں، لیکن مجھے ندیم صاحب کے جانے سے مسرت ہوئی ہے یہ غلط ہے"

کیتھرائن نے گھور کر شہلا کو دیکھا اور پھر مسکراتی ہوئی بولی،

"کیوں؟ کیا مسٹر ندیم کا برتاؤ تمہارے ساتھ غیر شریفانہ نہیں تھا؟"

شہلا نے جواب دیا،

"تم اسے غیر شریفانہ کہہ سکتی ہو، میرے نزدیک ضرورت سے زیادہ سخت تھا، لیکن کیتھرائن کوئی ایسی بات ضرور تھی، جسے میں نہیں جانتی اور نہ شاید کبھی جان سکوں گی۔ جس نے ندیم صاحب کے ذہنی اور قلبی توازن میں خلل ڈال دیا تھا"

کیتھرائن کچھ سوچتی ہوئی بولی،

"ہو سکتا ہے تمہارا خیال صحیح ہو، پھر تو مسرت کے بجائے افسوس کرنے کا جی چاہتا ہے، کتنا طرحدار آدمی تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنی جان سے اور ہم جیسیوں کی صورت سے بیزار

رہتا تھا"

شہلا مسکرا پڑی، اس نے کہا،

" تم جیسیوں کی نہیں، ہم جیسیوں کی صورت سے، تم تو چیز ہی کچھ اور ہو، تم سے تو ایک اندھا بھی بیزار نہیں ہو سکتا "

کیتھرائن ہنسنے لگی، اس نے کہا،

" شکریہ! اس قدر افزائی کا ———— مسٹر جانسن نے یہ کاغذات دیے ہیں، انھیں ٹائپ کر کے ان سے دستخط کرا لینا، جب تک کسی نئے منیجر کا تقرر نہیں ہو جاتا ندیم صاحب کا کام وہی کریں گے، لہٰذا تم بدستور اپنی ڈیوٹی انجام دیتی رہو گی، فرق یہ ہوگا کہ پہلے ہر وقت ندیم صاحب کی ڈانٹ سنا کرتی تھیں، اب مسٹر جانسن کبھی بھول کر بھی خود سے نہیں پوچھیں گے کہ تم نے کام کیا ہے، یا نہیں؟ وہ اپنے ماتحتوں پر کسی طرح کی سختی نہیں کرتے "

شہلا تائید کرتی ہوئی بولی،

" ہاں، یہ بات تو ہے "

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد کیتھرائن چلی گئی، اور شہلا اپنے کام میں لگ گئی، تین بجے تک اس نے کام ختم کر لیا، پھر وہ مسٹر جانسن کے پاس دستخط کرانے گئی، وہ حسب عادت بہت تپاک اور گرم جوشی سے پیش آئے، دستخط کرتے کرتے ایک خط پر وہ رکے اور انھوں نے شہلا سے کہا،

" یہ خط تم نے ٹھیک لکھا ہے، لیکن مس شہلا اس کمپنی کا سابقہ ریکارڈ دیکھ کر یہ معلوم کر لو کہ معاملہ ٹھیک ہے یا نہیں، اگر ٹھیک ہے تو یہ خط بھیج دو ورنہ پھر دوسرا خط لکھنا پڑے گا "

شہلا نے قدرے رکتے رکتے کہا،

" سابقہ ریکارڈ؟ ———— "

مسٹر جانسن بول پڑے،

" ہاں مس شہلا، مجھے یاد پڑتا ہے، مسٹر ندیم کی میز پر میں نے وہ ریکارڈ دیکھا تھا، وہیں ہوگا "

شہلا خاموش ہوگئی، جانسن صاحب نے دوسرے کاغذات پر دستخط کر کے اسے رخصت کر دیا، کیبن میں آکر شہلا نے کاغذات اپنی میز پر رکھے اور ریکارڈ تلاش کرنے ندیم کے کمرہ میں پہنچی، میز پر کوئی کاغذ نہیں تھا، شلف اور الماری کی تلاشی لی، مگر اسے بھی جس چیز کی تلاش تھی وہ نہ ملی، مایوس ہوکر پھر مسٹر جانسن کے پاس واپس جانے والی تھی کہ کچھ خیال آیا اور اس نے میز کی دراز کھولی، پہلے خانے میں ایک موٹی سی ڈائری رکھی تھی، وہ اس نے میز پر رکھ دی، پھر دوسرا خانہ کھولا، اس میں ریکارڈ مل گیا، وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے ریکارڈ پر ایک نظر ڈالی اور اپنے کیبن میں آکر تمام خطوط ڈسپیچ کر دیے، اب چار بج چکے تھے، یاد دہانی کے طور پر روشن خاں نے اپنا ڈنڈا فرش پر مارا، شہلا گھر جانے کے لیے اٹھی، یکایک اسے خیال آیا اور وہ پھر ندیم کے کمرہ میں واپس گئی، وہ ڈائری اب تک میز پر رکھی تھی، شہلا نے اسے اٹھا کر سرسری طور پر ورق گردانی کی، اندازہ ہوا کہ خود ندیم کی لکھی ہوئی ڈائری ہے، شاید اس کا ذاتی روز نامچہ، سوچا ایسی ذاتی چیز دفتر میں کیوں پڑی ہے، نہ جانے کس کس کی نظر سے گزرے، اسے گھر لیے جاتی ہوں، اگر کبھی ندیم صاحب کا کوئی سراغ لگا تو انھیں بھیج دوں گی، •

(۲)

گھر واپس آنے کے بعد تھوڑی دیر تک شہلا ماں کے پاس بیٹھی، پھر خسرو اور فوزیہ سے باتیں کیں، پھر کھانے سے فارغ ہو کر کورس کی کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ امتحان قریب آتا جا رہا تھا اور تیاری ابھی تک نامکمل تھی، بارہ بجے تک پڑھتے پڑھتے کچھ ایسی اونگھی نہ بنی بجھائی، نہ کتابیں بند کیں اسی طرح پڑے پڑے سو گئی، صبح اٹھ کر ناشتہ وغیرہ سے جلدی جلدی فارغ ہوئی اور ٹھیک وقت پہ آفس پہنچ گئی، اپنے کیبن میں جا کر بیٹھ گئی۔ ہینڈ بیگ میز پہ رکھا، جانسن صاحب کے پاس جا کر ان سے آج کا کام سمجھا اور آکر ٹائپ کرنے لگی، لیکن آج کام روز کے مقابلہ میں کم تھا، اس کا عام اصول یہ تھا کہ اگر وقت سے پہلے فارغ ہو جاتی تو بھی دفتر سے قبل از وقت نہ جاتی، اسی مقصد کے لیے بیگ میں دو ایک کتابیں اور دو چار رسالے ہمیشہ پڑے رہتے کہ وقت فرصت ان کا مطالعہ کر لیا کرے، ابھی دفتر کا وقت ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے، اس نے سوچا کوئی کتاب پڑھنی چاہیے، بیگ میں ہاتھ ڈالا تو ندیم کی ڈائری نکل آئی،

انسان اور خصوصاً عورت کتنی ہی مہذب اور بااصول کیوں نہ ہو لیکن اگر کسی آدمی سے کسی طرح کا ربط و تعلق ہو اور کسی بات سے اس کے حالات پہ روشنی پڑتی ہو تو تجسس ضرور ہوتا ہے ایک عرصہ سے وہ اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی کہ ندیم کی اس دماغی کیفیت کا راز کیا ہے، اس نے سوچا شاید اس ڈائری سے حالات پہ کچھ روشنی پڑ سکے،

اس نے پہلا ورق الٹا،

۴ جنوری،

جب کبھی شاہدہ کو دیکھ لیتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نظر کے سامنے بجلی کوند گئی، وہ کون سی خوبی ہے جو اس میں نہیں ہے، اسی سال اس نے بی اے کا امتحان پاس کیا ہے، اخلاق اور تواضع میں وہ اپنی مثال آپ ہے، مجھے نہیں معلوم، حسن کی تعریف کیا ہے، لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آج تک شاہدہ سے زیادہ حسین عورت میری نظر سے نہیں گذری، اس کے حسن میں معصومیت ہے سادگی ہے، شرافت ہے، وقار ہے، اسے دیکھ کر آنکھیں نہیں ٹھہرتیں، اس کے سامنے زبان نہیں کھلتی، اس میں وہ کشش ہے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ سکتی ہے، سب اس کی تعریف کرتے ہیں، کوئی ایسا نہیں ہے جس کی نظر میں وہ بد صورت ہو، بد وضع ہو، میں نے گھر والوں میں سے باری باری ہر ایک کو ٹٹولا، سب اس کے گن گاتے ہیں،

لیکن ایک بہت بڑا عیب ہے اس میں،

وہ غریب ہے،

ہمارا اور اس کا خاندان ایک ہے،

ہمارا اور اس کا خون ایک ہے،

ہمارے اور اس کے اجداد ایک ہی ہیں لیکن زمانے نے ہم میں سے ایک کو غریب بنا دیا ہے دوسرے کو امیر،

یہ تفریق اٹل ہے،

ہم ایک دوسرے کے رفیق زندگی نہیں بن سکتے،

ندیم کے دولت مند والدین اپنے اکلوتے لڑکے کی شادی ایک غریب لڑکی سے نہیں کر سکتے، وہ چاہتے ہیں ان کی بہو بھی مالدار ہو، جہیز کی صورت میں اپنے ساتھ

.... دھن دولت لائے، یہ توقع شاہدہ کو بھو جانے سے پوری نہیں ہو سکتی، جہاں فاقے ہوتے ہیں، وہاں قیمتی جہیز کا کیا سوال ؟،

یہ کشمکش بڑھتی جا رہی ہے، اس کا انجام کیا ہوگا ؟ کچھ نہیں معلوم ،،

شہلا نے یہ الفاظ پڑھے اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، وہ سوچنے لگی،

تو یہ بات ہے !،

پھر مزید غور ملتوی کر کے اس نے دوسرا ورق الٹا لکھا تھا،

آج میں نے والدہ سے بہت صاف الفاظ میں اپنا عندیہ ظاہر کر دیا، انھوں نے ایک درجن مالدار اور خوب صورت لڑکیوں کی فہرست میرے سامنے پیش کی، میں نے سب کو مسترد کر دیا، وہ بگڑ گئیں، کہنے لگیں،

" لڑکے تجھے ہوا کیا ہے ؟ کیا عمر بھر یونہی کنوارا بیٹھا رہے گا ؟ "

میں نے عرض کیا،

" اماں جان ایک بات کان کھول کر سن لیجئے، اگر شادی کروں گا تو صرف شاہدہ سے ورنہ نہیں "

اماں جان نے کڑے تیور سے مجھے دیکھا اور فرمایا،

تیرا باپ نہیں مانتا،

میں نے بھی ویسے ہی لہجہ میں جواب دیا،

" میں بھی اسی باپ کا بیٹا ہوں، میں بھی نہیں مانتا "

سہمے ہوئے لہجہ میں کہنے لگیں،

" وہ تجھے عاق کر دیں گے، ایک جھنجی کوڑی بھی نہیں دیں گے "

میں نے کہا،

"عاق ہونا منظور ہے۔ دولت اور جائداد سے محروم ہوجانا بھی قبول، لیکن شاہدہ کے خیال سے دست بردار ہوجاؤں، یہ ناممکن ہے۔ یا تو میرے سامنے شادی کا نام نہ لیجئے، ورنہ شاہدہ کو بہو بنانے پر تیار ہوجائیے"

ماں آخر ماں ہوتی ہے، بیچاری نے ہتھیار ڈال دیئے کہنے لگیں،

"موئی کہیں کا، جس طرح پٹر پٹر میرے سامنے بول رہا ہے، کیا اسی طرح اپنے باپ سے بھی باتیں کر سکتا ہے؟"

میں نے کہا،

"نہیں! ——"

اماں جان نے سوال کیا،

"کیوں؟ وہاں پانی کیوں مرتا ہے؟ میرے سامنے کیوں شیر ہو؟"

میں نے جواب دیا،

"وہ باپ ہیں اور آپ ماں"

ہنسنے لگیں اور مسکراتی ہوئی چلی گئیں، میں سمجھ گیا، اب وہ میری طرف سے ابا جان سے آج یا کل زبردست جنگ کریں گی اور یقیناً فتح انھیں کی ہوگی"

شہلا نے ورق ختم کیا، ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اس کے بعد پھر الٹا، لکھا تھا،

آج میں شاہدہ کے ہاں گیا تھا، شاہدہ کی ماں جنھیں میں خالہ کہتا ہوں بڑی اچھی بی بی ہیں، مجھ سے ان کا برتاؤ ہمیشہ سے بہت مشفقانہ رہا ہے۔ جیسے ہی میں پہنچا، شاہدہ کو چائے بنانے کا حکم دیا، وہ بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی، ماں کا یہ حکم ناگوار تو گزرا، لیکن تھوڑی دیر میں چائے بنا کر لے آئی۔ میں نے کہا،

"آخر اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ مسکرانے لگی، اس نے اپنی ماں سے کہا،
"دیکھ لیجئے ندیم بھائی کی حرکتیں، جب میں چائے بنا کر لے آئی تو اب تکلّف کر رہے ہیں، پہلے ہی کہہ دیا ہوتا تو اتنی مزے کی کتاب بیچ سے چھوڑ کر مجھے اٹھنا تو نہ پڑتا"

یہ کہہ کر اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی، میں چائے پی رہا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے کہا،

"اماں جی ندیم بھائی کو آپ اتنا نیک اور سیدھا سمجھتی ہیں لیکن یہ بڑے چالاک ہیں"

وہ میری طرف سے لڑنے کو تیار ہو گئیں، انھوں نے کہا،
"لڑکی کچھ دیوانی ہو گئی ہے، جو منہ میں آیا بک دیا؟"

ادھر میرا دل دھڑک رہا تھا کہ میری کس چالاکی کی طرف شاہدہ اشارہ کر رہی تھی، اتنے میں شاہدہ نے زیرِ لب تبسّم کے ساتھ کہا،

"دس بارہ دن کی بات ہے، مجھے کالج میں اپنی ایک سہیلی سے معلوم ہوا کہ ان کی شادی رخسانہ سے ہو رہی ہے، وہی امجد علی صاحب ٹھیکیدار کی لڑکی، مگر ندیم بھائی نے آج تک محض اس ڈر سے اس خبر کا ذکر نہیں کیا کہ بے چارے کو مٹھائی کھلانا پڑے گی"

میری جان میں جان آئی، میں نے مسکراتے ہوئے کہا،
"مٹھائی افواہوں پر تو نہیں کھلائی جا سکتی، اس طرح کی ہوائی باتوں پہ اگر مٹھائی کھلانا شروع کر دوں تو شہر کے حلوائی بلیک مارکیٹ شروع کر دیں گے"
میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میری یہ باتیں سنکر اس کے چہرے پر رونق آگئی، وہ ہنسنے لگی، اس نے کہا،

"وہ تو بڑے زور سے کہہ رہی تھیں"

میں نے جواب دیا،

"جھوٹ اگر زوردار نہ ہو تو بات ہی کیا ہوئی؟"

وہ پھر ہنسنے لگی، اس نے تیوری چڑھا کر گویا میری بات کا یقین نہ کرتے ہوئے سوال کیا،

"کیا واقعی رخسانہ سے آپ کی شادی نہیں ہو رہی؟"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا،

"قطعاً نہیں"

میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرے اس انکار سے اسے کچھ خوشی ہوئی، شاید مزید اطمینان حاصل کرنے کے لیے اس نے کہا،

"تعجب ہے، رخسانہ جیسی لڑکی سے آپ شادی کرنا نہیں چاہتے؟ دولت مند باپ کی بیٹی ہے"

میں نے گویا اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا،

"دیکھو بھائی مشاہدہ، شادی نہ دولت سے کی جاتی ہے، نہ صورت سے"

یہ سنکر ذرا سے ذرا مشاہدہ کا رنگ رُخ بدل گیا۔ جیسے خود بخود سمجھ کر وہ شرما سی گئی، پھر اس نے کہا،

"یہ تو آپ بالکل نئی بات کہہ رہے ہیں، دھن دولت کے آگے تو لوگ صورت کو بھی نہیں دیکھتے"

میں نے جواب دیا،

"ہاں بھئی دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہیں، اور احمق زیادہ ہیں"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، اس نے پھر ایک پیالی بنائی اور میری طرف بڑھا دی.
میں نے کہا،
"ابھی تو پی چکا ہوں!"
وہ ایک ادائے خاص سے گویا ہوئی،
"ایک پیالی اور بھی!"
میں انکار نہ کر سکا، میں نے گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پینا شروع کر دی،
وہ سنجیدگی کے ساتھ بولی،
"جلدی ختم کیجئے تو تیسری بناؤں، خالہ نے اسے ڈانٹا، میں ہنسنے لگا، وہاں سے گھر واپس آیا تو خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا، اظہار عشق کے بغیر ہم دونوں شاید ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے، ——— !"
روشن خاں نے شہلا سے کہا،
"چار بج گیا!"
اس نے ڈائری بیگ میں رکھی اور کہا،
"دفتر بند کرو، ہم جاتے ہیں"

(۳۴)

گھر میں شہلا کا کئی مرتبہ جی چاہا کہ کتاب بند کر دے، اور ڈائری کھول کر بیٹھ جائے، اب ایک عجیب طرح کا تجسس پیدا ہو گیا تھا جو اس کے مزاج اور سرشت کے بالکل خلاف تھا۔ لیکن اس ڈائری میں نہ جانے کیا بات تھی کہ لاکھ لاکھ ضمیر ملامت کرتا، مگر وہ اسے پڑھے بغیر نہ رہتی، ایک مشکل یہ تھی کہ، گھر میں اسے پڑھتے، یا اپنے بستے سے نکالتے ڈرتی تھیں، کہیں کسی اور کی خاص طور پہ امی کی نظر نہ پڑ جائے. پھر طرح طرح کے ٹیڑھے میڑھے سوالات کا جواب کون دے گا، مجبوراً سینہ پہ پتھر کی سل رکھتی اور، دفتر جانے کے بعد پہلا کام یہ کرتی کہ چند صفحے ڈائری کے پڑھتی، پھر ٹائپ کرنے لگتی، دس پانچ کاغذ ٹائپ کر کے پھر ڈائری کا مطالعہ شروع کر دیتی چند ورق پڑھنے کے بعد پھر ٹائپ

آج بھی اس نے ایسا ہی کیا، دفتر پہنچتے ہی پہلے تو کاغذات درست کیے، ٹائپ رائٹر کو ایک انجینئر کی طرح بجی، پھر اس میں کاغذ پھنسا کر، دو تین سطریں ٹائپ کیں اور ڈائری پڑھنے لگی!

"آخر میں جیت گیا"

میں کیا امان جیت گئیں،

اتفاق کی بات، رات ایک دوست کے ہاں، کھانے پر مدعو تھا، وہاں سے اٹھتے

اٹھتے دس بج گئے، گھر پہنچا، تو دبے پاؤں اپنے کمرہ کی طرف بڑھا، اس ڈر سے کہ کہیں والد یا والدہ جاگ نہ جائیں، لیکن وہاں سو کون رہا تھا؟

وہاں تو مہابھارت کی لڑائی لڑی جا رہی تھی،

نیزے اور تلوار کے بغیر اتنی شاندار جنگ، —————— لطف آگیا بخدا،

میں نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر سنا اور دیکھا والد بپھرے ہوئے شیر کی طرح کمرے میں ٹہل رہے تھے، غصہ سے چہرہ سرخ، آنکھوں سے جیسے خون ٹپک رہا ہو، والدہ نہایت اطمینان سے اپنے بستر پر بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں، ایسا اطمینان ایسا سکون گویا، نہ انھیں والد کی برہمی کی پروا ہے، نہ اطلاع، ٹہلتے ٹہلتے والد آکر، بالکل ان کے پاس کھڑے ہو گئے،

کیا کہہ رہا تھا وہ الّو کا پٹھا؟

والدہ نے سر اٹھا کر، ایک نگاہ والد کے پرجلال چہرے پر ڈالی، پھر اسی طرح چھالیہ کترتے ہوئے بولیں،

بتا تو چکی، کئے مرتبہ ایک ہی بات پوچھے جاؤ گے؟ اتنی دیر میں کم سے کم دس مرتبہ تو یہی سوال دہرایا ہوگا۔

اپنی برہمی کا اس قدر سرد مہری کے ساتھ استقبال والد کے پندار کے لیے ناقابل برداشت تھا، انھوں نے بجلی کی طرح کڑک کر، اور بادل کی طرح گرج کر کہا،

"بتاؤ میں پوچھتا ہوں،!"

والدہ نے بدستور اپنا شغل جاری رکھتے ہوئے کہا،

"وہ شاہدہ سے شادی کرے گا،؟"

"الّو کا پٹھا!"

"یہ تم جانو، !" والدہ نے بڑی سادگی اور معصومیت کے ساتھ کہا،
"کیا کہا نیک بخت ؟" والد کانپنے لگے،
"تم نے کیا کہا تھا پہلے یہ سوچو، پھر میرا جواب خود بخود سمجھ میں آجائے گا، !" والدہ نے اسی بے پروایانہ شان سے کہا،
"آج تمھیں ہو کیا گیا ہے ؟" والد حیرت سے والدہ کو دیکھتے ہوئے بولے، "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم بھی اس کی ہم خیال ہو"! "
"ہاں بے شک !" والدہ نے سروتا ایک طرف رکھ کر کہا، "کیا وہ میرا لڑکا نہیں ہے ؟ اگر اپنی رفیقۂ زندگی بھی وہ اپنی مرضی سے منتخب نہیں کر سکتا تو تف ہے ایسی زندگی پر"! "
"ارے ارے، !" والد پر گویا سناٹا چھا گیا، "تم اس حد تک مامتا کے جوش میں آگے بڑھ چکی ہو ؟"
"میرے کوئی دس بیس لڑکے تو ہیں نہیں" والدہ نے جواب دیا، "چھوٹی آنکھ کا دیکی دیدہ ہے، ! اس کے لیے، تو میں آخری حد تک آگے بڑھ کر دکھا دونگی، !"
"یعنی ؟" اس سے آگے والد کے لیے کچھ کہنا مشکل ہو گیا، پھر کچھ سوچتے ہوئے والدہ کے پاس بیٹھ گئے، "گویا تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ——————"
"ہاں یہ میرا فیصلہ ہے، !" والدہ نے سخت لہجہ میں کہا، "ندیم کی شادی شاہدہ سے ہوگی، —————— میں پوچھتی ہوں آخر شاہدہ میں برائی کیا ہے ؟ کیا خوب صورت نہیں ہے ؟ کیا وہ خوب سیرت نہیں ہے ؟ کیا وہ ہنر مند اور سلیقہ شعار نہیں ہے ؟ کیا وہ اچھی خاصی پڑھی لکھی نہیں ہے ؟"
"ہاں ہے تو !" والد نے والدہ کو گھور کر دیکھا، "مگر خدا کی بندی، کیا وہ تم ہی نہیں ہو، جسے آج سے پہلے تک شاہدہ میں یہ خوبیاں کبھی نظر نہیں آئیں، ؟ کیا تم ہی نے مجھ سے بارہا نہیں کہا، شاہدہ اس گھر میں دلہن بنکر کبھی نہیں آسکتی، کیا ہی نے مجھے نہیں بتایا،

بڑی فیشن ایبل ———"

"ارے ہاں ہوگا،" والدہ نے اکتائے ہوئے لہجہ میں کہا، "فیشن کون نہیں کرتا، اپنے ہی کو دیکھ لو،!"

"اپنے کو کیا دیکھوں؟" والد نے چڑ کر سوال کیا، "میں کیا کرتا ہوں؟"

"جب تک گھنٹہ بھر کنگھی چوٹی نہ کرلو،" والدہ نے جواب دیا، "گھر سے قدم باہر نکالتے ہو؟ پھر وہ تو عورت ہے، اسے عورت کیا لڑکی ہے، فیشن اسکے یہی دن ہیں اور کیا میری عمر کو پہونچکر فیشن کرے گی؟"

"گویا اب فیشن ایبل ہونا تمہاری نظر میں قابل اعتراض نہیں رہا،؟" والد نے کہا، "کس قدر جلد انقلاب ہوا ہے سابقہ رائے میں؟ ——— اور کیا تم ہی یہ نہیں کہہ رہی تھیں کہ شاہدہ کی ناک لمبی، دانت بڑے، ہونٹ موٹے ہیں، ———؟"

"معلوم ہوتا ہے کچھ سننے کو جی چاہ رہا ہے تمہارا؟" والدہ گویا ہوئیں، "ہاں صاحب اس کی ناک بھی گز بھر کی ہے اور دانت بھی، اور ہونٹ تو اتنے موٹے ہیں کہ زمین سے جھول رہے ہیں، پھر؟ بھلا بچہ اسے پسند کرتا ہے، اس کی نظر میں وہ حسین ہے، ہماری نگاہ میں بھی وہ پرستان کی پری ہے، ——— ذرا اپنا چہرہ بھی تو آئینہ لے کر دیکھ لیا کرو کبھی،!"

"یعنی میں بدصورت ہوں؟" والد نے پوچھا، "پھر کیوں ہزار جان سے عاشق ہوئی تھیں اس خاکسار پر،!"

"خواب دیکھا ہوگا!" والدہ نے پھر چھالیہ کترنے کا شغل جاری کرتے ہوئے کہا، "ان پہ ہزار جان سے عاشق ہوگا کوئی؟!"

"میرا خیال تو ہے کہ اب بھی یہی جذبات والد صاحب کے عوض میں تھے، کیا میرا یہ خیال غلط ہے؟ ——— تمہیں ندیم کی قسم ہے سچ سچ کہنا ایمان سے!"

والدہ ہنسنے لگیں،

"اچھا تو ندیم کی شادی ——— ہٹو بھی، بے وقت کی شہنائی اچھی نہیں لگتی،

شاہدہ سے ہوگی؟"

والد نے کچھ سوچتے ہوئے، جواب دیا،

"تم جانو! ——— میں نے تو اپنی شادی بھی تمھاری ہی مرضی

سے کی تھی،،!"

والدہ کو پھر ہنسی آگئی، کہنے لگیں،

"بات بات پر تم اپنا قصّہ کیوں لے کر بیٹھ جاتے ہو؟ ——— میں

کہتی ہوں بیچاری شاہدہ میں اس کے سوا کیا عیب ہے کہ غریب ماں باپ کی لڑکی ہے،

لیکن شریف تو ہے، جو ہم سو وہ، اور میں تو کہتی ہوں غریب لڑکی سے شادی کرنا عقلمندی

ہے،!"

والد نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا،

"آج تو بھئی بڑے بڑے عجیب و غریب قسم کے انکشافات ہو رہے ہیں، اگر تم

راضی ہو، تو مجھے کوئی عذر نہیں شاہدہ ہی سے سہی، لڑکے کی شادی کر دو، لیکن، غریب

لڑکی سے شادی کرنا عقلمندی ہے یہ فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا،!"

والدہ نے سمجھاتے ہوئے والد سے کہا،

"وہ دبی رہے گی، فضول خرچی نہیں کرے گی، گھر پھونک تماشہ نہیں دیکھے

گی، نخرے نہیں کرے گی، سارا گھر سنبھال لے گی، اور پھر ثواب الگ،!"

والد نے طنز کرتے ہوئے کہا،

"ثواب الگ،! ——— واہ بھئی واہ، پھر تو ہم دونوں کو حج کا

ارادہ ملتوی کر دینا چاہئے اب ——— جب گھر بیٹھے ثواب مل رہا ہے،

تو سفر کی دشواریاں برداشت کر کے اسے کیوں حاصل کیا جائے، ؟"

پھر میں ویسے ہی دبے پاؤں اپنے کمرہ میں واپس آگیا، اب رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے، بستر پہ لیٹا مگر نیند غائب، رہ رہ کو دل میں خوشی کی لہریں اٹھتی تھیں، وہ جان آرزو، جسے نہ جانے کب سے دل کے مندر میں بٹھائے پوج رہا تھا، یوں، بغیر کسی زحمت کے حاصل ہو رہی تھی، والد کے انکار سے اندیشہ ہو رہا تھا کہ اگر شاہدہ کو حاصل کرنا ہے تو عاق ہونا پڑے گا، گھر چھوڑنا پڑے گا، عیش و راحت کی زندگی ترک کرنا پڑے گی، کہیں ملازمت کر کے آمدنی کا ذریعہ پیدا کرنا پڑے گا، ماں، باپ کے علاوہ اہل خاندان کی ناراضگی برداشت کرنا پڑے گی، عزیزوں، رشتہ داروں، اور دوستوں کے طنز و تعریض کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن ماں کی ممتا نے ان سب جھنجھٹوں سے بچا لیا، اب ہم ہیں اور عیش جاوداں، اور ہم عاشقی کے اس ہمارے صبر آزما پروگرام ہیں، یہ بات تو سوچی ہی نہیں کہ شاہدہ کی والدہ بھی ایک نالائق اور عاق شدہ لڑکے سے اپنی بیٹی کی شادی پر رضامند ہوں گی یا نہیں؟ ہو سکتا تھا، وہ انکار کر دیتیں!"

پھر کیا ہوتا؟

اللہ کا شکر ہے کہ اس حوصلہ فرسا امتحان سے نہیں گزرنا پڑا،

دل مطمئن ہو گیا، اور میں اڈڑ و لپیٹ کر لیٹ گیا، لیکن نیند کوسوں دور تھی، بار بار خیال شاہدہ کے کاشانے تک پہنچتا تھا، اس کی دل زیب صورت، نظر کے سامنے آجاتی تھی، وہی سحر طراز تبسم، وہی آفت جاں ادائیں، وہی دل کو موہ لینے والی باتیں!

آخر نہ جانے کب نیند آئی اور میں سو گیا، !"

شہلا نے ڈائری کا یہ ورق الٹا، پھر اسے بند کر کے ٹائپ رائٹر کی طرف متوجہ ہوئی، مگر دیکھتی کیا ہے، سر پہ کیفر آمن کھڑی ہے اسے دیکھ کر وہ چونک گئی، اس نے کہا،

"تم ہو، ؟ ــــــــــ میں تو ڈر گئی، نہ جانے کون اس طرح آ کر سر پہ کھڑا ہو گیا، !"

کیتھرائن ہنستی ہوئی پاس ہی بیٹھ گئی،

"کیا پڑھ رہی تھیں ؟"

شہلا گھبرا گئی، جیسے چوری پکڑی گئی ہو، کہنے لگی،

"کچھ بھی تو نہیں، !"

کیتھرائن نے ڈائری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا،

"یہ کیا ہے ؟"

شہلا نے جلدی سے ڈائری پھر بستہ میں رکھ لی، اور اسے بند کرتے ہوئے کہا،

"کچھ خانگی قسم کے کاغذات ہیں، ــــــــــ"

کیتھرائن نے ایک زوردار قہقہہ لگایا،

"خانگی قسم کے کاغذات، ــــــــــ مگر یہ تو ڈائری ہے، !"

شہلا اور زیادہ سہم گئی، پریشان ہو گئی،

"تم نہیں سمجھتیں، سمجھ ہی نہیں سکتیں، !"

کیتھرائن نے گھورتے ہوئے شہلا کا جائزہ لیا،

"لیکن اب تو کچھ کچھ سمجھ میں آتا جا رہا ہے، خیر، مجھے کسی کے رومان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، تم جانو اور تمہارا چاہنے والا، !"

شہلا پر گھڑوں پانی پڑ گیا، اس نے ہمگین انداز میں بے بسی سے کیتھرائن کی طرف دیکھتے ہوئے، اور گویا معافی مانگتے ہوئے کہا،

"ایسا نہ کہو کیتھرائن، اگر تم چاہو، تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو، ــــــــــ"

کیتھرائن ہنسنے لگی،

"اچھا پہلے اُردو پڑھنا سیکھ لوں پھر دیکھوں گی۔!"

اس نکتہ کی طرف شہلا کا ذہن ہی نہیں گیا تھا کہ کیتھرائن اردو سے بالکل نابلد ہے ورنہ اس قدر ہراساں اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ اب تو وہ شیر ہو گئی، اس نے کہا،

"تم جانتی ہو مجھے کسی سے محبت نہیں ہے، اور شاید ہو بھی نہیں سکتی۔ اور ہونا چاہیئے بھی نہیں، پھر یہ جرأت کیسے ہوئی تمھیں کہ میرے سامنے محبت کا چرچا کرو، ؟"

کیتھرائن نے بے پروائی سے کہا،

"جس دن یہ یقین ہو جائے گا کہ تم انسان نہیں ہو، اس دن واقعی تمھاری یہ ساری مہمل اور لایعنی باتیں مان لوں گی، لیکن جب تک تم انسان کے روپ نظر آرہی ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی یہ بات باور نہیں کی جا سکتی کہ نہ تمھیں کسی سے محبت ہے، نہ ہو سکتی ہے، نہ ہونی چاہیے، ——————— لیکن شہلا، اس گفتگو سے، اس ذکر سے پریشان کیوں ہوتی ہو، محبت انسانیت کا سب سے اونچا معیار ہے، وہ کون سی خوبی ہے جو تم میں نہیں؟ پھر تم سے بڑھ کر کون محبت کرنے، اور چاہے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے وقار نسائیت تمھیں کسی سے محبت کرنے کی اجازت نہ دے، حالانکہ میں اس کی قائل نہیں، لیکن، کم از کم، کسی دوسرے کو تو محبت کرنے سے تم نہیں روک سکتیں، ——————— روک سکتی ہو؟"

شہلا اس موضوع پر بالکل گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن کیتھرائن تو گویا پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئی تھی، شہلا کو خاموش دیکھ کر اس نے پھر چھیڑا،

"بتاؤ خاموش کیوں ہو گئیں؟ ——————— روک سکتی ہو کسی کو محبت کرنے سے؟"

شہلا نے، ٹائپ رائٹر کے بورڈ پر اپنی نرم و نازک انگلیاں رکھتے ہوئے کہا،

"کیتھرائن اسے کیوں بھولتی ہو کہ محبت، محبت سے پیدا ہوتی ہے، وہ اسی وقت پروان چڑھتی ہے، جب اس کا جواب بھی ملے۔ جب اس کا خیر مقدم بھی کیا جائے، لیکن، اگر میں، محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی، اگر میں اس کا خیر مقدم نہیں کر سکتی، تو پھر کون بے وقوف مجھ سے محبت کر کے اپنا وقت ضائع کرے گا؟"

کیتھرائن نے سوال کیا،

"لیکن اگر کرے، ؟ ——————— تب کیا کرو گی؟"

شہلا نے بڑی سادگی سے جواب دیا،

"یہ تو اسے سوچنا چاہیے، ! جو اس حماقت میں مبتلا ہو گا، !"

کیتھرائن بے تحاشہ ہنسنے لگی، پھر اس نے اس کی پیٹھ کو تھپکتے ہوئے کہا،

"بڑی شریر ہو، !"

اتنے میں روشن خاں صاحب تشریف لائے، اور کیتھرائن سے فرمایا،

"صاحب بلاتا ہے، !"

کیتھرائن نے کہا،

"ہم صاحب کا نوکر نہیں ہے، کہدو نہیں آئے گا، !"

روشن خاں یہی جواب دینے واپس چلے، کیتھرائن نے کہا،

"خاں صاحب، ہم صاحب کا نوکر ہے، ابھی جاتا ہے، تم بیٹھو، !"

اور پھر وہ ہنسی ہنسی چلی گئی، !*

پیام لے کر جائیں گی، ان کے جانے سے پہلے مجھے اپنا کام ختم کر لینا چاہیے، اگر وہ میری محبت کا جواب محبت سے دے سکتی ہے، تو ٹھیک، اور اگر نہیں دے سکتی تو پھر اپنے لیے، اپنی خوشی کے لیے، اپنے دل بے قرار کی تسکین کے لیے، ایک شریف اور معصوم لڑکی کی زندگی کیوں برباد کروں؟

یہ سوچ کر میں سیدھا شاہدہ کے ہاں پہنچا، خالہ بیچاری باورچی خانہ میں اپنے دھندے میں لگی ہوئی تھیں، شاہدہ اپنے کمرہ میں بیٹھی کوئی کتاب دیکھ رہی تھی، میں پہنچا تو مجھے دیکھ کر مسکرائی، پھر کرسی میری طرف بڑھاتی ہوئی گویا ہوئی،

"آیئے ——————— آج اتنے ناوقت کیسے آنا ہو گیا،؟"

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا،

"شاہدہ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں، اچھا ہے کہ خالہ اس وقت اپنے دھندے میں مصروف ہیں کیا کچھ وقت نکال سکو گی؟"

یہ سنکر شاہدہ کے چہرے پر ایک اضطراب کی سی کیفیت پیدا ہوئی، پھر اس نے مدھم آواز میں کہا،

"وقت کا کیا سوال ہے؟ آج تو کالج بھی نہیں جانا ہے، ——————— کہئے کون سی ضروری باتیں ہیں جو آپ کو غریب خانہ تک کھینچ لائیں ——————— ؟"

یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگی، اس تبسم میں حوصلہ افزائی بھی تھی، اور طنز بھی، میں نے کہا

"میری ان باتوں کا تعلق ہم دونوں کی زندگی سے ہے،!"

یہ سنکر وہ چونک پڑی، دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھا، پھر نظریں جھکا کر بولی،

(۴)

کبھی اُس نے اتنا وقت ضائع کیا کہ پھر ڈائری دیکھنے کا موقع نہ مل سکا، باقی وقت ٹائپ کرنے اور مسٹر جانسن سے دستخط کرانے اور ہدایت لینے میں صرف ہو گیا۔ جب سے ندیم گیا تھا، روشن خاں کو اس کی بڑی فکر رہتی تھی کہ ٹھیک وقت پر دفتر بند ہو جائے، چنانچہ ٹھیک وقت پر دفتر بند ہو گیا، اور شہلا شوق و انتظار کی پوٹلی بغل میں دبائے گھر پہونچی، یہاں بھی اس راز سربستہ کو عیاں کرنے کا موقع نہیں تھا، مجبوراً دوسرے مشاغل میں منہمک رہی،

دوسرے دن پھر حسب معمول دفتر پہنچی، آج صرف چار خط ٹائپ کرنے تھے، پہلے اُنھیں ٹائپ کیا، پھر ڈائری کھولی اور مطالعہ شروع کر دیا،

"یہ تو طے تھا کہ اب والد اور والدہ کو اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہیں ہے"!!

لیکن خود شاہدہ کو بھی اعتراض ہے یا نہیں؟ یہ بھی تو معلوم کرنا چاہیے، اب تک اس کے بارے میں جو رائے میں نے قائم کی تھی، وہ صرف میرے تخیلات کا نتیجہ ہے، خود شاہدہ کا عندیہ کیا ہے؟ اس کی رائے کیا ہے؟ وہ بھی میری رفیقہ حیات بننا چاہتی ہے یا نہیں؟ میرا فرض ہے کہ یہ حقیقت معلوم کر لوں، اور جلد از جلد یہ سراغ لگا لوں، دو ہی ایک روز کے اندر والدہ

کیا کوئی ایسی بات بھی ہو سکتی ہے جس کا تعلق وصرف آپ ہی کی زندگی سے نہیں میری زندگی سے بھی ہو سکتا ہو؟"

اس لطیف اعتراض کا جواب میرے پاس تیار تھا۔

"نہیں اصل تعلق تو اس کا میری ہی زندگی سے ہے،!"

"مگر کیا اس کا تعلق مجھ سے بھی ہو سکتا ہے؟"

"ہاں ہے شاہدہ،!"

شاہدہ کا چہرہ چمک اٹھا، وہ خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی، گویا پوچھ رہی تھی۔ "مجھے، کیا کہتے ہیں آپ؟"

میں نے اپنے حواس مجتمع کیے، اور کہا،

"شاید تم اسے پسند کرو گی، کہ گفتگو مختصر ہو اور صاف صاف !!"

وہ مسکراتی ہوئی بولی،

"یہ تو میں پسند نہیں کرتی،!"

میرا دل دھڑکنے لگا، میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا،

"کیوں شاہدہ؟"

ایک جاں نواز تبسّم کے ساتھ وہ گویا ہوئی،

"مجھے اگر کسی کی باتوں میں لطف آتا ہے۔ اگر کسی کی باتیں بھاتی ہیں تو آپ کی، اس لطف کو اگر آپ مختصر اور محدود کرنے پر آمادہ ہو جائیں، تو کم از کم اس میں میری پسند تو نہیں شامل ہو سکتی،!"

ان الفاظ نے میرے اندر ایک نیا ولولہ ایک نیا حوصلہ، ایک نیا جوش پیدا کر دیا، پہلی مرتبہ میں نے اسے گھور کر دیکھا، اس نے لجا کر آنکھیں نیچی کر لیں، میں نے کہا،

"شاہدہ، ایک خبر سنو گی، ـــــ؟"

وہ پھر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی، میں نے کہا،

"دو ایک روز میں میری والدہ یہاں، تمھارے ہاں آنے والی ہیں،!!"

یہ سنکر شاہدہ کا چہرہ تمتما اٹھا، وہ کچھ شرما سی گئی، واقعہ یہ ہے کہ عورت کو خدا نے ایک چھٹی حس عطا کی ہے، یہ حس محبت کی فطرت ہی کو نہیں محبت کے خیال کو بھی سن لیتی ہے، گرنت میں لے لیتی ہے، ایک مرد جب کسی عورت سے محبت کرتا ہے، تو اسے اندازہ بھی نہیں ہوتا، محبت میں نے آج کی ہے، لیکن بہت جلد میں محبت کرنے والا ہوں، یہ بات کافی پہلے اسے معلوم ہو چکی تھی، محسوس ہو چکی تھی۔ جس سے محبت کر رہا ہوں، شاہدہ کا چہرہ اس لیے تمتما اٹھا تھا کہ وہ جان گئی تھی کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں، اگرچہ آج تک، بلکہ اب تک یہ لفظ میرے منہ سے نہیں نکلا تھا، پھر بھی اس نے میری چوری پکڑ لی تھی، وہ سمجھ گئی تھی، والدہ کیوں آنے والی ہیں، پھر بھی اس نے نہایت بھولے پن سے سوال کیا ـــ

"کیا ایسی ان ہونی بات بھی ممکن ہے؟"

کتنا گہرا طنز تھا ان چند الفاظ میں، لیکن محسوس کرنے کے باوجود میں کچھ نہ کہہ سکا، کچھ نہ کر سکا، وہ سمجھ گئی تھی، شکار لاکھ پھڑپھڑائے اب قبضہ سے نکل نہیں سکتا، قبل اس کے کہ میں اس سوال کا جواب دوں وہ بولی

"شاید آپ مذاق کر رہے ہیں؟ بھلا ہم جیسے غریبوں کے ہاں وہ کیوں آنے لگیں؟"

مجھے والدہ کے وہ الفاظ یاد آ گئے، جو انھوں نے والد سے کہے تھے،

"غریب؟ ــــــــــــ جو ہم سوتم، غربت و امارت کا، آپس
میں کیا سوال پیدا ہوتا ہے، پھر دولت وہی تو نہیں ہے، جو سونے چاندی پر
مشتمل ہو!!"

وہ چونک سی پڑی، اس نے پوچھا،

"کیا کوئی دولت ایسی بھی ہوتی ہے، جو سونے چاندی سے الگ
ہو؟"

میں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ کہا،

"ہاں کیوں نہیں"؟!

گویا اسے یقین نہیں آیا، شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی ہوئی گویا
ہوئی،

"مثلاً" ــــــــ کیا آپ مثال دے سکتے ہیں؟"

میرے پاس مثالوں کی کیا کمی تھی،

"ہاں بہت سی مثالیں ہیں، ــــــــــ ایک دولت تو وہ ہے جو
سونے اور چاندی کی ہوتی ہے، ـــــــــــ"

"اور دوسری ــــــــــــ؟"

"دوسری وہ جو شرافت سے تعلق رکھتی ہے، حسن صورت، اور حسن
سیرت سے تعلق رکھتی ہے، ہنرمندی اور سلیقہ شعاری سے تعلق رکھتی
ہے ـــــــــــ"

وہ ہنسنے لگی،

"پھر تو ہم بھی دولت مند ہیں؟"

میں نے تائید کرتے ہوئے کہا،

"ہاں کیوں نہیں، تمہیں غریب کون کہہ سکتا ہے، تمہیں تو خدا نے وہ دولت دی ہے جو شاید ہی کسی کے پاس ہو"!

ایک مرتبہ وہ پھر ہنس پڑی کہنے لگی،

"شاید آپ یہ فیصلہ کر کے آئے ہیں کہ مجھے غریب بنائیں گے، اگر آپ اسی میں خوش ہیں، تو مجھے کوئی عذر نہیں، بنا دیجئے میں بننے کو تیار ہوں"!

میں نے دیکھا، موضوع گفتگو کہیں سے کہیں پہنچ گیا،

"شاہدہ تم نے میری بات تو سنی نہیں"!

"جی کہئے، سن تو رہی ہوں"!

"والدہ کا استقبال کرو گی تم خوشی سے؟"

"یہ پوچھنے کی کیا بات ہے ندیم بھیا، ———— وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے"!

پھر ہنستی ہوئی بولی،

"کبھی ہم ان کو دیکھیں گے، کبھی اپنے گھر کو دیکھیں گے"!

میں نے دیکھا بات پھر مذاق میں اڑی جاتی ہے،

"شاہدہ یہ بھی تو سن لو وہ کیوں آ رہی ہیں"؟

"یہ سننے کی کیا ضرورت ہے؟ ان کا گھر ہے آ رہی ہیں"!

"اچھا یہ سن لو کس حیثیت سے آ رہی ہیں؟"

"حیثیت کا کیا سوال؟ جس طرح اور جس حیثیت سے چاہیں آئیں ————"

"وہ ایک سوال لے کر آ رہی ہیں"!

بالکل انجان بنکر اس نے دریافت کیا،

"سوال لے کر آ رہی ہیں؟ ———— کیسا سوال؟"

میں نے سوچا، اب ٹال مٹول کا وقت نہیں، صاف صاف کہہ گزرا،

"شاہدہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، ———"

شاہدہ کا رنگ رخ بدل گیا، خون کی گردش تیز ہو گئی، اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن نہ کہہ سکی، پہلو بدل کر رہ گئی، لیکن میرا حوصلہ بلند تھا،

"شاہدہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، ——— چند روز ہوئے تم نے کہا تھا میں رخسانہ سے شادی کر رہا ہوں، ہاں یہ سچ ہے کہ والد، اور والدہ کی رائے یہی تھی، لیکن میں نے انکار کر دیا، میں نے والدہ سے صاف الفاظ میں کہہ دیا اگر آپ شاہدہ کو بہو بنا کر نہیں لا سکتیں تو آئندہ سے شادی کا نام میرے سامنے نہ لیجیے گا، شروع میں وہ جھلائیں خفا ہوئیں، روٹھیں بگڑیں، لیکن اکلوتے بیٹے کی ضد اور خودسری کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گئیں، انھوں نے میری بات مان لی، انھوں نے لڑ جھگڑ کر والد کو بھی راضی کر لیا"

شاہدہ تصویر حیرت بنی یہ باتیں سن رہی تھی، اور میں کہہ رہا تھا،

"اب دو چار دن میں وہ یہاں آئیں گی، تاکہ خالہ سے باقاعدہ تمھیں مانگ لیں، لیکن قبل اس کے کہ ان کے قدم اس گھر میں آئیں، میں تمھارا عندیہ معلوم کر لینا چاہتا ہوں،،!"

شاہدہ اب تک خاموش تھی نگاہیں نیچی، سر جھکا ہوا، دوپٹہ کا کونا انگلیوں میں لیے برابر اسے موڑے توڑے جا رہی تھی، میں نے سوال کیا،

"بتاؤ شاہدہ، کیا تم میری محبت قبول کر سکتی ہو، ؟"

شاہدہ کے چہرے کا رنگ پھر بدل گیا، شاید وہ بھی کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی، وہ بدستور خاموش تھی، مگر میں اڑا ہوا تھا کہ سوال کا جواب لے کر رہوں گا،

"شاہدہ جواب دو، ——— تمھارے جواب پر میری قسمت کا، میرے مستقبل کا، میری زندگی کا، زندگی کی راحتوں اور آسائشوں کا فیصلہ ہے، تمھاری ہاں مجھے ایک نئی زندگی عطا کر دے گی، تمھاری نہیں مجھے مایوسی اور محرومی کی دنیا میں پہنچا

دے گی، لیکن میں ہر طرح تیار ہوں، میں اپنے دل کو مضبوط کر کے آیا ہوں، تمہارا فیصلہ سن کر ہی جاؤں گا،،!"

لیکن اس نے تو شاید جیسے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی، آخر پھر میں نے جھنجھوڑا،

"شاہدہ خاموش کیوں ہو، میں تمہارا فیصلہ معلوم کرنا چاہتا ہوں، خواہ وہ کچھ ہی ہو؟،!"

وہ بے کل سی ہو گئی، اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں، بڑی مشکل سے اس نے کہا،

"میں ——————"

اور اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی،

میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا،

"کہو، کہو، کیا کہہ رہی تھیں ابھی تم؟"

وہ پھر چپ ہو گئی، اور میرے بجائے زمین کی طرف دیکھنے لگی، کچھ دیر تک سکوت طاری رہا پھر میں نے کہا،

بہت دیر ہو گئی، مجھے یہاں بیٹھے ہوئے، خالہ آئیں تو یہ نامناسب سی بات ہو گی، اب مجھے جانا چاہیے، کیا میں جاؤں؟"

وہ بولی، ..

"نہیں،،!"

میں نے پوچھا،

"بیٹھوں؟"

خفیف سا تبسم اس کے لب لعلیں پر ابھرا، اس نے کہا،

"ہاں بیٹھیے،،!"

میں نے سوال کیا،

"کیا میرے سوال کا جواب ملے گا؟"

وہ ایک ادائے خاص سے مجھے دیکھتی ہوئی بولی،

"وہ تو مل چکا، !"

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا،

"لیکن میں نے تو نہیں سنا، !"

اب اس کے خوبصورت چہرے پہ، شوخ سا تبسم نمودار ہوا، وہ کہنے لگی،

"بعض باتیں اتنی نازک ہوتی ہیں کہ الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتیں، صرف محسوس کی جا سکتی ہیں، میں جس طرح سے، جس اپنائیت سے اب تک آپ سے ملتی رہی ہوں، اگر اس سے آپ کچھ نہیں محسوس کر سکے تو پھر الفاظ کا استعمال بیکار ہے'، !"

مجھے نئی زندگی مل گئی ان الفاظ سے، میں جوش مسرت سے دیوانہ ہو گیا، بے ساختہ میرے منہ سے نکلا،

"شاہدہ، شاہدہ، !"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی،

"اب اماں آتی ہوں گی، واقعی آپ کو آئے ہوئے دیر ہو چکی ہے، —— —— لیکن ان سے ملتے ہوئے جائیے گا، ورنہ قدرتاً ان کے دل میں خیال ہو گا، آپ بالا بالا کیوں آئے، اور کیوں چلے گئے، ؟"

اتنے میں خالہ خود ہی آگئیں، میں انھیں دیکھ کر سٹ پٹا گیا، لیکن شاہدہ نے بات بنا لی،

"دیکھئے اماں ندیم بھیا سے میں کہہ رہی ہوں کہ کھانا تیار ہے کھا کر جائیے گا، مگر یہ نخرے کر رہے ہیں، !"

میں کرسی پر بیٹھ گیا،

"جھوٹ، ——— خالہ میں تو کہہ رہا تھا کھانا لاؤ، یہ کہہ رہی تھیں ہمارا گھر محتاج خانہ نہیں ہے، !"

خالہ نے ایک دو منٹ شاہدہ کے لگایا، اور کہا،

بے غیرت، !

پھر مجھ سے کہا،

"بیٹے: میں ابھی لائی کھانا تیرے لیے، !"

(۵)

ڈائری شہلا کے سامنے تھی اور وہ بڑے انہماک و استغراق سے پڑھ رہی تھی:-

"اب میں کتنا خوش ہوں

میرے ویرانے میں چاندنی اپنی بہار دکھا رہی ہے شاہد اس گھر میں میری مالک اور والدہ کی بہو بن کر آچکی ہے،

ہر روز میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے میری محبت میں کچھ اور اضافہ ہوتا جا رہا ہے، گزرے ہوئے کل پر جب ایک نظر ڈالتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے، کل بھی مجھے شاہدہ سے محبت تھی لیکن نہ اتنی جتنی آج ——— اور پھر یہ آج ماضی کے پردے میں روپوش ہو جاتا ہے، کل بن جاتا ہے، "گزرا ہوا کل"، اور میں آج کی سرمستیوں میں کھو جاتا ہوں، میرا ہر آج میرے ہر کل کے مقابلہ میں کتنا شاندار، کتنا جاں پرور، اور کتنا روح افزا ہوتا ہے،

ہر آج اس حقیقت کا پیامبر ہوتا ہے کہ میری محبت اور بڑھ گئی، اور بڑھ گئی،

ہر روز گزشتہ دن کے مقابلہ میں شاہدہ کا حسن بھی بڑھتا جاتا ہے، جب اس پر نظر پڑتی ہے معلوم ہوتا وہ اور زیادہ، کہیں زیادہ، بہت زیادہ حسین ہو گئی ہے!

جی چاہتا ہے ہر وقت اسی کے پاس بیٹھا رہوں، اسی سے باتیں کرتا رہوں، اسی کو دیکھتا رہوں، کیسی راحت ملتی ہے اس کے پاس بیٹھ کر، کیسی لذت ہوتی ہے اس کی باتوں میں، کیسا کیف محسوس کرتا ہوں اسے دیکھ کر،

میری دنیا صرف شاہدہ ہے، اسے پا کر میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے مجھے سب کچھ مل گیا، اب مجھے کسی چیز کی حسرت نہیں، آرزو نہیں، شوق نہیں،

میرا خیال تھا کہ میری محبت یک طرفہ ہے، صرف میں اسے چاہتا ہوں، لیکن زبان سے میاں کے ساتھ محبت کا اقرار نہ کرنے کے باوجود وہ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے، یہ میں جانتا ہوں میرا دل جانتا ہے،

دوستوں کی نگاہوں سے اب پہلو بچانے لگا ہوں، لیکن کبھی نہ کبھی گرفتار بھی ہو جاتا ہوں اور پھر رات کے گیارہ بھی بج جاتے ہیں، بارہ بھی، کبھی کبھی ایک بھی اور دو بھی، پرسوں ساجد اور اختر کے اصرار سے مجبور ہو کر تھیٹر دیکھنے چلا گیا، بڑی پبلسٹی ہو رہی تھی اس ڈرامہ کی، سارا شہر ٹوٹا پڑا تھا تھیٹر ہال پر، ساجد اور اختر نے میرا کوئی عذر نہ سنا، زبردستی لے گئے مجھے بھی جانا پڑا، سارا ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، یہ حاضرین ڈرامے کے شوق سے بے قابو ہو کر نہیں آئے تھے، انہیں اس زمرد کی کشش کھینچ کر لائی تھی، جس کے حسن عالم آشوب نے سارے شہر کو دیوانہ اور مفتون کر رکھا ہے، تالیاں اور سیٹیاں بجا بجا کر بے قراری کے ساتھ لوگ زمرد کا انتظار کر رہے تھے، آخر وہ آئی اور اس کے آتے ہی سناٹا چھا گیا سارے ہال پر، ساجد اور اختر کا تو یہ عالم تھا جیسے بے ہوش ہو جائیں گے، پلک جھپکانا بھی دشوار ہو رہا تھا، مگر میرا کیا حال تھا؟،

مجھے شاہدہ کے سوا اب کہیں حسن نظر نہیں آتا، اور اگر آتا ہے تو شاہدہ کی وجہ سے، جس حسن میں شاہدہ کی جھلک نہ ہو یا جو اپنے خصوصیات میں شاہدہ سے نسبت نہ رکھتا ہو اسے دنیا جو چاہے کہے مگر میں تو اسے حسن تسلیم نہیں کر سکتا،

پھول مجھے خوب صورت لگتے ہیں، اس لیے کہ وہ شاہدہ کے گالوں کی طرح خوبصورت ہوتے ہیں۔ مجھے نوشگفتہ کلیاں پسند ہیں، اس لیے کہ انھیں دیکھ کر شاہدہ کے لب لعلین یاد آجاتے ہیں،

صبح جب طلوع ہوتی ہے، کتنی سہانی اور کتنی دل کش ہوتی ہے، مجھے صبح کا حسن بہت عزیز ہے، اس لیے کہ اس میں وہی تقدس، وہی رعنائی اور وہی پاکیزگی ہے جو شاہدہ کے وجود میں،

میں نے زمرد کو دیکھا، ایک کوفت سی طاری ہوگئی مجھ پر، اس کے تبسم میں مکر ہے، اس کی ادائیں دھوکا ہیں، اس کا اظہار وفا فریب ہے، اس کا وہ لبادۂ شرافت جعل سازی کا ہے، جو اسٹیج پر وفاداری کا سوانگ رچاتی ہے۔ لیکن بازار حسن میں اپنے حسن کی مختلف لوگوں سے ہر روز قیمتیں وصول کرتی ہے، جو حسن آوارہ ہو، خود غرض ہو، فریب کار ہو، حریص اور طماع ہو، وہ قابل نفرت ہے،

خود بخود میری آنکھوں کے سامنے شاہدہ کا پیکر ناز جلوہ گر ہوگیا،

لوگ زمرد کے حسن بلاخیز پر پروانہ وار فدا ہو رہے تھے، میری آنکھوں کے سامنے شاہدہ کھڑی تھی، جس کے تبسم میں شوخی اور معصومیت کا امتزاج اس شان سے ہوتا ہے کہ دل قابو میں نہیں رہتا، جس کی ادائیں جاں ستاں ہیں تو روح پرور بھی، جو اپنے حسن کی قدر و قیمت سے واقف ہے، لیکن اپنے محبت کرنے والے کو بے وقوف نہیں بناتی، لوٹتی نہیں، دھوکا نہیں دیتی، کتنا تقدس ہے اس حسن معصوم میں،

مجھے نہیں معلوم تھیٹر کب ختم ہوا، سب لوگوں کے ساتھ میں بھی باہر چلا آیا، ساجد اختر کی تشخیص یہ تھی کہ میری اس خاموشی کا راز یہ ہے کہ زمرد نے مجھے اپنا اسیر زلف کر لیا ہے، بڑی دیر تک دونوں مجھے بناتے رہے، میں نے حقارت سے ان دونوں

کو دیکھا اور خاموش ہوگیا، یہ بیچارے کیا جانیں محبت کیا چیز ہے، عشق کسے کہتے ہیں !،

بڑی مشکل سے دو بجے ان سے پیچھا چھڑا کر گھر واپس پہنچا، راستہ بھر شاہدہ کا تصور میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا، میں سوچ رہا تھا وہ خواب ناز میں مصروف ہوگی، میں دبے پاؤں کمرہ میں قدم رکھوں گا، اس کی پیشانی پہ بوسہ دوں گا، آہستہ سے تاکہ اس کی نیند میں خلل نہ پڑے، پھر سو جاؤں گا،

لیکن یہ کیا ؟،

وہ تو جاگ رہی ہے،

میں ڈرتا ہوا اندر پہنچا، آج خیریت نہیں، وہ ایک آرام کرسی پہ دراز، بظاہر کسی کتاب کے پڑھنے میں مصروف تھی، میں آہستہ آہستہ اس کے پاس گیا، اس کی ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھ کر پیار بھرے لہجہ میں سوال کیا،

" شاہدہ تم اب تک جاگ رہی ہو ؟ "

اس نے کتاب ایک طرف ٹپک دی اور اٹھ کھڑی ہوئی، اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، میں نے پوچھا،

" کیا بات ہوئی ؟ رو کیوں رہی ہو ؟ "

اس نے آنسو پونچھ لیے اور کہا،

" اب تک کہاں تھے آپ ؟ "

میں نے جواب دیا،

" ساجد اور اختر کے پھندے میں پھنس گیا تھا "

اس نے شکایت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور سوال کیا،

" دوستوں کے ساتھ رنگ رلیاں کرتے وقت یہ بات بھی تو یاد رکھا کیجیے، کہ کوئی آپ کا انتظار کر رہا ہے "

میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا،
" لیکن تم سو کیوں نہیں گئیں، کس نے کہا تھا تم کو انتظار کرنے کو "
وہ روٹھے ہوئے انداز میں بولی،
" واقعی غلطی ہو گئی، کسی نے بھی تو مجھ سے انتظار کرنے کو نہیں کہا تھا، کتنی بڑی حماقت ہوئی مجھ سے، اب ایسی غلطی کوشش کروں گی کہ نہ ہو "
میں نے خوشامد کرتے ہوئے کہا،
" تم تو خفا ہو گئی شاہدہ "
اس نے اسی لہجہ میں جواب دیا،
" اگر میری خوشی کی پروا آپ کو ہوتی تو یوں مجھے سولی پر لٹکانا آپ کو گوارا نہ ہوتا "

میں حیرت سے دو قدم آگے بڑھا، میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا،

" شاہدہ تم کیوں اتنی پریشان نظر آ رہی ہو؟ "
وہ اسی طرح کھڑے کھڑے بولی،
" احمق جو ٹھہری، اگر آپ نے اطلاع بھیج دی ہوتی کہ دیر سے آئیں گے یا مجھ سے کہہ گئے ہوتے تو بے شک میرا اضطراب بے جا ہوتا، میں نے گیارہ بجے تک آپ کا انتظار کیا، اس کے بعد بھی آپ نہ آئے تو اندیشے اور وسوسے پیدا ہونے لگے، کہیں خدا نخواستہ کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو، کوئی بات نہ ہو گئی ہو،
میں نے محبت اور عقیدت کی نظروں سے اپنی شاہدہ کو دیکھا اور اس سے کہا،
" اب ایسی غلطی نہ ہو گی، معاف کر دو "
وہ مسکرانے لگی، گویا اس نے معاف کر دیا، میں خوش ہو گیا، اتنے میں دیکھتا

کیا ہوں کہ جناب شاہدہ صاحبہ ریفریجریٹر کھول رہی ہیں، حیرت تو ہوئی لیکن خاموش رہا، دیکھوں پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے، جلدی جلدی شاہدہ نے کھانا نکالا، اب میرے لیے خاموش رہنا ممکن نہ رہا، میں نے کہا،

"شاہدہ تکلیف نہ کرو، میں کھا چکا ہوں"

بدستور اپنی مشغولیت جاری رکھتے ہوئے وہ بولی،

"لیکن مجھے تو سخت بھوک لگی ہے،

میں چونک پڑا،

"ارے!، تم اب تک بھوکی ہو؟، کھانا نہیں کھایا تم نے؟"

ہنسنے لگی،

"نہیں!، آپ کے بغیر کس طرح کھا لیتی"

شاہدہ نے مجھے پھر شکست دی، میں شرمندہ ہو گیا، بات بدلتے ہوئے میں نے کہا،

"اگر اجازت دو تو ساتھ دینے کے لیے میں بھی بیٹھ جاؤں؟"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دروازہ زور سے کھلا اور ہمارے گھر کی ملازمہ صغرا کا لڑکا ننھے ہانپتا کانپتا پسینہ میں شرابور اندر گھس آیا، اس نے مجھے نہیں دیکھا اور شاہدہ سے کہنے لگا،

"میں تو ہر جگہ دیکھ آیا، مجھے تو کہیں نہیں ملے، جہاں جاؤ یہی کہتے ہیں، یہاں تو نہیں آئے تمہارے صاحب!"

میں نے وہیں سے کھڑے کھڑے ڈانٹا،

"ابے اندھے، دیکھتا نہیں اور کہاں کیے چلا جا رہا ہے"

اب اس نے مجھے دیکھا، میں نے پوچھا،

"کہاں کہاں گیا تھا؟"

اس نے میرے دوستوں کی اتنی لمبی چوڑی فہرست سنائی اور وہ بھی اتنی فرفر کہ کیا کسی ریستوران کا چست و چالاک بیرا اپنے ہوٹل کے پکے ہوئے کھانوں کی فہرست سنائے گا، میں حیرت سے اس کا آموختہ سنتا رہا، پھر پوچھا،

"اتنی جگہوں کا پتہ تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

نھے نے مجھے لاجواب کر دیا، کہنے لگا،

"بیگم صاحب کو جب میاں نے پریشان دیکھا تو مجھ سے کہا کہ جاؤ اپنے صاحب کو ڈھونڈ لاؤ، غالباً انور میاں کے ہاں ہوں گے، انور میاں کا گھر قریب ہی ہے پانچ منٹ میں وہاں پہنچ گیا، وہ کہنے لگے، یہاں تو وہ شادی کے دن سے آج تک نہیں آئے، شاید رضا صاحب کے ہاں گئے ہوں، میں نے پوچھا رضا صاحب کہاں رہتے ہیں؟ کہنے لگے ناک کی سیدھ پر سیدھا چلا جا، وہاں سے داہنے ہاتھ کو مڑ جائیو، پھر ایک چوراہا ملے گا، وہاں سے بائیں ہاتھ کو مڑ جائیو، پھر ایک چوک نظر آئے گا، ساتویں نمبر کا مکان رضا صاحب کا ہے، وہاں شطرنج کھیل رہے ہوں گے، کوئی میل بھر کے بعد چوراہا آیا، پھر بڑی مشکل سے چوک تک پہنچا، وہاں جا کر مکان کا نمبر بھول گیا، کئی مکانوں پر گیا آخر ایک مکان میں رضا صاحب مل گئے میں نے پوچھا ہمارے صاحب آئے تھے؟، مجھے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا، پھر پوچھا، کن صاحب کو پوچھ رہا ہے؟ میں نے آپ کا نام لے دیا، بڑے زور کا ٹھٹھا لگایا، پھر بولے، اچھا یہ بات ہے؟ میرا خیال ہے یوسف صاحب کے ہاں تاش کی محفل جمی ہوگی اور وہیں وہ دوسروں کے پتے دیکھ دیکھ کر جیت رہے ہوں گے ——"

میں نے ڈانٹا،

"کیا بکتا ہے؟"

شاہدہ نے مسکراتے ہوئے ننھے سے کہا،

"داستان بڑی دلچسپ ہے سناتے جاؤ، ہاں پھر؟"

ننھے نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا،

"میں نے پوچھا یوسف صاحب کہاں ملیں گے؟ وہ بولے اپنے گھر میں! میں نے سوال کیا، ان کا گھر کہاں ہے؟ کہنے لگے جہاں وہ رہتے ہیں! میں نے پوچھا وہ کہاں رہتے ہیں؟ کہنے لگے جہاں ان کا گھر ہے! ———"

مجھے ہنسی آ گئی، میں نے کہا،

"بڑا مسخرا ہے یہ شخص بھی، ———"

شاہدہ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا، ننھے سے پوچھا،

"چپ کیوں ہو گئے؟"

ننھے نے پہلے مجھے دیکھا، پھر شاہدہ کو، اس کے بعد بولا،

"رضا صاحب کے پاس ایک اور صاحب کھڑے تھے وہ کہنے لگے، یار کیوں پریشان کرتے ہو لڑکے کو، پھر مجھ سے کہا، دیکھو وہ سامنے بڑا سا درخت ہے نا، اس سے آگے چلے جانا، کسی گھر میں بھی یوسف صاحب کا نام لے کر پکارو گے وہ فوراً نکل آئیں گے، میں درخت کے پاس پہنچا، پھر دو تین گھر چھوڑ کر ایک گھر کی کنڈی کھٹکھٹائی، ایک صاحب آنکھیں ملتے ہوئے باہر آئے، کہنے لگے کیا ہے؟ میں نے پوچھا، یوسف صاحب ہیں؟، جواب دینے کے بجائے پیچھے ہٹ کر زور سے دروازہ بند کر لیا، پھر دو تین گھر چھوڑ کر ایک گھر میں میں نے دستک دی، ایک بڑے میاں لالٹین لیکر باہر نکلے، مجھ سے پوچھا کچھ نہیں، غور سے میری طرف دیکھنے لگے، میں نے کہا ذرا یوسف صاحب کو بھیج دیجیے، وہ آگے بڑھ آئے، پھر مجھ سے پوچھا، یوسف صاحب سے ملنا چاہتے ہو؟، اس وقت ایک بجے رات کو تمھیں معلوم ہے یوسف صاحب اسی گھر میں رہتے ہیں؟

(۶)

شہلا کے سامنے ڈائری کھلی ہوئی ہے'':

مجھے ملیریا ہو گیا، ٹمپریچر ۱۰۵ تک پہنچ گیا، غفلت اور بے چینی طاری تھی، بار بار انجکشن لگتے، دوائیں دی جاتیں، مگر سکون نہ آتا، ایک روز تو ٹمپریچر ۱۰۵ سے بھی بڑھ گیا، مجھ پر نیم ہذیانی کیفیت طاری تھی،!

نہ جانے کب تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ یکایک آنکھ کھل گئی، سامنے گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی، اس پہ نظر گئی، تو رات کے تین بج گئے تھے،!

پھر میں نے دیکھا، شاہدہ میرے پاؤں اپنی گود میں پاشویہ کر رہی ہے، چہرہ زرد، آنکھیں پرنم، بال بکھرے ہوئے، میں اس منظر کی تاب نہ لا سکا، اٹھنا چاہا، اس نے اسی طرح لٹا دیا،

"ارے ارے یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ —— لیٹے رہیے،!"

میں نے بے قرار ہو کر پوچھا،

"تم یہ کیا کر رہی ہو؟"

مختصر سا جواب دیا،

"پاشویہ —— بخار بہت بڑھ گیا تھا، ننھے کو ڈاکٹر کے ہاں بھیجا، وہ آیا تو اس نے کہا، ماتھے پر برف رکھو، اور پاشویہ کرو، پھر صبح آکر اگر ضرورت

ان کی یہ باتیں سن کر میں پیچھے ہٹا، انھوں نے گہار مچا دی، "چور، چور، چور، پکڑنا جانے نہ پائے"، اب تو میں پاؤں سر پر رکھ کر بھاگا، مجھے بھاگتے دیکھ کر کئی آدمی میرے پیچھے دوڑے، لیکن مجھے کیا پا سکتے تھے! ہوا ہو گیا، وہیں سے بھاگا بھاگا آرہا ہوں"

شاہدہ کھانا کھا چکی تھی، اس نے پرس کھول کر پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اسے دیتے ہوئے کہا

"شاباش، بڑے کام کے لڑکے ہو، لو، یہ تمھارا انعام ہے"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی،

"دیکھئے اب تک بے چارے کا سانس پھول رہا ہے، آپ بھی اسے انعام دیجیے ——— دعا دے گا"

میں نے دس روپے کا نوٹ جیب سے نکالا اور ننھے کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑے ادب سے کہا،

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

نوٹ لے کر اس نے پوچھا،

"کیا لاؤں!"

شاہدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، اس نے کہا،

"کچھ نہیں جاؤ، اب سو رہو جا کر، انھیں تو ایسی ہی باتیں سوجھا کرتی ہیں ———"

شہلا نے ڈائری بند کی، ایک ٹھنڈی سانس لی، پھر اپنے کاغذات سنبھالے، دفتر بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا، جلدی جلدی مسٹر جانسن کے کمرہ میں پہنچی کہ ضروری کاغذات پر دستخط کرا لے۔

ہوئی تو کوئی اور دوا تجویز کروں گا ، بیچاری اماں (میری والدہ) رات کے گیارہ بجے تک برف کی پٹیاں رکھتی رہیں، میں پاشویہ کرتی رہی، بخار ذرا ہلکا ہو گیا، تو میں نے اصرار کر کے انھیں سونے کے لیے بھیج دیا، میں بھی بستر پر لیٹ گئی، بڑی دیر تک تو نیند نہ آئی، پھر ذرا آنکھ لگی تھی کہ بڑے دردناک طور پہ آپ کراہے، میں جلدی سے اٹھی ٹمپریچر لیا، تو بخار پھر اپنی جگہ موجود تھا، اماں بیچاری کو جگانا مناسب نہ سمجھا خود ہی پاشویہ کرنے بیٹھ گئی" !

میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا،

"اب کیا وقت ہے؟"

اس نے منہ پھیر کر گھڑی کی طرف دیکھا، پھر انداز حیرت سے بولی،

"ارے تین بج گئے، !"

میں نے بے چینی کے ساتھ پوچھا،

"تم اب تک پاشویہ کیے جا رہی ہو؟"

وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوئی،

"تو کیا ہوا اب طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا،

"کچھ اچھی ہی معلوم ہوتی ہے، ذرا ٹمپریچر تو لو، !"

وہ لپک کر اٹھی، تھرمامیٹر جھٹکا، پھر میرے منہ سے لگا دیا، ایک منٹ تک کھڑی رہی، پھر اسے دیکھا، تو خوشی سے تقریباً چیخ پڑی، کہنے لگی،

۹۹ ہے، ——— میرے اللہ، میں کتنا ڈر گئی تھی، جب ۱۰۵ سے بھی کمبخت بخار بڑھ گیا تھا، !

میں نے دلاسا دیتے ہوئے، اور ذرا چھیڑتے ہوئے کہا،

"بڑی بزدل ہو،!"

اس نے اس کمزوری کا اعتراف کر لیا،

"ہاں، ـــــــــــ صرف آپ کی حد تک، ورنہ اپنی ذات کے لیے نہ

بیماری سے ڈرتی ہوں، نہ موت سے،!"

میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا،

"ایسی احمقانہ باتیں نہ کیا کرو، ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بزدل ہیں،!"

پھر میں نے رحم بھری نظروں سے اس کے تھکے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے

جو گیارہ بجے سے اب تک مسلسل میرا پاشویہ کیے جارہے تھے، کہا،

"اب تم بھی آرام کرو، کافی رات گزر گئی ہے،!"

اپنی مشغولیت جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا،

"ابھی نہیں ـــــــــــ"

میں اس بے تکے جواب پر جھلا گیا، میں نے کسی قدر سخت ہو کر پوچھا،

"پھر کب؟"

نہایت سادگی اور معصومیت کے ساتھ وہ گویا ہوئی،

ساڑھے اٹھانوے ہو جائے تب،!

میں نے اپنے پاؤں کھینچ لیے، اور بولا،

"اب تو ۹۵ ہو گیا ہے،!"

وہ سہم گئی، اس کی آنکھیں پھر آب گوں ہو گئیں، اس نے لرزتی ہوئی آواز میں

کہا،

"خدا نہ کرے، آپ کی یہ عادت کیا ہے جو منہ میں آیا، بک دیا،

واہ،!"

پھر میرے سمٹے ہوئے پاؤں اپنی طرف کھینچتی ہوئی بولی،

"جب تک نارمل نہ ہو جائے میں اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کروں گی،!"

میں خاموش ہو گیا، وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی، گھڑی نے ساڑھے تین بجائے، میں نے کہا،

"مجھے پسینہ آ رہا ہے، ذرا ایک مرتبہ ٹمپریچر پھر سے تو لینا،!"

وہ مستعدی سے اٹھی، پھر ایک مرتبہ اپنے دست نازک سے اس نے تھرمامیٹر جھٹکا، اور میرے منہ سے لگا دیا، ذرا دیر کے بعد، خوشی سے بے قابو ہوتی ہوئی بولی،

"ہاں اب ٹھیک ہے، اب ہو گیا نارمل،!"

میں نے پھر پاؤں سمیٹ لیے، اور کہا،

"اب تو سو رہو ذرا دیر،!"

جمائی لیتی ہوئی اٹھی اور اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی، مشکل سے چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اٹھ کھڑی ہوئی، میں نے پوچھا،

"ارے کیا بات یاد آ گئی،!"

وہ تولیہ لے کر میری طرف بڑھتی ہوئی بولی،

"آپ کا پسینہ تو پونچھ دوں،!"

میں انکار نہ کر سکا، بلکہ اس الہام پر دل ہی دل میں خوش ہوا، یہ فرمائش کرنے کا خود میرا بھی جی چاہ رہا تھا، کیونکہ پسینہ اتنا زیادہ آیا تھا کہ میں گویا نہا گیا تھا، لیکن خاموش اس لیے تھا کہ بیچاری رات بھر کی جاگی ہوئی تھی کہاں تک اس سے کام لیے جاتا، لیکن اللہ نے خود ہی اس کے دل میں بات ڈال دی، وہ تولیہ لے کر میرے پاس آئی، جیسے ہی میرے بدن کو ٹٹولا، کہنے لگی،

"آپ تو جیسے نہا گئے ہیں پسینہ میں، ------"

میں نے جواب دیا،

"ہاں، نہ جانے اتنا پسینہ کہاں سے آگیا، !------

وہ تولیہ وہیں رکھ، پھر اٹھ کھڑی ہوئی، اور ملحقہ کمرے میں گھس گئی، کواڑ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنکر میں چونکا، اور دل میں کہنے لگا، کچھ دماغ چل گیا ہے اس عورت کا، نہ جانے مجھے اس حال میں چھوڑ کر وہاں کیا کرے گی جاکر، ؟ جی چاہا، آواز دوں، اتنے میں وہ خود ہی آگئی، پہلے تو اس نے جلدی جلدی میرے سامنے کی کھڑکیاں بند کیں، پھر میرے سرہانے بیٹھ کر، جلدی سے قمیص اور بنیان اتاری، پھر تولیہ سے خوب اچھی طرح پسینہ پونچھ کر، دوسری بنیان اور قمیص پہنا دی، پھر پاجامے میں کمر بند ڈال کر میری طرف بڑھایا، اور ہدایت کی کہ لیٹے لیٹے پہن لیجیے، میں نے اس حکم کی تعمیل کی، میرے اترے ہوئے کپڑوں کو ہاتھ میں لے کر کہنے لگی،

اُفوہ ------ نچوڑے جائیں تو بالٹی بھر پسینہ نکلے گا، ان میں سے، ! "

پھر انہیں میلے کپڑوں میں ڈال کر دوسرا دھلا ہوا تولیہ لے کر آئی، اور خوب اچھی طرح میرے ماتھے، گردن، سینہ، بازو اور پیٹھ کا پسینہ پونچھا، پھر پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کہنے لگی،

"بس اب سو جائیے، ! "

پھر وہ بھی جاکر اپنے بستر پر لیٹ گئی، !

وہ سو گئی، لیکن میں جاگ رہا تھا، اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہا تھا، یہ صرف میری محبوبہ نہیں مسیحا بھی ہے، !

اگر حد سے زیادہ کمزور نہ کر دیا ہوتا اس بخار نے، تو اٹھتا، اور اس سوتی ہوئی

شاہدہ کے دست سیمیں کو آنکھوں سے لگاتا، پیار کرتا، چومتا، ان ہاتھوں نے جو صرف اس لیے تھے کہ میرے گلے کی زینت بنیں آج کتنا دکھ سہا تھا، کتنی تکلیف اٹھائی تھی، تھک گئے ہوں گے یہ ہاتھ، کاش میں انھیں دبا سکتا، سہلا سکتا،!

نہ جانے کب تک اسی طرح کی شاعرانہ باتیں سوچتا رہا، پھر نہ جانے کب آنکھ لگی اور سو گیا،

کچھ خواب اور کچھ بیداری کا عالم تھا کہ کسی نے میرے پاؤں کے انگوٹھے کو دبایا آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں، مسیحا سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے، میں نے کروٹ لے لی، اور پھر آنکھیں بند کر لیں، وہ گویا ہوئی،

"کچھ خبر بھی ہے آٹھ بج گئے ——— کب تک سوتے جائیں گے آپ، ڈاکٹر صاحب کا فون آیا ہے، وہ آ رہے ہیں ——— "

میں نے ویسے ہی آنکھیں بند کیے کیے، کہا،

"انھیں فون کر دو کہ نہ آئیں، میں اب اچھا ہوں،!"

وہ ہنسنے لگی،

"واہ یہ بھی اچھی کہی، ڈاکٹر صاحب آئیں گے، اور، اگر آپ برا نہ مانیں تو صاف صاف کہہ دوں، انجکشن بھی لگائیں گے، ایک بہادر آدمی کی طرح تیار ہو جائیے، انجکشن کی سوئی کا ننھا سا گھاؤ کھانے کے لیے،!"

میں نے آنکھیں کھول دیں، اور شکوہ آمیز لہجہ میں گویا ہوا،

"کیوں پریشان کر رہی ہو شاہدہ، میں بہت کمزور ہو گیا ہوں، بہت زیادہ،!"

برش پر ڈنٹل کریم لگا کر میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی،

"اس کا علاج تو انجکشن کرے گا ——— لیجیے دانت

صاف کر لیجیے، !"
میں اٹھ کر بیٹھ گیا، جلدی جلدی برش کے دو تین ہاتھ مارے، ننھا سلیفچی
لیے پاس کھڑا تھا وہ آگے بڑھا، میں نے کئی کلیاں کر ڈالیں، پھر شاہدہ آگے بڑھی،
اس کے ہاتھ میں بہت سا صابن لتھپا ہوا تھا، وہ ہاتھ اس نے میرے منہ پر پھیر دیا،
اور شوخ لہجہ میں بولی،

"آنکھیں بند رکھیے گا، ورنہ مرچیں لگیں گی، !"

آنکھیں میں نے پہلے ہی بند کر لی تھیں اب اور زیادہ زور سے بند کر لیں
کیونکہ صابن ملا ہوا کچھ پانی واقعی آنکھوں میں پہنچ کر پریشان کرنے لگا تھا، اس
نے خوب رگڑ رگڑ کر پہلے میرے ہاتھ صابن سے دھونا شروع کر دیے،
میں نے اعتراض کیا،

"یہ کیا تماشہ ہے، منہ پر صابن لتھپا ہوا ہے، میں اندھوں کی طرح آنکھیں
بند کیے بیٹھا ہوں، اور تم پہلے ہاتھ دھلا رہی ہو!"

میں دیکھ تو نہ سکا، لیکن کانوں میں اس کے ہلکے نقرئی قہقہہ کی آواز آئی،
کہہ رہی تھی،

"لیجیے، ——————"

اور پھر میرے منہ پر تابڑ توڑ کئی چھپاکے پانی کے مارے، پھر خوب اچھی
طرح تولیہ سے منہ صاف کیا، اور حکم دیا،

"اب آنکھیں کھول دیجیے، !"

میں نے آنکھیں کھول دیں وہ ایک نرس کی طرح تولیہ ہاتھ میں لیے کھڑی
تھی اور مسکرا رہی تھی، مگر میں اس وقت خوش طبعی کے موڈ میں نہ تھا، میں نے
کہا،

"خوب اچھی طرح ستالو، جی بھر کے، کسر رہ نہ جائے، !"
وہ ہنسنے لگی، اس نے ننھے سے کہا،
"جاؤ، جلدی سے چائے لیکر آؤ صاحب کے لیے، !"
وہ سلیقی، لوٹا، تولیہ سب چیزیں لے کر چلا گیا، اور ذرا دیر میں، میرے اور شاہدہ کے لیے چائے لے کر آ گیا، پیالی میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی،
"لیجیے، ——— پھر ڈاکٹر سے پوچھ کر، کوئی اور چیز دی جائے گی آپ کو، !"

میں نے پیالی پرے کھسکاتے ہوئے کہا،
"پھر چائے بھی اس سے پوچھ کر دینا، ——— نہ جانے کتنے فاقے گزر چکے ہیں، اور تم صرف چائے پر ٹرخا رہی ہو، !" ———
بڑا اچھا وقت سوچھا ہے مذاق کے لیے، ——— شکریہ، !"
وہ سِکے ہوئے سلائس میرے سامنے رکھتی ہوئی بولی،
"آپ تو خفا ہوئے جاتے ہیں، اچھا لیجیے، فی الحال اس پر قناعت کیجیے، ——— !"

وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے لگی، اتنے میں والدہ آ گئیں، اور مجھے بیٹھا، اور چائے پیتا دیکھ کر پھول کی طرح کھل گئیں، آتے ہی بلائیں لیں، اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا،
"کیسا ہے میرے چاند، !"
قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دوں شاہدہ نے کہا،
"بہت بھوکے ہیں، اس لیے بہت غصے میں ہیں، ———"
پھر مجھے شوخ نظروں سے دیکھ کر مسکرائی، اس کے بعد والدہ سے کہنے

گی،

"اماں جی، رات آپ کے جانے کے بعد بخار پھر لوٹ آیا تھا، !"

والدہ نے سہم کر مجھے دیکھا، پھر پوچھا،

"سچ ——————؟"

وہ بولی،

"جی ہاں، —————— ۱۰۵ سے بھی آگے بڑھ گیا تھا، ! میں نے وہی پاشویہ والی ترکیب پر عمل کیا، تب جاکر کہیں تین بجے کے بعد اترا، —————— !"

والدہ نے اسے گلے سے لگا لیا، فخر اور محبّت کی نظروں سے اپنی بہو کو دیکھتی ہوئی بولیں،

"میں قربان، —————— میری بچّی، ——————!!"

میں نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا،

"وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو میرے دل کی ترجمانی کر سکیں، ؟ لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمھارے حسن میں، رعنائی میں زیبائی میں، جاذبیت میں، کچھ اضافہ ہو گیا ہے، جیسے تم وہ نہیں ہو، جو اب تک تھیں، اب کچھ اور چیز بن گئی ہو، تمھارا حسن ہمیشہ سے لاجواب تھا، لیکن آج ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے ——————"

شاید میں ابھی کچھ اور کہتا، لیکن اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، اور گویا ہوئی،

"بس بس بیا زیادہ تکلیف نہ کیجئے، ——————

پھر مسکراتی ہوئی بولی،

"اگر اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں ؟"

میں سوچنے لگا یہ کیا عرض کرے گی ؟ ضرور کوئی خاص بات ہے، کچھ اشتیاق، کچھ اضطراب کے ساتھ پوچھا،

"کیا واقعی، مجھ سے کچھ کہنے کے لیے، پہلے اجازت لینے کی ضرورت ہے ؟"

اس سوال کا جواب اس نے کچھ نہیں دیا، اپنے دل آویز تبسّم کی بجلیاں گراتی ہوئی بولی،

"آج وہ بھی آئی تھیں، !"

پھر خود ہی پوچھنے لگی،

"بتایئے کون آیا تھا ؟"

میں اس عجیب و غریب خبر، اور اس عجیب و غریب سوال سے چکرا گیا،

(۷)

ندیم کی ڈائری کھلی ہوئی ہے، اور شہلا دنیا و مافیہا سے بے خبر، ورق پر ورق الٹتی چلی جا رہی ہے، :

"آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ تھی، میں نے یہ تقریب بڑے اہتمام سے منعقد کی، مردانے میں میرے تمام دوست احباب مدعو تھے، زنان خانے میں شاہدہ کی تمام سہیلیاں، اور ہماری رشتے دار عورتیں جلوہ فرما تھیں، رات کے بارہ بجے تک وہ دھما چوکڑی مچی ہے کہ خدا کی پناہ، اس مدت میں، مشاعرہ بیت بازی، مدح، ہجو، لطیفے، نہ جانے کیا کیا ہوتا رہا، وقت بڑی دلچسپی سے کٹا، آخر مہمان رخصت ہوئے، اور ہم دونوں پھر اپنے الفت کدے میں پہنچ گئے، شاہدہ ویسے ہی کیا کم حسین ہے، لیکن آج کے زرکار ملبوسات اور زر نگار زیورات نے تو اسے واقعی شہزادی بنا دیا تھا، اس کے حسن جلوہ ریز پر آنکھ کا ٹھہرنا محال تھا، میں نے کہا،

"شاہدہ آج تو تم نہ جانے کیا نظر آ رہی ہو، ؟"

وہ مسکراتی ہوئی میرے پاس آکر بیٹھ گئی، اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگی،

"کیا ہو گئی ہوں ؟ —— بتایئے، !"

میں نے پوچھا،

"افسوس، غیب کی باتیں میں نہیں جانتا اور شاید میں نے اس طرح کا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا؟ لہٰذا وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں بتا دو کون آیا تھا؟"

شاہدہ نے مجھے چھیڑتے ہوئے بتایا،

"وہ آئی تھیں ———— رخسانہ، !"

رخسانہ سے مجھے کبھی بھی دلچسپی نہیں تھی، میں نے بے پروائی کے ساتھ کہا،

"آئی ہوں گی، ———— انھوں نے بھی کوئی نذرانہ پیش کیا تھا سرکار کے حضور میں؟"

وہ فخر، ناز، نشاط، اور سرخوشی کے عالم میں مست ہو کر بولی،

"یہی سوال خالدہ نے بھی کیا تھا، رخسانہ سے کہنے لگی، میں نے تو شاہدہ کو وہ نذرانہ پیش کیا ہے کہ عمر بھر مجھے دعائیں دیں گی، ! ———— اب سمجھے وہ نذرانہ کیا ہے؟"

میں سمجھ تو گیا لیکن صاف انکار کر گیا،

"نہیں، ——— کیا ہے وہ نذرانہ !!"

وہ ہمک کر اٹھی، اور آئینہ اٹھا لائی، اسے میرے منہ کے سامنے کر کے، میرے چہرے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہنے لگی،

"یہ" ———— بی رخسانہ کا خیال ہے انھوں نے یہ نذرانہ دیا ہے، مجھے ———— "

اور پھر شاہدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، اور اس کے بعد گویا ہوئی،

"وہ مثل ہے کہ چور، چوری سے گیا، مگر ہیرا پھیری سے نہیں گیا، !!"

پھر میری طرف سی، آئی ڈی انسپکٹر کی حیثیت سے دیکھا، اور پوچھا،

"آپ میرا مطلب سمجھے، ؟"

میں نے جواب دیا،

"اگر اتنا قابل ہوتا، تو صرف معموں سے ہر مہینہ چالیس پچاس ہزار روپیہ کما لیا کرتا، لہٰذا میری ذہانت کے بارے میں اپنا حسن ظن واپس لو، اور بتاؤ کیا مطلب ہے تمھارا اس پہیلی سے،!"

گویا میرے الفاظ پر اسے یقین نہیں آیا، بدگمانی کی نظر سے ایک مرتبہ مجھے دیکھا، اور بولی،

"ایک طرف تو یہ دعویٰ کر رہی تھیں، اور اس شان سے کہ رہی تھیں گویا، یہ نذرانہ پیش کر کے بہت بڑے ایثار کا ثبوت دیا ہے، اور دوسری طرف حالت یہ کہ بار بار ڈرائنگ روم کے چکر اس لیے کاٹ رہی تھیں کہ اپنے سابق مطلوب کی جھلک دیکھ لیں،!"

میں نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا،

"کیوں تہمت لگاتی ہو کسی پر، ———— یہ ٹھیک ہے، واللہ یہ چاہتی تھیں کہ اس سے میری شادی ہو جائے، اور بات چل بھی پڑی تھی لیکن، نہ میں نے کبھی رخسانہ کو چاہا تھا نہ اس نے، ————"

وہ بے اعتباری کے لہجہ میں گویا ہوئی،

"خیر آپ کے بارے میں تو مان بھی سکتی ہوں، لیکن ان کی صفائی کیوں دے رہے ہیں آپ، میرا خیال تو یہ ہے کہ اب تک ان کی نیت ڈانواں ڈول ہے،!"

"کس آدمی کو یہ اچھا نہیں لگتا کہ وہ مطلوب جہاں ہو، شاہدہ کی ان باتوں سے میری دلچسپی بڑھ گئی، میں نے کہا،

"دیکھو شاہدہ، کسی کو متہم کرنا اچھا نہیں ہوتا،"

اس نصیحت سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ ذرا اور کھلے، اور اپنے وہم یا بدظنی، یا رشک

کے اسباب پر مزید روشنی ڈال سکے، میری یہ چال کامیاب ہوئی، کہنے لگی،

"یا تو آپ انتہائی بھولے اور سادہ لوح ہیں، ورنہ انتہائی چالاک، اور ہوشیار!
______"

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا،

"یہ دو تو باتیں نہیں ہیں، ______ آدمی اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے، تو اس کا ثبوت بھی پیش کرتا ہے، ثبوت پیش کرتا ہے تو اس کا دعویٰ قبول کر لیا جاتا ہے نہیں پیش کر سکتا تو جھوٹا اور لغو گو سمجھا جاتا ہے،!"

اس نے پھر ایک مرتبہ بے اعتباری کی نظر سے مجھے دیکھا، اور بولی،

"ثبوت چاہیے آپ کو؟ میرے پاس کئی ثبوت ہیں، ______ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے آپ کو بہت لطف آ رہا ہے ان باتوں سے،!"

میں نے سوچا، یہ تو چوری فوراً ہی پکڑی گئی، اور اس موضوع کو تشنہ چھوڑنا مجھے منظور نہ تھا، میں نے پوری شان بے نیازی سے کہا،

"لطف تو تمہاری باتوں سے آ رہا ہے، رخسانہ کے بجائے کسی بلی، کسی چوہا، کسی مکڑی کا ذکر شروع کر دو، تو اسے بھی اسی انہماک اور دلچسپی سے سنوں گا۔ ______

ہاں وہ ایرانی بلی تصدق بھائی نے بھیجی یا نہیں؟"

اس کی بے اعتباری رفع ہو گئی، کہنے لگی،

"نہیں بھیجی، ______ ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ جب وہ میرے کمرہ میں آئیں تو وہ فوٹو جن میں آپ کی اور میری تصویر ساتھ ساتھ ہے، سرسری نظر سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئیں، اور وہ فوٹو، جو صرف آپ کے ہیں، کسی میں آپ چوڑی دار پاجامہ، شیروانی، اور رامپوری ٹوپی پہنے کھڑے ہیں، کسی میں شکاری لباس میں ملبوس، کسی میں کوئی اور پوز، ان تصویروں سے دلچسپی کا یہ عالم کہ ابھی اسے

دیکھ رہی ہیں، پھر دوسرے کو دیکھنے لگیں، پھر تیسرے کے سامنے کھڑی اس طرح گھور رہی ہیں جیسے خدانخواستہ کھا جائیں گی، وہاں سے ہٹیں اور پھر پہلے کو تکنے لگیں، پھر دوسرے کے سامنے آکر کھڑی ہوگئیں، پھر تیسرے پر کھڑی حسرت بھری نظر ڈال رہی ہیں"!!

میں نے شاہدہ کو مزید معلومات اگلنے پر، درپردہ اکساتے ہوئے کہا،

"ہاں وہ فوٹو بڑے اچھے ہیں، لیکن کمال فوٹوگرافر کا ہے، نہ کہ میرا، ——"

شاہدہ نے جیسے میری بات نہیں سنی کہنے لگی،

پھر ہم لوگ جاکر وہاں دوسرے کمرے میں بیٹھ گئے بہت دنوں کے بعد، کئی اور پرانی سہیلیوں کا جماؤ ہوا تھا، ہنسی، دل لگی، اور چہلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، ذرا دیر کے بعد دیکھتی کیا ہوں، بی رخسانہ غائب، ——"

یہ سنکر تو میں بھی گھبرا گیا۔ میں نے پوچھا،

"غائب، —— یعنی چلی گئیں ہمارے ہاں سے یک بیک؟"

وہ ہنستی ہوئی بولی،

"جی ہاں چلی گئیں، —— لیکن کہاں؟ یہ بھی تو پوچھے"!!

میں سمجھ گیا، اس کے بعد کوئی چٹ پٹی خبر سننے کو ملے گی، لیکن بڑی لاپروائی سے کہا،

"اپنے گھر چلی گئی ہوں گی، اور کہاں گئی ہوں گی،؟"

وہ تو جیسے آج انکشاف کرنے پہ تلی ہوئی تھی، کہنے لگی،

"جی نہیں، —— وہ چپکے سے ڈرائنگ روم میں گھسک گئیں، ——"

میں سمجھ گیا، اب اصل خبر شروع ہونے والی ہے، لیکن انجان بن کر سوال کیا،

"ڈرائنگ روم میں! —— وہاں کیا کرنے گئیں تھیں؟"

وہ مجھے ٹوکتے ہوئے بولی،

"یہ تو میں مانتا اور جانتا ہوں کہ اڑتی چڑیا کو پہچان لیتی ہو، لیکن یہاں تم سے چوک ہو گئی، رخسانہ اگر وہاں کھڑی تھی تو اپنے منگیتر جاوید کو دیکھ رہی ہو گی، وہ بھی میرا دوست ہے اور شریک مجلس تھا۔"

لیکن اس دلیل سے شاہدہ کا اطمینان نہیں ہوا، کہنے لگی،

"جی نہیں، یہ بات نہیں ہے ——— جاوید صاحب کو دیکھنے کے لیے کیا ہمارا ہی گھر رہ گیا تھا؟"

میں نے شاہدہ کو در پردہ چھیڑتے ہوئے کہا،

"نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے وہ ضرور جاوید کو دیکھ رہی ہو گی! ——— ورنہ اور کون تھا جسے یوں کھڑی ہو کر وہ دیکھتی؟"

"آپ کو" شاہدہ نے بت طناز کی طرح خشمگیں آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا، "وہ آپ ہی کو دیکھ رہی تھی!"

"تم کہتی ہو لہٰذا مانے لیتا ہوں" میں نے بات بگڑتی دیکھ کر کہا، "ورنہ میرا خیال تو اب بھی یہی ہے!"

"رخسانہ صاحب واپس آ کر پھر ہماری مجلس میں بیٹھ گئی!" شاہدہ نے کہا، "تو میں اطمینان کرنے کے لیے چپکے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، اسٹول اب تک وہیں رکھا تھا، اس پر کھڑی ہوئی، اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر باہر کی طرف میں نے بھی دیکھنا شروع کر دیا ——— آپ بالکل سامنے بیٹھے تھے، بالکل سامنے! جاوید صاحب تو بہت دور پچھلی کرسی پر بیٹھے کسی سے باتیں کر رہے تھے!"

"گویا تم نے فوراً بدلہ لے لیا!" میں نے کہا، "رخسانہ نے تمہارے شوہر کو دیکھا، اور تم نے رخسانہ کے منگیتر کو دیکھ لیا، چلو حساب کتاب برابر، پھر گلہ کیسا اور شکوہ کیوں؟"

"سنئے تو سہی، ——— جب میں نے دیکھا کہ رخسانہ غائب ہیں، تو سمجھ گئی کچھ دال میں کالا ہے، سہیلیوں کو آپس کی نوک جھونک میں الجھا ہوا چھوڑ کر پہلے تو میں اپنے کمرہ میں آئی کہ شاید یہاں ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کر آپ کی تصویر کا نظارہ کیا جا رہا ہو، لیکن یہاں نہیں نظر آئیں، پھر میں سیدھی ڈرائنگ روم پہنچی، اور وہاں چور مل گیا، ———"

میں نے حیرت اور تعجب کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے پوچھا،

"اچھا! ——— دن دہاڑے چور کہاں سے گھس آیا ڈرائنگ روم میں؟"

وہ ذرا الجھی ہوئی بولی،

"سننا چاہیے چپ چاپ، ورنہ نہیں بتاؤں گی!!"

اس لطف سے محروم ہونے کے لیے میں تیار نہیں تھا، وعدہ کر لیا کہ اب مداخلت نہیں کروں گا، میرے وعدہ سے مطمئن ہونے کے بعد کہنے لگی،

"دیکھتی کیا ہوں رخسانہ بیگم ایک اسٹول پہ کھڑی ہیں، اور دیوار سے لگی، دروازے کی اوٹ لیے باہر کی طرف جھانک رہی ہیں، ایسی محویت کے ساتھ، ایسے استغراق کے ساتھ کہ گویا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں، جی تو چاہا جاؤں اور ساری سہیلیوں کو لا کر کھڑا کر دوں کہ یہ بیٹھک کا تماشہ دیکھو، لیکن ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ میں نے دیکھا وہ اسٹول سے اتر رہی ہے، میں چپکے سے پلٹ آئی اور پھر اپنی جگہ بیٹھ گئی، ———"

میں نے شاہدہ کو مزید حق گوئی پہ آمادہ کرنے کے لیے معصومیت کے ساتھ کہا،

"لیکن یہ تو کوئی جرم نہ تھا، اکثر عورتیں اور لڑکیاں اس مرض میں مبتلا ہیں!!"

وہ ذرا ترش لہجہ میں بولی،

"جی ہاں، میں خوب سمجھتی ہوں آپ کی وکالت کی ضرورت نہیں، میں تو اڑتی چڑیا کو پہچان لیتی ہوں، رخسانہ کیا چیز ہیں!!"

میں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا،

اگر کہیں رخسانہ نے تمہیں باہر جھانکتے ہوئے دیکھ لیا ہوتا، تو یقیناً وہ بھی وہی رائے قائم کرتی، جو تم نے اس کے لیے کی ہے!"

"جی ہاں اور کیا، ؟" حقارت اور کراہت کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرتی ہوئی شاہدہ بولی "کون سے ہیرے لگے ہیں جاوید صاحب میں، جو کوئی انھیں جھانک جھانک کو دیکھے گا ؟"

"واہ، یہ کیا بات ہوئی ؟" میری خود پسندی نے کچھ اور تعریف سننے کے لیے، مجھے کہنے پر مجبور کیا، "جاوید کوئی بد صورت آدمی ہے ؟"

"بڑے خوب صورت!" شاہدہ نے طنز کرتے ہوئے کہا، "وہ ہماری نجمہ ایک منہ پھٹ ہے اس نے تو رخسانہ کے سامنے ہی کہہ دیا!"

"کیا کہہ دیا، ؟" جو کچھ کہا تھا میں اسے سننے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا، میں نے پوچھا، "کیا وہ جاوید کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی ؟"

"جی!" شاہدہ نے بتایا، "وہ کہنے لگی، بہن خفا اگر برا مانو تو ایک بات کہوں ؟ جاوید میاں، تمہارے سامنے تو چپڑی کے غلام معلوم ہوتے ہیں، اس پہ بی رخسانہ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا، مردوں کا عورتوں سے کیا مقابلہ ؟ نجمہ نے ترسے جواب دیا، اچھا تو مردوں سے مقابلہ کر لو، ہمارے ندیم بھائی کو، اور جاوید میاں کو ساتھ ساتھ بٹھا دو، اگر جاوید میاں خود جھینپ کر نہ بھاگ کھڑے ہوں، تو میرا نام نجمہ نہیں!"

"لاحول ولا قوۃ!" میں نے ہنستے ہوئے کہا، "واقعی بڑی دریدہ دہن ہے یہ نجمہ بھی، ایسی مہمل بات کہنے کی کیا ضرورت تھی ؟ نتیجہ یہ ہوا ہو گا کہ رخسانہ نے بھی دو چار جلی کٹی، مجھے سنادی ہونگی خواہ مخواہ!"

"اسے کس منہ سے جلی کٹی سناتیں وہ ؟" شاہدہ نے سراپا طنز بن کر کہا،

"کیا نجمہ نے کچھ جھوٹ کہا، غلط کہا؟"

"اور کیا سچ کہا، !" میں سراپا انکار بن کر اپنی بات پر قائم رہا، "مجھ میں اور جاوید میں فرق کیا ہے، ؟ بلکہ میرا خیال ہے، دو چار سال مجھ سے چھوٹا ہی ہے"!"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟" شاہدہ نے نہایت زبردست سوال کیا، "کیا عورتوں کی طرح، مرد بھی کم سن پسند کیے جاتے ہیں، ؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے، !" میں نے اور زیادہ خاکساری کا لبادہ اوڑھ کر کہا، "لیکن جاوید بھی مرد آدمی ہے، آخر کیا برائی ہے اس میں؟"

"ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کسی میں بھلائی برائی ڈھونڈنے کی، اچھے ہیں تو جناب کی جاں کو بسے ہیں، تو وہ جانیں، اور رخسانہ، !" شاہدہ نے جواب دیا، "نہ وہ ایسی حرکت کرتیں، نہ ہم کچھ بولتے، !"

"تو کیا رخسانہ کو بھی تم نے کچھ سنا دیا، میں نے گھبرا کر پوچھا، "ذرا بتاؤ تو سہی کیا کہا تھا تم نے؟"

"کہتی کیا، "شاہدہ نے بے پروائی سے کہا، "براہ راست تو ان سے کچھ نہیں بولی، ہاں نجمہ سے مخاطب ہو کر اتنا ضرور کہا تھا میں نے قناعت بڑی اچھی چیز ہے، خدا جو کچھ دے اسی پر صبر کرنا چاہیے، دوسروں کی چیزوں کی طرف للچائی ہوئی نظر نہ ڈالنا چاہیے، !"

"غضب خدا کا یہ کہہ دیا تم نے؟" میں نے اور زیادہ بوکھلا کر کہا، "اس سے زیادہ صاف اور کیا کہہ سکتی تھیں، ارے خدا کی بندی، کیا فائدہ ہوا ایسی کڑوی بات کہنے سے؟"

"بہت بڑا، !" شاہدہ نے جواب دیا، "اب وہ ایسی حرکت نہیں کریں گی، ! کیونکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے میرے یہ الفاظ سنکر ان کا منہ اتر گیا تھا، !"

ایسی چھپی ہیں کہ کیا کہوں؟"

"شادی کے بعد یہ باتیں ضرور رخسانہ جاوید سے کہے گی" !! میں نے ذرا پریشان ہوتے ہوئے کہا، "ادر جاوید لہٰذا، ایک زود رنج ضرور خفا ہو جائے گا" !!

"ہو جائے" !! شاہدہ نے اپنے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا ہمیں کسی کی پروا نہیں ——— اب سو جایئے کافی رات آگئی ہے" !!

مجھے تو نیند نہیں آئی، لیکن شاہدہ واقعی بہت جلد سو گئی، میں بڑی دیر تک شاہدہ کی باتوں پہ غور کرتا رہا اور اپنے اوپر فخر کرتا رہا، دل نے ممنونیت اور مسرت کے ساتھ کہا،

کتنا چاہتی ہے شاہدہ مجھے، دنیا میں ایسے خوش قسمت بہت کم ہوتے ہیں، جو محبت بھی کریں، اور چاہے بھی جائیں، میں انہی چند خوش قسمت لوگوں میں ہوں، محبت بھی کرتا ہوں، اور مجھ سے بھی محبت کی جاتی ہے، زندہ رہنے کا، خوش رہنے کا حق مجھ سے زیادہ اس دنیا میں کسے ہے؟

(۸)

ادھر کئی روز سے دفتر میں کام زیادہ تھا، شہلا کو سر اٹھانے کی فرصت نہ ملتی، کئی دن سے ڈائری دیکھنے کا اسے موقع نہ ملا تھا، آج ذرا فرصت ملی تھی، اور وہ ڈائری کا مطالعہ کرنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ نہ جانے کہاں سے کیتھرائن ٹپک پڑی، کیتھرائن، سلجھی ہوئی طبیعت کی خوش اطوار لڑکی تھی، اور شہلا سے تو خاص طور پر اس کا برتاؤ، ایک سہیلی سے زیادہ بہن کا ہوتا جا رہا تھا، پہلے دونوں میں ہم پیشگی کی وجہ سے ملاقات ہوئی، پھر ربط ضبط شروع ہوا، پھر دوستی ہوئی، اور اب معاملہ بہنا پے تک پہنچ گیا تھا، اپنے اکثر نجی معاملات میں بھی وہ شہلا سے مشورہ کیا کرتی تھی، اور ایسا کم ہوتا تھا کہ اس کی رائے کو وہ ٹھکرا دے، شہلا اسے دیکھ کر گھبرا گئی، کیونکہ اسے یقین تھا، کئی دن کے بعد، خوش بختی سے آج جو موقع ملا تھا، وہ ضرور کیتھرائن کی نذر ہو جائے گا، یہ کام سے فارغ ہو کر آئی ہے، اور اب اس وقت اٹھے گی جب جانسن صاحب کسی کام کے سلسلہ میں طلب کریں، یا دفتر بند کرنے کے لیے روشن صاحب چلانا شروع کریں، لیکن قسمت سے لڑا تو نہیں جا سکتا، آئی ہوئی کیتھرائن کو وہ واپس کس طرح کر دیتی، متبسم ہو کر، اور سراپا اخلاق بن کر اس نے کیتھرائن کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا،

"یقیناً سارا کام ختم کر کے آئی ہو، اور اب مجھے بھی کچھ نہیں کرنے دو گی،" !!

کیتھرائن پاس بیٹھی ہوئی بولی،

"نہ میں نے کام ختم کیا، نہ تمہیں ختم کرنے کی ضرورت ہے،
مسٹر جانسن کرکٹ کے میچ میں تشریف لے گئے ہیں، اور اب راوی چین ہی چین لکھتا ہے، کیونکہ جب تک میچ ہو رہا ہے، وہ ہرگز دفتر کا رخ نہیں کریں گے، یہ ان کا معمول ہے"!

یہ خوش خبری سنکر شہلا بھی مطمئن ہوگئی، اب زیادہ تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ مخاطب ہوئی،

"پھر گھر کیوں نہیں چلی جاتیں؟"

کیتھرائن نے جواب دیا،

"اس لیے کہ دفتر بند ہونے سے پہلے گھر جانا ممنوع ہے، اور اس لیے بھی کہ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں"!

شہلا نے آمادگی اور مستعدی کے ساتھ پوچھا،

"کوئی خاص بات ہے؟"

وہ کچھ متامل ہو کر بولی،

"ہاں ——— میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جوزف سے شادی کر لوں"!

شہلا کو معلوم تھا، جوزف اور کیتھرائن کا رومان چل رہا ہے، دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، لیکن کیتھرائن کے والد، جوزف کو پسند نہیں کرتے، شہلا نے کہا،

"فیصلہ تو کچھ برا نہیں، شادی کے لیے اگر ایسا شخص مل جائے جو عاشق بھی ہو اور محبوب بھی، تو پھر اور کیا چاہیے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ بھی تمہیں چاہتا ہے اور تم بھی اس سے دل و جان سے محبت کرتی ہو، پھر اس رشتہ کے مبارک ہونے میں

شبہ نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ تمھارے والد اجازت دے دیں گے۔!"

کیتھرائن نے بڑی معصومیت کے ساتھ جواب دیا۔

"لیکن شہلا یہ بھی تو سوچو والد کی ضد پہ، میں جوزف کی جان کس طرح لے لوں، وہ تو زہر کھانے یا خودکشی کر لینے پہ تلا ہوا ہے، اس کا اترا ہوا چہرہ جب دیکھتی ہوں، تو میری حالت غیر ہونے لگتی ہے، ——— نہیں شہلا، جوزف مجھے عزیز ہے اس کے لیے کسی بڑے سے بڑے ایثار سے بھی میں دریغ نہیں کر سکتی'!"

شہلا نے سمجھ لیا، کیتھرائن کہاں تک جانے پہ تلی ہوئی ہے؟ پھر یہی سوال کیا،

"لیکن کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ وہ مان جائیں؟ ان کی رضامندی سے یہ شادی ہو تو بات ہی اور ہے'!"

کیتھرائن نے بے کسی کے ساتھ افسردہ لہجہ میں کہا،

"خواہش تو میری بھی یہی ہے لیکن وہ مانتے ہی نہیں کسی طرح، نہ جانے کیوں ضد ہو گئی ہے بیچارے جوزف سے، حالانکہ وہ ہر وقت ان کی خوشامد میں لگا رہتا ہے، اگر ذرا بیمار پڑتے ہیں تو اپنے دفتر سے چھٹی لے کر، اور چھٹی نہ ملے تو غیر حاضری کر کے سارا سارا دن ان کے پاس بیٹھا رہتا ہے، مگر کسی طرح ان کا دل پسیجتا ہی نہیں،

شہلا نے سوال کیا۔

لیکن اس کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی، ؟ آخر کہتے کیا ہیں؟ کیوں جوزف ناپسند ہے ان کو؟"

کیتھرائن نے برا سا منہ بنا کر کہا،

"بات تو بہت معمولی ہے، ——— کہتے ہیں جوزف کی ناک بہت بڑی ہے، دانت ٹیڑھے ہیں، ہنستا بہت ہے، کھانا بھی جتنا کھانا چاہیے اس سے زیادہ کھاتا ہے، اور گرجا میں کبھی نہیں جاتا، میرے کہنے سے اس نے گرجا میں جانا تو شروع

کر دیا، ؟ ا ے ہاں اگر کبھی کھاتا ہے تو میری ہدایت کے مطابق کم کھاتا ہے، بلکہ بھوکا اُٹھتا ہے، دانتوں کے بارے میں بھی اس پہ تیار ہے کہ سب اکھڑوا دے، اور نئے لگوا لے، لیکن ــــــــ،،

،،لمبی ناک کو کیا کرے ؟،، شہلا نے ہنستے ہوئے پوچھا،

،،ہاں !،، کیتھرائن نے پریشانی اور بے بسی کے عالم میں کہا،

شہلا ہنسنے لگی، اس نے کہا،

،،واقعی یہ تو بڑے بے تکے اعتراضات ہیں، ــــــــ لیکن تمھاری والدہ کیوں مدد نہیں کرتیں ؟،،

کیتھرائن نے بتایا،

،،ان بیچاری کی بھی نہیں سنتے، ــــــــ انہی نے تو مجھے مشورہ دیا ہے ــــــــ،،

،،کہ جوزف سے شادی کر ڈالو، پھر دیکھا جائے گا ؟،،

،،ہاں ــــــــ کہہ رہی تھیں، تمھارے باپ تو سٹھیا گئے ہیں، انھیں زندگی بھر کوئی آدمی پسند نہیں آئے گا، کب تک ان کے انتظار میں بیٹھی رہو گی، کرلو شادی، دس دن کے بعد خود ہی خوش ہو جائیں گے ــــــــ،،

،،ترکیب تو ٹھیک ہے !،، ان سے بڑھ کر تمھارے والد کا مزاج شناس اور کون ہو سکتا ہے ؟ جب وہ کہہ رہی ہیں، تو پھر ٹھیک ہی ہوگا، !،،

،،ہاں میں بھی اب اسی نتیجہ پہ پہنچی ہوں !!،،

،،تو کیا جوزف کو تم نے اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا، !،،

،،تم سے مشورہ کیے بغیر کیسے مطلع کر دیتی، ــــــــ جیسا کہو، ویسا کر دوں، !،،

اس اعتماد پر شہلا نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا، پھر بولی،

"میری تو پختہ رائے ہے کہ تمہیں اپنی والدہ کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے، ——— اگر خدانخواستہ بات بگڑ گئی بھی تو وہ تمہارے والد کو راہ راست پر لے آئیں گی،!!"

جیسے کیتھرائن کے دل کا بوجھ ان الفاظ سے اتر گیا، وہ خوش ہو گئی! اس نے کہا،

"تو پھر یہاں سے سیدھی جوزف کے پاس جاؤں گی، اور اسے اپنے فیصلہ کی اطلاع دے دوں گی،!"

شہلا نے اس فیصلہ کی تائید کی، اور کہا،

"ہاں ٹھیک ہے، ——— میں نے تھوڑے تھوڑے کر کے تین سو روپے جمع کر لیے ہیں، ان میں سے سو روپے کا تو کوئی تحفہ نذر کر دوں گی تمہیں، اگر ضرورت ہو تو باقی دو سو لے لو، پھر جب چاہنا ادا کر دینا،!"

کیتھرائن نے شہلا کے گلے میں باہیں ڈال دیں، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اس نے کہا،

"میں جانتی ہوں، کن حالات میں تم زندگی بسر کر رہی ہو، تمہاری جگہ میں ہوتی تو شاید پاگل ہو جاتی، اطمینان رکھو، روپے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ اتنا قیمتی تحفہ میں قبول کر سکتی ہوں، اور اگر تم نے اس پر اصرار کیا، تو میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتی رونے لگوں گی،!"

شہلا ہنسنے لگی،

"اچھا دیکھا جائے گا،!" ❋

---

(۹)

ڈائری کا ایک صفحہ :

زندگی کا سفر نہایت سبک روی کے ساتھ، نشاط اور سرخوشی کے ساتھ جاری ہے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ دنیا صرف میرے لیے بنی ہے، یہ پھول اس لیے کھلتے ہیں کہ میری آنکھوں کو طراوت بخشیں، بہار اس لیے آتی ہے کہ میرا دل مسرور ہو، کائنات کی ہر وہ چیز جس سے مسرت، انبساط اور نشاط کی کیفیت پیدا ہوتی ہو، صرف میرے لیے عالم وجود میں آئی ہے، غم کیا چیز ہے، صدمہ کیا ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا، جاننا چاہتا بھی نہیں، ہم دونوں کی زندگی یکسر کیف و سرور ہے، کیوں نہ میں اسے جنت سے تعبیر کروں، جنت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے؟

شاہدہ کی باتیں، اس کی ادائیں، حرکتیں اپنے اندر ایک جہان معانی پوشیدہ رکھتی ہیں، جنھیں سمجھنے کے لیے صرف میرا جیسا حساس قلب چاہیے۔

دو تین دن کا واقعہ ہے، میں اور شاہدہ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے، میں نے انڈا اپنی طرف بڑھایا اور کھانا شروع کر دیا، مشکل سے ایک لقمہ کھایا ہوگا کہ نہایت تیزی اور پھرتی سے شاہدہ نے پلیٹ میرے آگے سے کھینچ لی اور جلدی جلدی دو لقموں میں اسے ختم کر دیا، میں نے دیکھا کہ اس کی اس حرکت میں بے تکلفی نہیں تھی، شرارت نہیں تھی، شوخی نہیں تھی، ایک اضطراب تھا، ایک وحشت تھی، ایک عجیب انجانا سا

خوف تھا، میں نے اس سے کچھ نہیں کہا، چائے پینے لگا اور سوچنے لگا، کیا بات ہو سکتی ہے؟ اتنے میں اس کی آواز میرے کانوں میں آئی،

"ذرا تھم جائیے، میں خود ابھی ایک منٹ میں دوسرا انڈا بنا کر لاتی ہوں"

اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر، میری طرف دیکھے بغیر، میری طرف دیکھ کر مسکرائے بغیر، پیکرِ اضطراب بنی تیز تیز قدم رکھتی وہ چلی گئی، اس کے جانے کے بعد میں پھر غرقِ حیرت ہو گیا، سوچنے لگا، ضرور اس حرکت کی تہ میں کوئی خاص بات ہے، لیکن وہ خاص بات کیا ہو سکتی ہے؟ اس کا سراغ بھی تو لگنا چاہیے، میں نے چائے کی پیالی وہیں رکھی اور چپ چاپ، آہستہ آہستہ، دبے پاؤں باورچی خانہ کی طرف بڑھا، جہاں صغرا کام کر رہی تھی، میں گیا اور دروازہ کے پاس کھڑا ہو گیا، کہ جھانک کر دیکھوں کیا ہو رہا ہے؟،

شاہدہ صغرا سے کہہ رہی تھی،

"اگر خدانخواستہ انھیں کچھ ہو گیا تو یاد رکھو اپنے ہاتھوں سے پہلے تمھارا گلا گھونٹوں گی، پھر مروں گی"

شاہدہ کے یہ الفاظ سُن کر میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی، گھر کے نوکروں سے عام طور پر، اور صغرا سے خاص طور پر اس کا برتاؤ بہت اچھا تھا، وہ کسی سے بھی سخت کلامی سے نہیں پیش آتی تھی، اور صغرا کا بڑھاپے کی وجہ سے تو ایک حد تک احترام بھی کرتی تھی، اتنے سخت، اتنے ہولناک اتنے لرزہ خیز الفاظ شاہدہ کے منہ سے صغرا کے لیے کس طرح نکل رہے ہیں۔ وہ کون سا جرم ہے جس کی خاطر وہ صغرا کی جان لینے اور اپنی جان دینے کے لیے تیار ہو گئی، یقیناً کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی، کوئی بہت ہی غیر معمولی بات ہوگی، لیکن کیا؟ ———

یکایک میرے ذہن میں ایک نیا خیال پیدا ہوا، اس دھمکی کا، اس برہمی کا کچھ تعلق میری ذات سے بھی معلوم ہوتا ہے، ابھی شاہدہ نے صغرا سے کہا تھا، اگر انھیں کچھ ہو گیا

تو تمھاری خبر نہیں، ظاہر ہے میرے بارے میں شاہدہ نے یہ الفاظ کہے ہیں، لیکن مجھے کیا ہو سکتا ہے؟، میں یہی سوچ رہا تھا کہ صغرا کی گھبرائی ہوئی آواز میرے کان میں آئی وہ شاہدہ سے کہہ رہی تھی،

"بیٹی! اگر خدا نخواستہ تمھارے دولہا کو کچھ ہوا تو کیا میں اس کا انتظار کروں گی کہ تم میرا گلا گھونٹو، جب مردں؟ اس چولہے کی یہ لپکتی ہوئی آگ، یہ بھڑکتے ہوئے شعلے، یہ دہکتے ہوئے انگارے چند سیکنڈ میں میری زندگی کا خاتمہ کر دیں گے؟"

اب تو تشویش اور حیرت نے مجھے بے قابو کر دیا، جی چاہا اندر گھس جاؤں اور پوچھوں یہ کیا جھگڑا ہے، نہ میں بیمار ہوں، نہ بظاہر بیمار ہونے کا کوئی اندیشہ ہے، اور اگر بیماری مجھے دبوچ بھی لے تو اس میں صغرا بیچاری کا کیا دوش ہے، آج شاہدہ کو کیا ہو گیا ہے، وہ کیوں اتنی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے، اور صغرا کو بھی کیا ہو گیا ہے، وہ کیوں ایک مجرم کی طرح صفائی کا بیان دینے کے باوجود گھبرائی ہوئی ہے، سہمی جا رہی ہے، یکایک میرے کانوں میں صغرا کی آواز آئی،

"بیٹی! کیوں پریشان ہوتی ہو، تمھارے سر کی قسم میں نے وہ گھی جس میں مرا ہوا بچھو نکلا تھا اسی وقت پھینک دیا تھا، یہ دوسرا گھی ہے، بالکل نیا، نئی دوکان کا ــــــ"

شاہدہ نے اعتراض کیا،

"لیکن ڈبہ تو وہی ہے، مجھے وہم ہوتا ہے اس کا کچھ اثر باقی نہ رہ گیا ہو، اور یہ انڈے تم نے اسی میں نہ تل دیئے ہوں"

بیچاری صغرا اپنے پوپلے منہ سے ہنسنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی،

"وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں ہے، تم دونوں میاں بیوی سب سے آخر میں اور بہت دیر سے ناشتہ کرتے ہو، اسی گھی میں انڈے تل کر، فجر کی نماز کے بعد یعنی اب سے ڈھائی گھنٹہ پہلے میاں اور بیگم صاحبہ کو کھلا چکی ہوں، ماشاء اللہ دونوں

اچھے بھلے باتیں کر رہے ہیں، اگر خدانخواستہ اس میں کوئی اثر ہوتا تو اب تک ظاہر نہ ہو چکا ہوتا؟"

میں نے دیکھا کہ شاہدہ کے چہرہ پر جو سراسیمگی اور دہشت تھی وہ دور ہو گئی، اور وہ مطمئن ہو گئی، اسے مصروف کار چھوڑ کر، جس طرح آہستہ آہستہ دبے پاؤں گیا تھا، اسی طرح واپس آ گیا اور چائے کے بجائے اطمینان سے سگرٹ کا لطف لینے لگا، سگریٹ کے ایک کش نے ایک اور راز بھی منکشف کر دیا، یعنی میرے ایک لقمہ کھانے کے بعد شاہدہ صاحبہ نے جھپٹ کر جو انڈا میرے سامنے سے کھینچا تھا اور جسے جلدی جلدی دو لقموں میں وہ نگل گئی تھیں اس کا راز یہ تھا کہ اگر اس میں زہر کا کچھ اثر تھا اور وہ میرے پیٹ میں پہنچ گیا ہے تو اس لذت اور نعمت سے وہ بھی محروم نہ رہیں، یعنی اگر میں مروں تو ان کی زندگی بھی فوراً ختم ہو جائے، اس تصور نے میرے دل میں شاہدہ کی عزت اور عظمت اور محبت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا دی ہے، بلکہ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ میرے دل میں اس کی عظمت زیادہ ہے یا عزت یا محبت؟،

میں یہی سوچ رہا تھا کہ شاہدہ نیا انڈا بنا کر لے آئی، اس کے چہرے پر اور ہونٹوں پر ننھے ننھے پسینے کے قطرے اس طرح نمایاں تھے جیسے زمرد پر کسی نے چھوٹے چھوٹے موتی جڑ دیے ہوں، میں نے بالکل انجان بن کر کہا۔

"شاہدہ! یہ آج تم کیسی حرکتیں کر رہی ہو، انڈا مجھ سے چھین کر خود کھا گئیں، پھر بھاگی بھاگی گئیں دوسرا بنا لائیں، کچھ عجیب گھبراہٹ سی، پریشانی سی تمہارے چہرہ پر دیکھ رہا ہوں،

پھر اطمینان سے کرسی پر بیٹھتی ہوئی اور تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی بولی،
"آج مجھے بھوک زیادہ لگ رہی تھی، لہٰذا آپ کا حصہ بھی میں نے صاف

کر دیا اور اسی لیے جلدی سے پھر آپ کے لیے دوسرا انڈا بنا لائی، اب کھائیے اطمینان سے، میں چائے بناتی ہوں "

جی تو چاہا سارا راز منکشف کر دوں کہ جناب آپ میں اور بیچاری صغریٰ میں جو باتیں ہو رہی تھیں، ان کا ایک ایک لفظ سن چکا ہوں، لیکن خاموش ہی رہنا مناسب معلوم ہوا، میں چائے پینے لگا، میں نے شاہدہ سے کہا،

" ایک بات تو بتاؤ شاہدہ ؟ "

وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی، اس نے قدرے تحیّر کے ساتھ پوچھا،

" کیا دریافت کرنا چاہتے ہیں آپ ؟، کوئی خاص بات ؟ "

جو کچھ میرے دل میں تھا اسے زبان پر لاتے ہوئے کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی تھی، لیکن قبل اس کے کہ میں فیصلہ کر سکوں کہ مجھے دل کی بات زبان پر لانی چاہیے یا نہیں، وہ خود بخود زبان پر آ گئی، میں نے کہا،

" کیوں شاہدہ ! ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں، زندگی کسی کی جاگیر تو ہے نہیں، ہر شخص کو موت کی منزل مقصود تک جانا ہی پڑتا ہے، کوئی پہلے کوئی بعد میں، کوئی جوانی کے عالم میں کوئی بوڑھا ہو کر، حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک اتفاق اور موت ایک سنگین حقیقت، اگر ایسا ہوا، تو اس حادثہ کا خیر مقدم تم کس طرح کرو گی ؟ یہ پوچھنے والی بات نہیں ہے لیکن نہ جانے کیوں میرے دل میں اور دل سے زبان پر آ گئی "

نہ جانے کس تاثر کے عالم میں یہ فلسفیانہ تقریر کر گیا، لیکن اس تقریر دل پذیر کے جواب میں ایک لفظ بھی سنائی نہیں دیا، میں نے نظر اٹھا کر شاہدہ کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے، جیسے کسی صاف شفاف جھیل میں کنول تیرتا ہے، یہ منظر دیکھ کر میں پریشان ہو گیا، جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس پہنچا اور اس

کے دونوں کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر میں نے کہا،

"ارے! تم تو رونے لگیں۔ میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی، اگر تمہیں صدمہ ہوا ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، معاف کر دو"

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا،

"معاف کر دو! ——— کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری، اس طرح کی باتیں میرے سامنے نہ کیا کیجیے، بلکہ سوچا بھی نہ کیجیے، ہم دونوں کی زندگی مشترک ہے، نہ میری زندگی کوئی جداگانہ وجود رکھتی ہے، نہ آپ کی، آپ زندہ ہیں تو میری زندگی بھی قائم ہے اور ممکن ہے یہ میرا حسن ظن ہو لیکن سمجھتی ایسا ہی ہوں کہ میری زندگی بھی آپ کے لیے کچھ حیثیت رکھتی ہے"

شاہدہ کے ان الفاظ میں کتنی گہرائی تھی، کتنا خلوص تھا کتنی بے پناہ محبت تھی۔ میں نے آج تک کبھی نہیں سوچا تھا کہ میری محبت اتنی کامیاب ہو سکتی ہے۔ آج مجھے اپنے وجود پہ فخر محسوس ہو رہا تھا، شاہدہ میرے سامنے بیٹھی تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کے سامنے اپنا سر جھکا دوں، میں نے کہا،

"اب تو تم فلسفیانہ باتیں بھی کرنے لگی ہو، یہ فلسفہ کہاں سے سیکھا ہے تم نے؟"

وہ روٹھے ہوئے انداز میں شکوہ سنج نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی بولی،

"اس وقت میں موڈ میں نہیں ہوں۔ کچھ اور باتیں کیجیے۔"

مجھے موقع مل گیا، میں نے کہا

"اب میں ایسی بات کہنے والا ہوں جسے سن کر تم پھڑک جاؤ گی"

وہ مسکراتی ہوئی اشتیاق آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی بولی،

"لیکن کہیے بھی تو۔ آپ تو صرف ترسا رہے ہیں"

میں نے اپنی جیب سے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ

دیے اور کہا،

"اب فرمایئے! کیا ارشاد ہوتا ہے ——— ؟"

اس نے ٹکٹ اٹھا کر دیکھے اور مسکراتی ہوئی گویا ہوئی،

"آخر ارادہ کیا ہے آپ کا؟ کیا واقعی سفر کا پروگرام بنا لیا ہے آپ نے ——— ؟"

میں نے ٹکٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے جواب دیا،

"ہاں بھئی! اس شہر میں جب سے پیدا ہوئے اب تک رہتے چلے آرہے ہیں، اکتا گئی ہے طبیعت، ذرا باہر نکلیں، سیر کریں، دنیا دیکھیں، واقعی کتنے مزے کی بات کہی بچوں کے ایک بوڑھے شاعر نے،

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں؟

زندگی بھی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں؟

کم سے کم دو مہینے تک مختلف شہروں کی سیر کریں گے"

میرے ان الفاظ کا وہی اثر ہوا جس کی مجھے توقع تھی یعنی شاہدہ کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا، وہ خوش ہو گئی، اس نے مخمور اور مسرور نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا،

"تو کب؟ ——— کس دن سفر شروع ہوگا ہمارا؟"

"ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد!"

"لیکن سوال یہ ہے، کہ ابّا اور امّاں سے آپ نے اجازت لے لی ہے؟ مجھے شبہ ہے کہ شاید مجھے اتنے لمبے سفر پہ اور وہ بھی دو مہینے تک بھیجنے کے لیے وہ رضامند نہ ہوں"

"تو کیا کسی غیر کے ساتھ جا رہی ہو؟ کیوں اجازت نہیں دیں گے؟ اور

پھر تمھاری بات تو والدہ کسی طرح رَد کر ہی نہیں سکتیں، ایسا قابو میں کر لیا ہے تم نے بھئیں"

"سبحان اللہ! گویا آپ مجھے ترغیب دے رہے ہیں، بلکہ سنا رہے ہیں کہ اماں سے اجازت حاصل کرنے کا مرحلہ خود مجھے طے کرنا چاہیے، آپ اس میں کوئی حصّہ نہیں لیں گے"

"ہاں تو کیا ہوا؟ اس قدر بزدلی بھی اچھی نہیں ہوتی، ہمت کرو اور ان سے اجازت لے آؤ جا کر"

"جی بخشئے! باہمت آپ ہیں، آپ ہی جائیے!"

---

(۱۰)

آج بہت دنوں کے بعد ڈائری لکھنے بیٹھا ہوں، شاید ایک سال سے زیادہ
کی مدت گذر گئی، اس مدت میں، غم کے پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑے،
شاہدہ کو لے کر کس شوق سے، کس جوش سے سفر پہ نکلا تھا، اور کوئی شبہ
نہیں، سفر ہر اعتبار سے کامیاب رہا، ہر روز، روزِ عید تھا، ہر شب، شب برات،
خوش خوش ہم لوگ دو ڈھائی مہینہ کی جہاں گردی کے بعد واپس آئے، لیکن یہاں بلائیں
مصیبتیں، آفتیں، تباہیاں، بربادیاں، استقبال کے لیے پرا باندھے کھڑی تھیں،
میں جب آیا ہوں تو، والدہ بستر علالت پہ دراز تھیں، اس مدت میں بیماری
پورے طور پہ غالب آ چکی تھی، وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں، محض ہڈیوں کا ڈھانچہ، مجھے
دیکھ کر کلیجہ سے لگا لیا، اور رونے لگیں، شاید وہ سمجھ رہی تھیں، اس دنیا سے بہت
جلد رخصت ہونے والی ہیں، میں ان کے پاس بڑی دیر تک بیٹھا رہا، ان کا سر دباتا رہا
ان کے جھریوں بھرے ہاتھ، اپنے ہاتھ میں لے کر چومتا رہا، انھیں تسلی اور دلاسہ
دیتا رہا، ان کی آنکھیں پرنم تھیں، آنسو ڈبڈبا رہے تھے، لیکن میرا دل رکھنے کو،
مجھے خوش دیکھنے کو وہ مسکرا بھی رہی تھیں، اور اپنی کمزور و نحیف آواز سے، میری
پر امید باتوں کی تائید بھی کر رہی تھیں، میں نے کہا اماں آپ بہت جلد اچھی ہو جائیں
گی، ڈاکٹر نے یقین دلایا ہے خطرہ ٹل گیا، وہ مسکراتی بھی، ——

لیکن آہ اس تبسم میں کتنا جانگداز غم شامل تھا، جسے اب محسوس کرتا ہوں، ——
—— بولیں، ہاں بیٹے اچھی ہو جاؤں گی، تو غم نہ کر، فکر نہ کر، اچھا تو نے ناشتہ بھی کیا، ارے لڑکے ذرا صغریٰ کو بلانا، سنھے پاس کھڑا تھا وہ دوڑا دوڑا گیا، اور صغریٰ کو بلا لایا، اماں نے اس سے کہا، کیوں بی، میرا بچہ ناشتہ کب کرے گا کیا دوپہر کو؟ صغریٰ نے جواب دیا، بیگم صاحب ناشتہ تو کب کا تیار ہے، اماں خفا ہو گئیں، کہنے لگیں، تو لے کیوں نہیں آتیں؟ دولہن (شاہدہ) کو بھی یہیں بھیج دو، میرا بچہ میری آنکھوں کے سامنے ناشتہ کرے گا، کتنے دن ہو گئے، اسے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی تھیں، شکر ہے وہ آ گیا، میں نے اسے دیکھ لیا، میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا، میری آنکھوں میں نور آ گیا، صغریٰ نے کوئی جواب نہیں دیا، چپ چاپ چلی گئی، اتنے میں شاہدہ آ گئی، اماں نے اسے دیکھا، اور بڑے محبت بھرے لہجہ میں بولیں، میری بچی، پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں، اور شکوہ کے طور پہ سوال کیا، یہ دبلی کیوں ہو گئی ہے؟ شاہدہ مسکرانے لگی، اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا، نہیں اماں میں دبلی تو بالکل نہیں ہوئی، کئی پونڈ وزن بڑھ گیا ہے میرا، ڈر ہے کہیں موٹی نہ ہو جاؤں، اماں نے کہا، خدا وہ دن لائے کہ بوٹی چڑھے تمھارے بدن پہ، وہ ہنسنے لگی، اتنے میں، صغریٰ ناشتہ لے کر آ گئی، ہم دونوں نے وہیں اماں کی نظر کے سامنے بیٹھ کر خوب ڈٹ کے ناشتہ کیا، تھوڑی دیر کے بعد شاہدہ کسی کام سے چلی گئی، میں بیٹھا رہا، اماں نے تھوڑی دیر کے بعد کہا، بیٹے جاؤ اب تم بھی ذرا آرام کر لو، پھر آ جانا تھوڑی دیر میں، وہ جانتی تھیں، میں شاہدہ سے کتنی محبت کرتا ہوں، وہ چاہتی تھیں، تھوڑا سا وقت میں اس کے پاس صرف کر آؤں، میں نے حکم کی تعمیل کی، اور چلا گیا،

وقت کا بڑا حصہ میں اماں کی خدمت میں صرف کرتا تھا، لیکن انھیں میری راحت آرام، اور آسائش کا اتنا پاس تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد اصرار کر کے رخصت کر دیتی تھیں، بارہ پندرہ دن اسی طرح گزر گئے!

لیکن والدہ کی حالت میں نہ صرف کوئی فرق نہیں ہوا، بلکہ اور ابتر ہوتی گئی'، !
اور آخر میرے سفر سے واپس آنے کے ٹھیک ۱۸ ویں دن، وہ دنیا سے رخصت ہوگئیں، ———— میری ماں، میری پیاری ماں'، !

والدہ کے انتقال کے وقت میں موجود نہ تھا، کتنی ملامت کرتا ہوں اپنے آپ کو، انہی کے اصرار سے میں کرکیٹ میچ دیکھنے چلا گیا، واپس آیا تو انتقال ہو چکا تھا، شاہدہ ان کے پاس بیٹھی تھی، اس کا بیان ہے، باتیں کرتے کرتے ایک لمبی سی سانس لی، اور منہ قبلہ کی طرف ہو گیا، اس حادثہ نے دنیا میری آنکھوں میں تاریک کر دی، مجھے نہیں یاد کہ زندگی میں کبھی میری آنکھوں سے آنسو نکلے ہوں، لیکن والدہ کی موت نے، مجھے گریۂ و ماتم پہ مجبور کر دیا، مجھے تو یاد نہیں، لیکن شاہدہ نے بتایا کہ میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا !'

اماں کے انتقال سے گھر سونا ہو گیا، وہی گھر جہاں ان کے دم سے ہر وقت چہل پہل، رونق اور گہما گہمی رہتی تھی، اب ایک ویرانہ سا نظر آنے لگا، اس حادثہ سے سب ہی ملول و دل گرفتہ تھے، لیکن سب سے زیادہ قابل رحم حالت والد کی تھی، نہ ان کی آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا، نہ روئے، بلکہ رونے والوں کو صبر کی تلقین کرتے رہے لیکن والدہ کو دفن کر کے جو آئے تو پھر انھیں چپ لگ گئی، صغرا منتیں کرتی، شاہدہ خوشامد کرتی، میں دست بستہ عرض کرتا، لیکن وہ نہ اپنے کمرہ سے باہر نکلتے، نہ کسی سے بات چیت کرتے، نہ کسی معاملہ میں حصّہ لیتے، انھوں نے گھر کی کنجی شاہدہ کے ہاتھ میں دے دی، زر نقد، میرے حوالے کر دیا، بینک کا حساب بھی میرے نام منتقل کر دیا،

ظاہر ہے، یہ زندہ رہنے کے لچھن نہیں تھے، غمگین، خاموش، اور افسردہ، و مضمحل ہونے کے باوجود بظاہر وہ تندرست تھے، لیکن ایک روز صبح صبح صغرا

دوڑتی ہوئی، چیختی اور روتی ہوئی میرے کمرے میں آئی، میں اس وقت سو کر اٹھا تھا، میں نے سراپا اضطراب بنکر پوچھا، کیا بات ہے، کیوں رو رہی ہو؟ اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا، اور بڑے دردناک لہجہ میں کہا،

"بیٹے چل کر دیکھو میاں کو کیا ہو گیا ہے؟"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا، بھاگا بھاگا، والد کے کمرے میں پہنچا، میرے پیچھے پیچھے شاہدہ بھی ننگے پاؤں آئی، گھر کے سب نوکر، چاکر پہنچ گئے، والد بستر پر دراز تھے، جیسے سو رہے ہوں، میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو برف کی طرح ٹھنڈا، نبض ٹٹولی وہ غائب، جلدی سے کانپتی ہوئی آواز میں ڈاکٹر کو فون کیا وہ موٹر پہ بیٹھ کر فوراً آموجود ہوا، اسنے بھی اچھی طرح دیکھا بھالا، اور اعلان کر دیا کہ اب ان میں کیا رہا ہے؟

یہ سنکر سارا کمرہ مجھے گھومتا ہوا محسوس ہوا، میں تیورا کر گرا، اور بیہوش ہو گیا،!

جب آنکھ کھلی تو والد کو آغوش قبر میں سوتے ہوئے دو دن گذر چکے تھے،!

شاہدہ میرے سرہانے بیٹھی تھی، چہرا اترا ہوا، آنکھیں پرنم، بال پریشان، کپڑے میلے، میں نے آنکھ کھولی، اور شاہدہ سے پوچھا،

میں بستر پہ کیوں لیٹا ہوں؟ تم تیمار دار کی طرح میرے سرہانے کیوں بیٹھی ہو؟ میرے سر پہ پٹیاں کیوں بندھی ہیں؟ تم مغموم اور افسردہ کیوں نظر آ رہی ہو؟ مجھ سے اٹھا کیوں نہیں جاتا،؟ —————— شاہدہ مجھے کیا ہو گیا ہے،؟!

وہ بالکل میرے پاس آ کر بیٹھ گئی،!

اس نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، میرے سر پہ بڑی دیر تک ہاتھ پھیرتی رہی، یوں سمجھیے اپنی نرم نازک انگلیوں سے کنگھی کرتی رہی، پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور کہا،

اللہ نے فضل کیا، اب آپ اچھے ہیں، ابھی ڈاکٹر صاحب تشریف لے گئے ہیں،،!

میں نے سوال کیا، لیکن شاہدہ مجھے ہو کیا گیا تھا؟ میں بیمار ہوں؟

پھر میں نے دماغ پہ زور دیتے ہوئے کہا، ہاں یاد آگیا شاید والد کا انتقال ہوگیا، یہی منظر دیکھ کر میں بے ہوش ہوگیا تھا، کیا واقعی ان کا انتقال ہوگیا؟

شاہدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، دنیا میں کس کے ماں باپ ہمیشہ بیٹھے رہتے ہیں، اس طرح غم منایئے گا، تو خدانخواستہ آپ کی جان کے لالے پڑ جائیں گے، ہمت کیجئے حوصلہ سے کام لیجیے، آپ مرد آدمی ہیں، وہ بھی بہادر، اور شیر دل مرد،،!

پھر اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے نہنے کو آواز دی، وہ آیا تو کہا جاؤ، صغریٰ سے کہہ دو، صاحب ہوشیار ہوگئے ہیں، جلدی سے کافی بنا لائے، میں انکار نہ کر سکا، نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں، تھوڑی دیر کے بعد کافی آگئی، شاہدہ نے اپنے ہاتھ سے چمچہ چمچہ کر کے مجھے پلائی، کافی پینے سے ذرا توانائی آئی، اور میں گزرے ہوئے واقعات پہ غور کرنے لگا والدہ کا غم ابھی تازہ تھا کہ والد بھی رخصت ہوگئے،،!

میں سوچتا تھا، اگر شاہدہ نہ ہوتی، تو میں کیا کرتا؟ کیا پاگل نہ ہو جاتا؟ کیا اس غم سے مر نہ جاتا؟ یہ اسی کی زندگی ہے جس نے مجھے بچا لیا، یہ اسی کی محبت ہے جو مجھے مرنے نہیں دیتی، یا اسی کی وفاداری ہے، جو مجھے زندہ رہنے پر مجبور کر رہی ہے،

کئی دن کے بعد میں اس قابل ہوا کہ بستر سے اُٹھ سکوں، اس حادثہ نے دل و دماغ کو معطل کر دیا تھا کسی کام میں جی نہ لگتا، کسی بات سے دل نہ بہلتا تھا، شاہدہ ہر وقت سایہ کی طرح میرے ساتھ رہتی، شاعروں نے سایہ کے متعلق کہا ہے اور ٹھیک کہا ہے کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انسان سے،،!

لیکن ان تاریک دنوں میں، زندگی کے اس تاریک ترین دور میں، وہ سایہ کی

طرح میرے ساتھ تھی، ایک پل کو مجھ سے جدا نہ ہوتی، ہر وقت میرے پاس بیٹھی رہتی، اخبار پڑھکر سناتی، کتابیں سناتی رہتی، نہ جانے کہاں کہاں سے انگریزی اور اردو کے رسالے اس نے میرے لیے جمع کر لیے تھے کہ شاید اس طرح دل بے قرار کو کچھ سکون میسر آ سکے، جب کسی کام میں مجھے مشغول نہ دیکھتی تو افسانہ طرازی شروع کر دیتی، واقعہ یہ ہے کہ شاہدہ کا وجود اس موقع پر میرے لیے ایک نعمت تھا، ایسی نعمت جس کی قدر ہمیشہ سے کرتا تھا، اور اب اس کی پرستش کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا تھا، وہ کسی قیمت پر بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ مجھے مضمحل اور افسردہ دیکھے، میری دلچسپی کے نت۔ نئے سامان مہیا کرتی تھی،

رفتہ رفتہ، زندگی کی دنیا میں پھر میں واپس پہنچ گیا،!

لیکن دل اب بھی بجھا بجھا سا رہتا، ہر وقت اداس اداس سا، کھویا کھویا سا،

اتفاق سے اسی زمانہ میں ہماری شادی کی سالگرہ کا دن آ گیا، شاہدہ نے سوچا، اس موقع پر ذرا چہل پہل اور گہما گہمی ہونی چاہیے، شاید اس طرح میرا موڈ بدل جائے۔ اس نے بڑے وسیع اور شاندار پیمانہ پر اس جشن کو منانے کا اہتمام کیا، اپنی تمام سہیلیوں کو مدعو کر ڈالا، اور ان سہیلیوں کے شوہروں کو بھی میری طرف سے دعوت بھیج دی،،!

آخر یوم جشن آیا،،!

یہ ویرانہ ایک مرتبہ پھر آباد ہو گیا، جس گھر میں خزاں کا دور دورہ تھا، وہاں پھر بہار اٹھکیلیاں کرنے لگی، جہاں سر شام سناٹا چھا جاتا تھا، وہاں آج بجلی کے قمقمے روشن تھے، فانوسوں سے روشنی ابل رہی تھی، جہاں بات کرنے کو زبان ترستی تھی، آج وہاں قہقہوں چہچہوں، اور زمزمہ سنجیوں سے کان پڑی آواز نہیں

سنائی دیتی تھی، جس گھر کے مکین چند نفوس تھے، آج وہاں موٹروں کی وہ ریل پیل تھی کہ دیکھا کیجیے، یہ منظر بجائے خود، حرکت پیدا کرنے والا تھا، خود بخود، طبیعت میں ایک طرح کی امنگ سی پیدا ہوتی تھی، شاہدہ خود بھی اس موقع پر دلہن بنی ہوئی تھی، اور مجھے بھی اس نے دولہا بنا رکھا تھا، میرے احتجاج اور انکار کے باوجود کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی،

والد اور والدہ کے سامنے تو زنانے اور مردانے کا فرق قائم تھا، لیکن اب کون تھا کہ مجھے ٹوکتا یا شاہدہ کو روکتا، آج اس گھر میں، مشترک طور پر لیڈیز اینڈ جنٹلمین جشن مسرت منا رہے تھے، میرے صحت یاب ہونے کا جشن، میرے بعد نشاط کا جشن، میری کامیابی، اور کامرانی کا جشن!

آج مجھے اندازہ ہوا کہ شاہدہ کی سہیلیاں کتنی زیادہ ہیں، صرف سہیلیوں کا پورا جم غفیر موجود تھا، اور شاید ہی کوئی ایسی بدقسمت سہیلی ہوگی، جو اپنے شوہر کے ساتھ نہ آتی ہو، بھانت بھانت کے لوگ اس موقع پر تشریف فرما تھے، اگر میں، ذہنی طور پر اب تک بیمار نہ ہوتا، تو یہ جشن، کئی ہفتوں تک نشاط و مسرت اور تفریح و دلچسپی کا سبب بنا رہتا میرے لیے، ان آنے والی خواتین میں ایک بھی ایسی نہیں تھی، جو اپنے آپ کو، حسن لازوال کی مورت نہ سمجھ رہی ہو، اس کی چال ڈھال، وضع قطع، گفتگو، ہر چیز سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ، حسن اگر ختم ہے تو بس آپ پر، اور اس خود بینی میں مرد بھی کسی سے کم نہ تھے، شاید ہی کوئی صاحب منکسر المزاج ہوں گے، جو اپنے آپ کو کسی قابل نہ سمجھتے ہوں، ورنہ تیور کہے دیتے تھے کہ، ہم میں وہ شان جمال ہے کہ، ہمیں دیکھنے کے بعد، کسی کے لیے ہم سے دور رہنا، یا بار بار دیکھتے نہ رہنا، ممکن نہیں،

تقریباً دس بجے رات تک تو صرف تمہیدی اور تعارفی ملاقاتیں ہوتی

رہیں آپس میں، کچھ مزاج پرسی، کچھ ذاتی احوال و کوائف، کچھ رسمی باتیں، پھر ہم سب لوگ ڈائننگ ہال میں جمع ہوئے، اور میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا، کہ مہمانوں میں اس طرح الجھے رہنے کے باوجود، شاہدہ نے میز پہ ایوان نعمت کا ڈھیر کر دیا تھا، ہر شخص انگلیاں ضرور چاٹ لیتا، اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ پاس والا دیکھ رہا ہے،

اصولاً چاہیئے تو یہ تھا کہ کھانے کے بعد مجلس برخاست ہو جاتی، لیکن پھر جم گئی، اس مرتبہ میرے پاس جاوید کو جگہ ملی، جاوید، رخسانہ کا شوہر، وہی رخسانہ جس سے والدہ میری شادی کرنے پہ تلی ہوئی تھیں،

اس سے قبل بھی ایک مرتبہ سرسری سی ملاقات جاوید سے میں اپنے گھر پہ کر چکا تھا، لیکن اس روز اس سے کچھ زیادہ گفتگو کا موقع نہ ملا تھا، آج جو اس سے باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا بے حد دلچسپ آدمی ہے، باتیں کرتا ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں، معلومات اتنے وسیع کہ جس موضوع کو چھیڑ دیجیے، اور اس کے کمال کا امتحان لے لیجیے، کیا مجال ہے جو ناکام ہو جائے میرے ساتھ تو خاص طور پر، اس کا رویّہ کچھ ایسا دوستانہ، اور مخلصانہ رہا کہ میں اس سے بہت متاثر ہوا، اس کے اخلاق سے بھی اور اس کے خلوص سے بھی، چنانچہ ۱۲ بجے شب کو جب مجلس برخاست ہوئی، تو میں نے اسے کل پھر آنے کی دعوت دی تاکہ آج کی تشنگی کی تلافی ہو سکے، اور اطمینان سے باتیں ہو سکیں، پھر اس نے میرے سامنے ایک اسکیم بھی پیش کر دی تھی کہ اس کی تفصیلات پر گفتگو ضروری تھی، ! *

(۱۱)

آج جیسے شہلا نے ڈائری ختم کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

جاوید حسب وعدہ ٹھیک وقت پر پہنچ گیا، رخسانہ بھی اس کے ساتھ تھی، شاہدہ نے ذرا چیں بہ جبیں ہو کر رخسانہ کا استقبال کیا، لیکن وہ اس طرح تپاک اور گرم جوشی سے ملی کہ شاہدہ کی تیوری کے بل ختم ہو گئے، اور بہت جلد دونوں گھل مل کر، ہنسنے بولنے لگیں، شاہدہ کی یہ عادت مجھے پسند ہے کہ دل میں لپیٹ نہیں رکھتی، کسی بات پر خفا ہو تو بھی بہت جلد معاف کر دیتی ہے، اور بھول بھی جاتی ہے،

رخسانہ اور شاہدہ کو چھوڑ کر ہم دونوں ایک دوسرے کمرہ میں آ گئے، جاوید نے فوراً تقریر شروع کر دی،

ندیم بھائی! آپ نے تو والدین کا سوگ اس شان سے منایا ہے کہ کیا کوئی منائے گا، شاہدہ بھابھی سے معلوم ہوا کہ آپ اللہ کے گھر سے واپس آئے ہیں،

—— بھائی، تم بھی عجیب آدمی ہو، لوگ دعائیں مانگتے ہیں کہ ماں باپ مریں، اور آپ ہیں کہ ان کے غم میں جان دے رہے ہیں، سچ کہنا، جو آزادی، اور خود مختاری اب حاصل ہے کیا وہ والدین کے زمانہ میں بھی حاصل تھی؟، اس نعمت کی قدر کرنے کے بجائے، اس پر منہ بسورنا، آنسو ٹپکانا، بیمار پڑ جانا، یہ کیا حماقت ہے،؟ بخدا، جس روز میری والدہ کا انتقال ہوا ہے،

میری بیوی نے گھی کے چراغ جلائے، اور جس روز ابا جان دنیا سے سدھارے ہیں میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی، میری تو یہ پختہ رائے ہے کہ اولاد کی شادی کرنے کے بعد، والدین کو قطعاً مر جانا چاہیے، اور موت نہ آئے تو زہر کھا لینا چاہیے، پھر ان کی ضرورت نہیں رہتی، ——————

جاوید کی اس بے تکلفی سے میری طبیعت مکدر ہونے لگی تھی، لیکن اس تقریب نے تو وہ تاثر تقریباً ختم کر دیا جو کل اس سے مل کر، اس سے باتیں کر کے میں نے قائم کیا تھا، ذرا ناگوار انداز میں مجھے جواب دینا پڑا،

معاف کیجئے گا جاوید صاحب آپ کی یہ باتیں ——————

میں ذرا صاف گو قسم کا آدمی ہوں، آپ کی یہ باتیں مجھے سخت ناگوار گزریں، ممکن ہے آپ اپنے والدین سے عاجز آ گئے ہوں، اور ان کی وفات پر آپ کی اور رخسانہ بہن کی خوشی بجا ہو، لیکن میرے والدین ایسے نہیں تھے، میری ماں نے شاہدہ کو اولاد سے زیادہ چاہا، اور میرا باپ ہزار جان سے مجھ پر قربان تھا، میری ماں نے اور میرے باپ نے میری کوئی خواہش رد نہیں کی، جس طرح اب میں آزاد اور خود مختار ہوں اسی طرح ان کی زندگی میں بھی تھا، فرق جو کچھ ہے وہ یہ کہ اب میں ان کی سرپرستی سے، ان کی شفقت سے، ان کی محبت سے محروم ہوں، یہ غم آج بھی تازہ ہے، اور زندگی بھر ہرا رہے گا ——————

جاوید نے ایک قہقہہ لگایا، پھر مجھے گھور کر دیکھا، اور پھر چہرے کے تاثر کی ایک عجیب کیفیت طاری کر کے کہا،

" ندیم بھائی خفا ہو گئے، —————— خفا ہو گئے ندیم بھائی ہم سے، ؟ "

اور پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا، اور یکایک اس کی آنکھیں

ڈبڈبا آئیں، میرے الفاظ اتنا گہرا اثر کریں گے اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا، شرمندہ ہو کر میں نے معذرت کی،

جاوید صاحب، یہ بات نہیں ہے، میں آپ سے بالکل خفا نہیں ہوں،

آنکھوں کے ریگستان میں فوراً جاوید کے آنسو جذب ہو گئے، اس نے اطمینان سے صوفے کی پشت پہ ٹیک لگا کر، سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا،

ندیم بھائی، نہ جانے کیا بات ہے، آپ سے پہلی مرتبہ جب ملاقات ہوئی تھی، اسی وقت سے دل پہ ایک گہرا نقش قائم ہو گیا ہے آپ کا، رخسانہ سے مجھے معلوم ہوا اور وہ یہیں سے سنکر گئی تھی کہ اس صدمہ نے آپ کے ہوش و حواس حال کر دیے ہیں، میں چاہتا تھا آپ کا جی بہلاؤں، ورنہ یقین کیجیے، مجھے خود اپنے والدین کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا تھا، اب تک جب یاد کرتا ہوں آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں!

جاوید کی اس سادہ لوحی پہ مجھے ہنسی آگئی، میں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ شاہدہ اور رخسانہ آگئیں، جاوید نے شاہدہ کو خوش خبری سنائی،

وہ دیکھیے، کتنی مشکل سے ندیم بھائی کو ہنسانے میں کامیاب ہوا ہوں،!

شاہدہ یہ سنکر خوش ہو گئی، کہنے لگی واقعی یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے، یہ تو جیسے مسکرانا اور ہنسنا بھول ہی گئے ہیں،

رخسانہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "لیکن دلچسپی کا کوئی سامان بھی تو ہونا چاہیے"

جاوید نے کسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت کہا، "اور وہ سامان ہے صرف مصروفیت جو زندگی ندیم بھائی بسر کر رہے ہیں، کسی مقصد اور مشغلہ کے بغیر، وہ سم قاتل ہے، مہلک ہے، اچھا بھلا آدمی بیمار پڑ سکتا ہے، میں تو کہتا ہوں دیوانہ ہو سکتا ہے"!

رخسانہ نے جیسے کوئی بات یاد دلاتے ہوئے کہا "لیکن آپ تو ایک بڑی لمبی چوڑی اسکیم لے کر آئے تھے مصروفیت اور مشغولیت کی اس کا کیا بنا؟"

جاوید ہنسنے لگا،

راہ پہ ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

میں نے کہا جاوید صاحب تکلف کی ضرورت نہیں، نہ دو چار ملاقاتیں کرنے کی حاجت ہے، اگر آپ کوئی ایسی اسکیم رکھتے ہیں، اور کل آپ ذکر بھی کچھ اسی طرح کا کر رہے تھے کہ میری یہ بیکاری ختم ہو، کوئی مشغلہ پیدا ہو، اور یہ مصروفیت خیالات پریشاں کو گم کر دے تو میں بڑی خوشی سے اس کا خیر مقدم کروں گا، فرمایئے، —

شاہدہ نے رخسانہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا،

"آؤ چلیں، ———— ان لوگوں کو باتیں کرنے دو، !"

(۱۴)

رخسانہ اور شاہدہ کے جانے کے بعد، جاوید نے بغیر کسی تکلّف اور تمہید کے اصل مطلب پر گفتگو شروع کر دی، اس نے کہا،

ندیم بھائی، خدا نے آپ کو بھی بہت کچھ دیا ہے اور میں بھی کنگال نہیں ہوں، آپ بھی صاحب اثر و رسوخ ہیں، اور یہ خاکسار بھی کچھ بڑوں تک رسائی رکھتا ہے، کیوں نہ ہم مل کر کوئی کاروبار شروع کر دیں، نفع بھی اور مصروفیت بھی

جاوید کی ان باتوں نے میرے دل پہ اثر کیا، تنہائی اور بیکاری کی زندگی سے میں عاجز آ چکا تھا، تجویز معقول نظر آئی، لیکن رضامندی ظاہر کرنے سے پہلے میں نے کہا،

بات تو ٹھیک ہے، لیکن ایک مشکل ہے، ———— نہ کاروبار کا مجھے سلیقہ اور تجربہ ہے، نہ شاید آپ کو، ایسا نہ ہو ہم پونجی بھی گنوا بیٹھیں، ؟"

جاوید ہنسنے لگا، اس نے مجھے اطمینان دلاتے ہوئے، یقین اور عزم کے ساتھ کہا،

ہم ایسا کام ہی نہیں کریں گے، جس میں تجربہ اور سلیقہ کی خاص ضرورت ہو، فرض کیجیے، ہم، سیمنٹ کمپنی کے ایجنٹ بن جاتے ہیں، سیمنٹ کا نرخ مقرّر ہے، کمپنی کو روپیہ دے کر مال لیں گے، اور جس دن مال لیں گے اسی دن سارا روپیہ وصول ہو جائے

گا، کیونکہ اس کام میں ادھار چلتا نہیں، ہر شخص مکان بنانے کے لیے بیقرار ہے، روپے ہاتھ میں لیے پیچھے پیچھے لوگ گھومتے ہیں۔ اور پھر بھی نہیں ملتی، حساب کتاب میں بھی کوئی دقت نہیں، جتنی بوریاں ملیں گی، ان کا حساب رکھنا کیا مشکل ہے، فرض کیجیے ایک ہزار بوریاں پانچ ہزار کی ہم نے خریدیں، اور فی بوری ایک روپیہ نفع لے کر چھ ہزار میں بیچ دیں، اس میں کتنے سلیقہ اور تجربہ کی ضرورت ہے ——— بتایئے ،!"

جاوید کی اس دلیل نے میرے سارے شبہات دور کر دیے۔ میں فوراً رضامند ہو گیا، میں نے کہا "اس طرح تو واقعی کوئی دشواری پیش نہیں آسکے گی"

جاوید نے ایک نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا، ——— "اور لیجیے، فرض کیجیے، ہم سگریٹ کی ایجنسی ہی لے لیں، وہ بھی نوٹ کی طرح چلے گی ادھر آئی ادھر گئی، ——— اصل میں نقصان اس کاروبار میں ہوتا ہے، جہاں مال مختلف قسم کا ہو، گودام میں پڑا رہتا ہو، بھاؤ چڑھتا اترتا رہتا ہو، چوری کا اندیشہ ہو، دفتر کے کلارک اور محرر چپکے چپکے غبن کرتے ہوں، اور اس غبن کا پتہ اس وقت چلتا ہو، جب وہ روپیہ خرچ کر چکے ہوں، یہاں تو سیدھا سادھا حساب ہے، ایک ہزار بوریاں آج آئیں، ایک ہزار روپیہ نفع کا آج ہی ہمارے ہاتھ میں آجانا چاہیے، یا پانچ ہزار کے سگریٹ ہم نے خریدے، آج ہی مال فروخت کر کے، ہزار پانچ سو نفع کے کما لینے چاہئیں"

اب میں بالکل مطمئن ہو چکا تھا، میں نے کہا "مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے، جب چاہیے، میں شرکت کے لیے تیار ہوں"

جاوید نے مطمئن نظروں سے مجھے دیکھا اور گویا ہوا، "تو پھر کل دس بجے کو میں حاضر ہو جاؤں گا، معاہدۂ شرکت پر دستخط ہو جائیں گے، کل ہی بینک میں اکاؤنٹ کھل جائے گا، ہم دونوں ۲۵ ، ۲۵ ہزار روپے داخل کر دیں گے !!"

میں نے جواب دیا "بالکل درست، ——————— ضرور یہ مراحل طے کر لیجیے،"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ رخسانہ اور شاہدہ پھر آگئیں، رخسانہ نے جاوید سے کہا،

"آپ تو ایسے جم کر بیٹھے ہیں کہ اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے، گھر بھی چلیں گے یا نہیں؟ آٹھ بج رہے ہیں، ———"

جاوید نے اٹھتے ہوئے کہا، "چلو بھئی خفا کیوں ہوتی ہو،"

شاہدہ بولی، "اب کھانا کھا کر جائیں گے آپ حضرات،"

میں دل میں بہت شرمندہ ہوا، کہ یہی بات میں نے کیوں نہ کہی؟ بہر حال تائید تو کر ہی دی، "ہاں جاوید صاحب بغیر کھانا کھائے آپ نہیں جا سکتے"

شاہدہ نے پوچھا، "اور آپ حضرات کی گفتگو کا نتیجہ کیا نکلا؟ رخسانہ تو بڑے ہوائی قلعے بنا رہی تھیں"

جاوید نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، "قلعہ تو واقعی بن گیا، لیکن وہ ہوائی نہیں ہے، کل سے ہماری زندگی کا نیا دور شروع ہوگا، سارے معاملات طے ہو گئے،"

پھر شاہدہ کی طرف مخاطب ہو کر وہ گویا ہوا، "آپ ندیم بھائی کے بارے میں بہت فکر مند رہتی تھیں، میرا شکریہ ادا کیجیے، صرف آج کے کھانے پر نہ ٹرخا دیجیے، کل میری ایک شاندار دعوت بھی کیجیے، اب آپ کو یہ شکایت نہیں رہے گی کہ یہ اکیلے بیٹھے بیٹھے غمگین اور افسردہ رہا کرتے ہیں، اب یہ کام کریں گے، محنت کریں گے، معروف رہیں گے، کاروبار کریں گے، اور شاید وہ دن بھی جلد آجائے گا، جب آپ شکایت کریں گی کہ اتنی زیادہ مصروفیت بھی اچھی نہیں ہوتی،"

اتنے میں نخھے نے آکر اطلاع دی کہ کھانا میز پر لگا دیا گیا ہے، ہم لوگ ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے ڈرائنگ روم میں پہنچے، کھانے کے دوران میں بھی خوب مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں، پھر کافی کا دور چلا، اور اس کے بعد، پھر باتوں کا دور شروع ہو گیا، شاہدہ نے پوچھا، "تو پھر کون سا بزنس شروع کر رہے ہیں آپ لوگ؟"

جاوید نے جواب دیا "سیمنٹ کا، رخسانہ نے ہوائی قلعہ کا طعنہ دیا تھا، آپ ہی بتایئے کیا ہوائی قلعے سیمنٹ سے بنتے ہیں؟"

ہم سب اس پر لطف فقرہ پہ پھڑک اٹھے، میں نے کہا، جاوید صاحب آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں،"

رخسانہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، جی ہاں، یہ صرف دلچسپ آدمی ہیں، شاید آپ کے ساتھ رہ کر کام کے آدمی بھی ہو جائیں"

شاہدہ ہنس پڑی، اس نے رخسانہ کو ٹوکا، "تو کیا جاوید صاحب کام کے آدمی نہیں ہیں؟"

رخسانہ نے جواب دیا، اگر کام کے آدمی کا کام یہ ہوتا ہے کہ خوب ہنسے، قہقہے لگائے، ناول پڑھے، سینما دیکھے، دوستوں کی دعوتیں کرے، رات کے دو دو بجے تک تاش کھیلے تو بے شک ان سے بڑھ کر کام کا آدمی کون ہوگا؟"

میں نے جاوید کو چھیڑتے ہوئے کہا، "واہ بھئی آپ تو چھپے رستم نکلے، ہم اگر اس طرح کی حرکتیں کریں تو گھر میں داخلہ بند ہو جائے گے،"

جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا، میرا بھی کئی مرتبہ داخلہ بند ہو چکا ہے"

میں نے ایک قہقہہ لگایا، اور پھر رخسانہ سے پوچھا، یہ سچ کہتے ہیں؟"

وہ بولی، یہ ان کے اختیار میں ہے، جب چاہتے ہیں سچ بولنے لگتے ہیں، جب

— مرضی ہوتی ہے تو ایسی افسانہ طرازی کرتے ہیں کہ بس یہ کہیں اور سنا کرے کوئی ،!"

پھر وہ شاہدہ سے مخاطب ہوئی ، اور پوچھنے لگی "واقعی تم اتنا تشدد کرتی ہو ندیم بھائی پر ،!؟"

شاہدہ نے جواب دیا " نہیں رخسانہ ہم دونوں ایک دوسرے کے مزاج داں ہیں ، نہ وہ کوئی ایسی بات کرتے ہیں جو مجھے گراں گزرے ، نہ میں کوئی ایسی بات کرتی ہوں جس سے انھیں شکایت پیدا ہو"

رخسانہ نے رشک کی نظر سے شاہدہ کو اور حسرت کی نگاہ سے جاوید کو دیکھا اور بولی "سن لیا آپ نے ، یوں گھر بستے ہیں"

پھر وہ شاہدہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی " سچ پوچھو تو ، کاروبار کی طرف میں نے اسی لیے انھیں متوجہ کیا ہے کہ ذرا آدمی بن جائیں ، ویسے شریک ہونے کے لیے نہ جانے کتنے دوست موجود ہیں ، لیکن ان کے دوستوں سے نہ جانے کیوں مجھے اللہ واسطے کا بیر ہو گیا ہے ، مجھے ہر شخص مطلب کا یار نظر آتا ہے ، اسی لیے ، میں نے جتنے نام انھوں نے پیش کیے سب نامنظور کر دیے ، اور صاف کہہ دیا ، اگر کاروبار کرنا ہے تو صرف ندیم بھائی کے ساتھ کیجیے ، ورنہ اطمینان سے بیٹھے رہیے ، ہمارا روپیہ کچھ کاٹ نہیں رہا ہے نہیں ،!"

شاہدہ نے مجھ سے سوال کیا تو پھر طے ہو گیا سب کچھ ، واقعی آپ لوگ شروع کر رہے ہیں کاروبار مل کر ؟"

میں نے جواب دیا ، ہاں بھئی ساری باتیں طے ہو گئیں"

جاوید نے کہا صرف ایک بات رہ گئی ، یعنی دعوت ، امید ہے کل وہ بھی ہو جائے گی"

شاہدہ مسکراتی ہوئی بولی "ہر روز عید نہیں کہ حلوہ خورد کے، دعوت آپ کو کرنا چاہیے، نہیں تو پھر رخسانہ کو،!"

رخسانہ نے بڑی آمادگی کے ساتھ کہا "ضرور!"

اور پھر یہ مجلس کوئی گیارہ بجے رات کو برخاست ہو گئی! ٭

(۱۳)

ہم دونوں نے ملکر کاروبار شروع کر دیا، چند ہی روز میں اندازہ ہو گیا کہ جاوید کی طبیعت کو کاروبار سے بے حد مناسبت ہے، پہلے مہینہ میں ہم میں سے ہر شخص کو تمام مصارف وضع کرنے کے بعد، دو دو ہزار روپے کا فائدہ ہوا، ایسے شاندار آغاز کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، مجھ سے زیادہ شاہدہ خوش تھی، اسے دوہری خوشی تھی ایک تو میرے لیے مستقل مشغلہ پیدا ہو گیا، دوسرے ایسا تسلّی بخش کاروبار شروع ہوا، جس نے پہلے ہی مہینہ میں ہُن برسا دیا، یہی حال رخسانہ کا بھی تھا، اس کی خوشی بھی حد بیان سے باہر تھی، شاہدہ سے معلوم ہوا، رخسانہ کو ویسے تو جاوید اچھی طرح رکھتا ہے، لیکن، ہے تماشبین قسم کا آدمی، اور ایک عورت اپنے شوہر کی ہر کمزوری معاف کر سکتی ہے، مگر نہیں معاف کر سکتی، تو یہ جرم کہ وہ کسی اور عورت سے بھی جائز یا ناجائز طور پر وابستہ رہے، اور جاوید صاحب کسی ایک سے نہیں کئی سے وابستہ تھے، وابستگی قائم تھی، عورتیں بدلتی رہتی تھیں، اس بات کا رخسانہ کو بہت دکھ تھا، وہ شاہدہ کی سرد مہری کے باوجود اسی لیے، اس سے ملتی رہی اور روابط قائم کرتی رہی کہ کسی طرح میں اور جاوید شریک کار بن جائیں، نہ جانے کیوں اسے یقین تھا اگر جاوید میرے ساتھ لگ گیا، تو ضرور اس کی اصلاح ہو جائے گی، اور تمام خامیاں اور خرابیاں دور ہو جائیں گی، شاہدہ

نے یہ باتیں بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہیں، رخسانہ کی اس ذہنی کوفت سے اسے صدمہ تھا، ہمدردی تھی، وہ چاہتی تھی رخسانہ خوش رہے، خوشی کی زندگی بسر کرے، یہ کانٹا جو جاوید کے طرز عمل نے اس کے قلب نازک میں پیوست کر دیا ہے، نکل جائے کسی طرح، مجھے بھی یہ باتیں سن کر بڑا افسوس ہوا، مجھے رخسانہ سے محبت تو کبھی نہیں تھی، لیکن دور کا رشتہ بھی تھا، اور سب سے بڑا رشتہ انسانیت کا تھا، جاوید کے بارے میں یہ باتیں سن کر مجھے اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی، اور میں نے شاہدہ سے وعدہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو گا، اس شخص کی یہ عادتیں چھڑا کے رہوں گا، چنانچہ میں نے وطیرہ یہ اختیار کیا کہ، شام کو کمپنی کے دفتر سے اٹھ کر جاوید کو بھی اپنے ساتھ لے آتا، شاہدہ پہلے ہی فون کر کے رخسانہ کو بلا چکی ہوتی، پھر یا تو ہم لوگ آپس میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتے، ریڈیو سنتے، ریکارڈ سنتے، واقعات ملکی و ملی پر تبصرہ کرتے، تجارتی اور کاروباری مسائل پر اظہار خیال کرتے، یا کسی باغ میں، کسی پارک میں تفریح کے لیے چلے جاتے، وہاں سے اٹھتے تو کسی سینما کا رخ کرتے، اور کوئی اچھی سی تصویر دیکھ آتے، پھر واپس آ کر ساتھ کھانا کھاتے اور اس کے بعد پھر بڑی دیر تک گپ شپ کرتے، اور جب سونے کا وقت آ جاتا تب رخصت ہو جاتے، اس معمول نے روز مرہ کے معمول کی صورت اختیار کر لی تھی، شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہو کہ اس کے خلاف کسی پروگرام پر عمل کیا جاتا!"

میرے اس طرز عمل نے واقعی بڑا اچھا اثر کیا، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہو گا، کہ بڑی حد تک جاوید کی اصلاح ہو گئی، نہ وہ خود غرض، اور مطلبی دوست رہ گئے، نہ وہ تماشبینی کا چسکہ باقی رہ گیا، اب جاوید تھا، اور کمپنی کا دفتر یا میرا گھر، باہم سب کی مشترک مجلس جس میں شاہدہ، رخسانہ، جاوید، اور میں شریک ہوتے،

بہت جلد، ہم چاروں آدمیوں نے دوستی کی منزل سے گزر کر کنبہ کی صورت اختیار کر لی، ہر وقت کی نشست برخاست، ملاقات، ساتھ اور رفاقت نے، وہ حجاب بھی ختم کر دیا، جو دو غیر آدمیوں میں ہُوا کرتا ہے، بہت جلد جاوید نے مجھے اپنا راز دار بنا لیا، اب نہ جاوید کی کوئی بات مجھ سے پوشیدہ تھی، نہ میری کوئی بات ان سے پنہاں تھی، اسی طرح رخسانہ اور شاہدہ میں بھی خلوص، دوستی، اور اپنائیت کے چینگ بڑھ رہے تھے، دونوں ایک جان دو قالب ہو رہی تھیں، یا تو شاہدہ رخسانہ کے نام سے بدکتی تھی، اس کی تعریف سنکر چراغ پا ہو جاتی تھی، اس سے ملنا اور اس کا اپنے ہاں آنا جانا پسند نہیں کرتی تھی، یا اب ایسا ہُوا کہ رخسانہ کے بغیر شاہدہ کو ایک پل قرار نہیں آتا تھا، کوئی جلسہ ہو، مجلس ہو، مجمع ہو، تقریب ہو، دعوت ہو، ممکن نہیں کہ شاہدہ جائے، اور رخسانہ نہ جائے، یا رخسانہ جائے اور شاہدہ نہ جائے دونوں نے ہمزاد کی صورت اختیار کر لی تھی، جہاں ایک وہاں دوسرا، یہی حال ہم دونوں کا، یعنی میرا، اور جاوید کا تھا، بالکل من تو شدم، تو من شدی والا معاملہ ہو رہا تھا،

شاہدہ اپنی جگہ خوش تھی کہ میرا غم اس نئی مصروفیت نے جذب کر لیا، رخسانہ اپنی جگہ مسرور تھی کہ جاوید کو میرے ساتھ نے ایسا نقد بخشی کہ اس نے نئی زندگی پالی، اس کا اجڑا ہُوا دل پھر سے آباد ہو گیا،

ایک روز دفتر سے ہم لوگ حسب معمول اٹھے، لیکن جاوید سیمنٹ کمپنی کے جنرل مینجر سے بعض خاص معاملات طے کرنے چلا گیا، اس طرح کے سارے کام وہی کرتا تھا، میں گھر واپس آ گیا، شام کا وقت تھا، لان میں شاہدہ اور رخسانہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، میرے اور جاوید کے لیے دو کرسیاں پہلے سے رکھی ہوئی تھیں، شاہدہ نے مجھے تنہا آتے دیکھا، تو پوچھا، جاوید صاحب کہاں رہ گئے ، ؟"

میں نے جواب دیا ،، وہ کمپنی کے ایک ضروری کام سے گئے ہیں ، اور ذرا دیر میں آئیں گے ،،

شاہدہ نے پوچھا ، تو پھر چائے منگاؤں ، ؟"

میں نے کہا ہاں بھئی چائے ضرور پئیں گے ، جاوید تو وہیں سے پی کر آئے گا !"

شاہدہ نے رخسانہ کی طرف دیکھا اور وہ اٹھ کر چلی گئی ، گو ہمارے گھر کے معاملات اور کاروبار میں اس دریعہ رخسانہ دخیل ہو چکی تھی ، کر شاہدہ کے قائم مقام کی حیثیت سے بہت سی چیزوں کی انچارج بن گئی تھی ، چنانچہ اس وقت شاہدہ کا اشارہ پاکر وہ میرے لیے چائے کا بندوبست کرنے گئی تھی ، میں نے کہا ،،

اب تو تم میں اور رخسانہ میں بڑی گاڑھی چھن رہی ہے ؟"

" وہ ہنستی ہوئی بولی تو آپ کو کیوں رشک ہو رہا ہے ، ؟ میں نے تو آپ کے اور جاوید صاحب کے بڑھتے ہوئے مراسم و تعلقات پر کبھی اعتراض نہیں کیا ، حالانکہ ـــــــــ !

میں نے سوال کیا ،، کہو کہو ، کیا کہہ رہی تھیں ؟ رک کیوں گئیں ، کوئی خاص بات آئی تھی ذہن میں ؟"

وہ بولی ،، جی ہاں ، شروع شروع میں جاوید صاحب کے کارنامے رخسانہ کی زبانی سن کر میں بہت خائف رہنے لگی تھی ، مجھے ڈر تھا کہیں آپ بھی جاوید صاحب کے رنگ میں نہ رنگ جائیں ، لیکن شکر ہے میرا حسن ظن صحیح ثابت ہوا ، نہ صرف یہ کہ آپ ان کے رنگ میں نہیں رنگے ، بلکہ انھیں اپنے رنگ میں رنگ لیا ، اور سچ کہتی ہوں اس طرح آپ نے ثواب کمایا ہے ،،

میں نے پوچھا وہ کس طرح ؟ یہ بھی بتا دو ،،

وہ کہنے لگی ،، وہ اس طرح کہ آپ نے میری ایک نہایت عزیزہ ، اور مخلص

سہیلی کی چھینی ہوئی خوشی اسے واپس دے دی، پہلے میں دیکھتی تھی رخسانہ، ہر وقت چپ چپ رہتی تھی، مسکراتی بھی تھی تو افسردگی نمایاں ہو جاتی تھی، لیکن اب ہر وقت اس کی باچھیں کھلی رہتی ہیں، اب اسے جاوید صاحب سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے، اور آپ کی تو اتنی ممنون ہے کہ ہر وقت کلمہ پڑھا کرتی ہے آپ کا، آپ کے اخلاق، کردار، سیرت، شخصیت ہر چیز کی تعریف میں رطب اللسان رہتی ہے، بعض وقت تو مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں یہ آپ سے محبت تو نہیں کرتی لیکن جب دیکھتی ہوں کہ آپ کی تعریف کر کے جاوید صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ان کے سدھر جانے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے، اور زیادہ خوشی ان کے چہرے سے ٹپکنے لگتی ہے، تو اندازہ ہوتا ہے، یہ صرف ممنونیت ہے، جو اسے آپ کی تعریف کرنے پر مجبور کرتی ہے، ورنہ وہ چاہتی جاوید صاحب ہی کو ہے"

میں نے کہا "شکر ہے تم نے مجھے مطمئن کر دیا، ورنہ تمہاری تمہید سے تو میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے کہ دیکھئے، کوئی نیا شگوفہ نہ کھلے"

شاہدہ ہنسنے لگی، اس نے کہا "اب میں بالکل مطمئن ہوں، آپ کی طرف سے تو کبھی بھی غیر مطمئن نہیں تھی، لیکن رخسانہ کی طرف سے بھی اب مجھے کوئی اندیشہ نہیں ہے،

میں نے کہا "شکر ہے، لیکن وہ تمہاری رخسانہ چائے لینے گئی ہیں یا کھانا پکانے؟"

اتنے میں رخسانہ ضمنے کے سر پر ٹرے رکھوا کر لے آئی، اس نے کہا "معاف کیجیے گا، ذرا دیر ہو گئی، ——— لیکن یہ دیر معذرت ہوئی"

میں نے متحیر نظروں سے اسے دیکھا، اور کہا، دیر ہو گئی تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن عمداً دیر ہو گئی، یہ فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی "بات یہ ہے کہ اب میں ہر وقت یہاں مسز کی داروغہ بنی بیٹھی رہتی ہوں، اس وقت شاہدہ نے جب مجھے جانے کا اشارہ کیا تو میں نے فیصلہ کیا ذرا آپ دونوں کو اطمینان سے گفتگو کرنے کا موقع دوں" ——— لیکن شاید زیادہ دیر تو نہیں ہوئی، کیوں شاہدہ؟"

شاہدہ روٹھ گئی "ہٹو بھی تمہیں جو سوجھتی ہے ایسی ہی سوجھتی ہے، مجھے اگر کچھ باتیں کرنا بھی ہوتیں تو کیا تمہارے سامنے نہیں کہہ سکتی تھی، کچھ پردہ ہے تم سے؟ ——— تمہاری اعتراض کی عادت اب تک نہیں گئی، حالانکہ میں تم سے ذرا حجاب نہیں کرتی"

رخسانہ نے چائے بنا کر پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، "سچ کہنا کیا باتیں ہو رہی تھیں اس وقت تم دونوں میں؟"

شاہدہ نے مسکراتے ہوئے کہا، "تمہارے ہی متعلق ہم دونوں گفتگو کر رہے تھے، میں ان سے کہہ رہی تھی، رخسانہ آپ کی بہت ممنون ہے کہ جاوید صاحب کو آپ راہ راست پر لے آئے، ——— کچھ میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

رخسانہ ممنون انداز میں بولی "بالکل سچ کہا، واقعہ یہ ہے کہ میں تو ان کی اصلاح سے مایوس ہو چکی تھی، لیکن خدا کا شکر ہے وہ ٹھیک ہو گئے، اور حیرت یہ ہے کہ اس قدر جلد راہ راست پر آ گئے؟"

میں نے پیالی ختم کر کے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، "پھر تو تمہیں جبری ولایت کا قائل ہو جانا چاہیے!"

رخسانہ نے دوسری پیالی بنائی، اور میرے سامنے رکھ کر کہنے لگی، "معلوم نہیں آپ ولی ہیں یا نہیں، لیکن میرے لیے تو آپ نے سچ مچ وہی کام کر دکھایا جو کوئی ولی کر سکتا ہے"

میں ہنسنے لگا، ابھی میرا قہقہہ گونج رہا تھا کہ حضرت جاوید خراماں خراماں تشریف لے آئے، چائے کی جو پیالی میری طرف رکھی تھی، اسے اپنی طرف کھینچ کر، کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے ایک گھونٹ پیا، پھر رخسانہ کی طرف اسے بڑھاتے ہوئے بولے "شکر بہت کم ہے"!

رخسانہ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا، "ڈالے دیتی ہوں، توبہ ہے آپ تو شکر کے اتنے رسیا ہیں کہ خدا کی پناہ، لیکن آخر اس قدر جلد بازی کی کیا ضرورت تھی آپ کو دیکھتے ہی میں نے آپ کے لیے چائے بنانا شروع کر دی تھی، مفت میں ندیم بھائی کی پیالی جھٹال دی"

میں نے جاوید کے لیے جو پیالی بن رہی تھی اسے اپنی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، "کوئی مضائقہ نہیں —————— ہاں بھئی جاوید اس قدر جلد کیسے واپس آ گئے"؟

شربت کی طرح چائے پینے کے بعد جاوید نے کہا، "کمبخت جنرل منیجر ملا نہیں، معلوم ہوا صاحب بہادر کلب تشریف لے گئے ہیں"

میں نے کہا، "تو تم بھی کلب تشریف لے گئے ہوتے"؟

وہ گویا ہوا، "جی تو بہت چاہا کہ چلا جاؤں، مدتوں اس کلب کا ممبر رہا ہوں، لیکن کچھ تمہاری دہشت، کچھ رخسانہ بیگم کا خوف کعبہ میرے پیچھے تھا کلیسا میرے آگے نتیجہ یہ ہوا کہ چپ چاپ قید خانہ میں واپس آ گیا"

شاہدہ اور رخسانہ، دونوں کو ہنسی آ گئی، شاہدہ نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا،

اچھا تو ہمارے غریب خانہ کو آپ قید خانہ سمجھتے ہیں، سن رہے ہیں ندیم صاحب آپ ؟"
میں نے جاوید سے کہا، کیوں حضرت، ؟ ہمارے اس خوب صورت، اور دیدہ زیبا
گھر کو قید خانہ سے آپ نے کیوں تشبیہ دی ؟ آخر بدذوقی کی کوئی حد بھی ہے، ؟"
"جاوید نے کہا، اچھا بھائی میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، یہ گھر قید خانہ نہیں
جنت کا ٹکڑا ہے، اب تو ہوئے خوش، اگر جنت سے بھی کوئی بڑی اور اچھی چیز ہو سکتی
ہو، تو اس کا نام بتا دو، ! ———— مگر شرط یہ ہے کہ آج سینما ضرور
چلنا ہے، !"
شاہدہ نے رخسانہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور بولی" اس تجویز پہ ہم بھی صاد کرتے ہیں،
آؤ، رخسانہ جلدی سے تیار ہو لیں ! "

دن گذرتے رہے، وقت گذرتا رہا، حالات پلٹا کھاتے رہے میرے اور جاوید کے تعلقات، عزیزانہ حدود سے بھی آگے گزر گئے، شاہدہ اور رخسانہ کی محبت ارتقا کی آخری حد تک پہنچ گئی، ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر تھے، اور ماننا پڑے گا، اس سفینہ کا ناخدا جاوید تھا، ظالم کو نہ جانے کہاں سے یہ سلیقہ حاصل ہوتا تھا کہ جس سے بات کرتا تھا اپنا بنا لیتا تھا کوئی مشکل سے مشکل مسئلہ ہو وہ چٹکی بجاتے میں حل کر دیتا تھا، جہاں بات بننے کی کوئی صورت نہ ہو، جاوید صاحب تشریف لے گئے، اور چند منٹ میں کامیاب وشادکام تشریف لے آئے، میں تو اسے جادوگر کہا کرتا تھا، رفتہ رفتہ کاروبار نے خاصی وسعت حاصل کرلی تھی، اب ہماری کمپنی کے پاس سگرٹوں کی ایجنسی بھی آگئی تھی، اس کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں تھیں جن کی سول ایجنسی ہمارے پاس تھی، ہم میں سے ہر شخص ہزاروں روپیہ مہینہ نہایت آسانی سے کما لیتا تھا،

ایک روز وقت مقررہ پر میں دفتر پہنچا تو جاوید صاحب خلاف معمول غائب، میں نے کلارک سے پوچھا، معلوم ہوا، اب تک تشریف نہیں لائے ہیں، خیال ہوا کہ کسی کام سے چلا گیا ہوگا، بڑی دیر کے بعد وہ آیا، لیکن کچھ گھبرایا گھبرایا سا، پریشان پریشان سا، میں نے پوچھا، جادوگر صاحب خیریت تو ہے آج کے طور کچھ بے طور نظر

آہ ۔ یہ ہیں، کیا رخسانہ سے لڑ کر آئے ہو یا اس نے گھر سے نکال دیا، ؟"
جاوید پہلے تو کچھ خاموش ہو رہا، پھر کہنے لگا، "وہ خود نکل گئی، !"
یہ سنکر مجھے سناٹا آ گیا، میں نے کہا کیا بکتے ہو ؟"
اس نے کچھ الجھے ہوئے انداز میں کہا "سچ کہتا ہوں واقعی چلی گئی"
اس جواب پر مجھے اور حیرت ہوئی، میں نے پوچھا خدا کے بندے جائے گی کہاں
ماں کے پاس چلی گئی ہوگی، چلو یہاں سے سیدھے وہیں چلتے ہیں منا لائیں گے اسے،
جاوید نے مایوسی کے لہجہ میں کہا "نہیں مانے گی ؛ بڑی ضدی اور خود سر عورت ہے، گئی تو گئی، !"
اتنے دنوں میں رخسانہ کی سیرت اور کردار کا مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا، اور میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس میں دولت مند ماں باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود خوبیاں زیادہ ہیں خامیاں کم، مالدار گھرانوں کی لڑکیوں میں جو رعونت ہوتی ہے، وہ تو اس میں ذرا بھی نہیں تھی، فیشن کا بے شک اسے شوق تھا لیکن کس عورت کو خواہ وہ خوب صورت ہو، یا بدصورت، فیشن کا شوق نہیں ہوتا، ؟ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ شوہر پرست عورت تھی، جاوید کو فرش سے عرش پہ پہنچانے والی وہی تھی، جاوید کھاتا پیتا آدمی ضرور تھا، لیکن وہ رخسانہ ہی تھی، جس نے اپنی دولت کا بڑا حصہ اس کے قدموں پہ لا کر ڈھیر کر دیا تھا، اسی دولت سے اس نے خوب گلچھرے اڑائے مزے کیے، عیش کیے، اور پھر وہ رخسانہ ہی تھی، جس نے اسے کاروبار کا مشورہ دیا، اور میرے ساتھ شامل ہو جانے پر مجبور کر دیا، کیونکہ میرے چال چلن، رہن سہن اور وضع و طریق پر اسے پورا اعتماد تھا، پھر شاہدہ کے ذریعہ کچھ اڑتی ہوئی باتیں جاوید کے کردار کے بارے میں بھی میرے کانوں تک پہنچ چکی تھیں، اور ظاہر ہے شاہدہ کا ذریعہ معلومات رخسانہ ہی تھی، ان باتوں کے بعد بھی، رخسانہ نے

نہ صرف جاوید سے نفرت نہیں کی، بلکہ اس کی زندگی سنوارنے کے لیے، اپنے ایک مابدولت منگیتر تک کا ممنون احسان بننا منظور کر لیا، جو عام طور پر ایک نامرغوب سی بات تھی، یہ سب باتیں دفعتہً میرے ذہن میں آ گئیں، میں نے کہا "تم احمق ہو، رخسانہ کو منانا پڑے گا، اور تمھارا فرض ہے کہ اسے مناؤ، اور اگر یہ فرض تم نے انجام نہ دیا تو مجھ سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ"

جاوید نے معذرتی لہجہ میں کہا "آپ سے لڑنے کے لیے دل گردہ کہاں سے لاؤں گا، اور مجھے رخسانہ کو بھی منانے میں تامل نہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ تو اس مرتبہ کچھ ایسی بگڑی ہے کہ کہہ رہی تھی اب زندگی بھر تمہ صورت دیکھوں گی، نہ دکھاؤں گی"!

میں نے کہا "ضرور تم نے کوئی واہیات بات کی ہوگی، ورنہ ایسے فیصلہ کن الفاظ اس جیسی شوہر پرست عورت کی زبان سے نہیں نکل سکتے تھے" بہرحال وہ ہے کہاں؟ کہاں گئی ہے؟"

جاوید نے بتایا "قادر پور میں اس کی ایک خالہ زاد بہن رہتی ہے اسی کے ہاں گئی ہے، اور اب کبھی نہ آنے کا اعلان کر گئی ہے"

میں نے پوچھا "لیکن تم سے گناہ کیا سرزد ہوا تھا؟"

جاوید نے معصوم سی صورت بنا کر کہا "جب سے آپ کا ساتھ چھوٹا ہے میں بھول چکا ہوں گناہ کیا ہوتا ہے" ——— ہائے وہ زندگی جو گناہ کی تھی"!

"مجھے ہنسی آ گئی، میں نے چھیڑتے ہوئے کہا، ہاں گناہ کی زندگی بڑی رنگین ہوتی ہے، شاید وہی رنگینیاں یاد آ گئیں اس وقت؟"

جاوید نے ایک آہ سرد کے ساتھ جواب دیا "ندیم بھائی، زخموں پر نمک نہ

چھوڑیئے، سچ پوچھیے تو زندگی وہی ہے جو گناہ سے آلودہ ہو، گناہ میں لذت ہے راحت ہے، لطف ہے، کیف ہے، سرمستی ہے، سرخوشی ہے، اور ثواب میں کیا دھرا ہے بجز مشقت کے ——— اور مشقت بھی نہایت خشک قسم کی، حسین چہروں پہ نظر نہ ڈالنا، حسینوں سے راہ و رسم نہ بڑھانا، اچھا کھانا نہ کھانا، دوسروں کی خدمت کرنا، ہر وقت خدا سے ڈرنا، نماز پڑھنا، روزے رکھنا، یہ ثواب ہے، کتنا محنت طلب، !!"

یہ باتیں سُن کر میں ذرا سنجیدہ ہوگیا، میں نے کہا، "تم پھر بھٹک چلے، یاد رکھو، میرا تمھارا ساتھ اسی وقت تک نبھ سکتا ہے، جب تک تم آدمی بنے رہو، اس دائرہ سے نکلے اور ہمارے راستے الگ ہوئے"

یہ سُن کر جاوید کا رنگ رُخ بدل گیا، اس نے کہا، "نہیں ندیم بھائی ایسا نہ کہیے آپ کے لیے میں ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں، ہر رنگینی سے دست کش ہو سکتا ہوں، اتنے دنوں کے بعد، اتنی مشکل سے ایک مخلص رفیق ملا ہے، اسے نہیں چھوڑ سکتا، ایسا نہ کہیئے، واپس لیجئے اپنے الفاظ ورنہ میں دیوار سے ابھی اور یہیں سر پھوڑنا شروع کر دوں گا، ———— !"

یہ الفاظ جاوید نے کچھ ایسے دردناک پیرایہ میں ادا کیے کہ میں بہت متاثر ہوا، میں نے استمالت اور ملاطفت کے لہجہ میں کہا، "میرا یہ مطلب کب تھا، کہ تم سے قطع تعلق کر لوں گا، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمھاری زندگی سدھر جائے، تم نے ایک نہایت نازک موقع پر دوستی کا حق ادا کیا، اور میری زندگی کا جو غموں سے نڈھال ہو رہی تھی رُخ بدل دیا، ورنہ میں اب تک کب کا مر چکا ہوتا، پھر کیا میرا یہ فرض نہیں ہے کہ تمھیں اگر لڑکھڑاتے دیکھوں تو سہارا دوں؟ کیا تم مجھ سے یہ حق چھین لینا چاہتے ہو؟"

جاوید کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت پیدا ہوئی، اس نے کہا "نہیں مجھ میں یہ طاقت کہاں کہ آپ سے یہ حق چھین لوں، بہت سی ٹھوکریں کھا کر میں آپ کے آستانے پر پہنچا ہوں، اب یہاں سے موت کے سوا کوئی چیز مجھے نہیں ہٹا سکتی"

ان پُر خلوص الفاظ کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا، میں نے کہا "بہر حال رخسانہ کو جلد واپس آنا چاہیئے، اگر ضرورت ہو تو تمہیں خود اسے لینے کے لیے قادر آباد جانا چاہیئے، لیکن جب تک وہ نہیں آتی، تم میرے پاس رہو گے، تاکہ تنہائی کی آزادی پھر تمہیں آمادہ معصیت نہ کر دے، تمہاری بہت سی باتیں میرے کانوں تک پہنچ چکی ہیں، لیکن اطمینان رکھو رخسانہ سے اس موضوع پر میری کبھی بات چیت نہیں ہوئی"

یہ معلوم کر کے کہ اس کی زندگی کے بعض تاریک گوشوں سے میں واقف ہو چکا ہوں، اس کا چہرہ سفید پڑ گیا، لیکن میں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا "زندگی میں ہر شخص ٹھوکر کھاتا ہے، ہر شخص سے غلطی ہوتی ہے، قابل ملامت وہ انسان ہے جو غلطی پر اصرار کرے، غلطی کرتا رہے، لیکن جو محسوس کرے کہ اس سے غلطی سرزد ہوئی تھی، اور پھر اس سے تائب ہو جائے وہ تو بڑا قابل قدر انسان ہے، تم سے اگر کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں، تم نے اگر ٹھوکر کھائی تو سنبھل بھی گئے، تائب بھی ہو گئے، یہی انسانیت کا جوہر ہے، اسی لیے میں تمہیں اتنا عزیز رکھتا ہوں، اسی لیے ایک قیمتی امانت کی طرح تمہیں اپنے گھر لیے چل رہا ہوں، اور جب رخسانہ آجائے گی تو یہ امانت اسے واپس کر دوں گا، اور مجھے یقین ہے کہ وہ جلد آئے گی، اس لیے کہ تمہارے بغیر وہ بھی سکھ اور چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتی، تم دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن چکے ہو، یہ مجھے یقین ہے، بہر حال یہ گھر چل

کر سوچیں گے کہ رخسانہ کس طرح واپس بلائی جائے ، ؟"

جاوید بالکل مطمئن ہو گیا ، اور میرے پاس سے اٹھ کر اپنے کام میں لگ گیا ، کچھ خطوط لکھوائے ، کچھ لوگوں سے فون پہ باتیں کیں ، روزانہ کا حساب آمد و خرچ دیکھا ، پھر اٹھا ، اور کہنے لگا ، "میں ذرا مسٹر فاروق کے ہاں جا رہا ہوں ، کئی بل ان کے ذمہ باقی ہیں اور وہ ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہے ہیں ، !"

میں نے جواب دیا "شوق سے تشریف لے جایئے ، لیکن وہاں سے سیدھے غریب خانہ پر تشریف لایئے گا ، اور یہ فیصلہ کر کے کہ جب تک رخسانہ نہیں آجاتی آپ اسی گیسٹ ہاؤس میں مقیم رہیں گے ، !"

"وہ جاتے ہوئے بولا ، "بہت اچھا حضور ، ———— ہمیں تو خوشی ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے ، !"

وہ چلا گیا ، اور میں اپنے کام میں لگ گیا ، اتنے میں فون کی گھنٹی بجی ، کلرک نے ریسیور ہاتھ میں رکھ کر مجھے بتایا کہ گھر سے آیا ہے ، میں نے ریسیور ہاتھ میں لے لیا ، شاہدہ بات کر رہی تھی ، اس نے پوچھا ، کیا کر رہے ہیں آپ ؟"

میں نے جواب دیا ، "تمہیں یاد کر رہا ہوں"

وہ بولی ، یہ باتیں چھوڑیئے ، "کیا جاوید صاحب ہیں ؟"

میں نے کہا "نہیں ہیں ، کام سے گئے ہیں ، کیوں ان سے کیا کام تھا ؟ ———— ————؟"

وہ ذرا تلخ لہجہ میں بولی ، "ذرا ان کی خبر لینا چاہتی تھی"

میں سمجھ گیا ، رخسانہ کے جانے کا حال اسے معلوم ہو چکا ہے ، لیکن انجان بنا رہا ، میں نے کہا ، "عشق ستم کے لیے کیا میں کافی نہیں ہوں کہ دوسرے تلاش کیے جا رہے ہیں ؟"

وہ ذرا خفا ہوتی ہوئی بولی "آپ کو تو ہر وقت دل لگی سوجھتی ہے، کبھی سنجیدہ بھی بن جایا کیجئے، ——— کچھ خبر بھی ہے کیا ہوا؟"

میں نے باخبر ہوتے ہوئے بھی انکار کر دیا، "بالکل نہیں، اگر کوئی خاص بات ہو تو بتاؤ، ———!"

اس نے سوال کیا "جاوید صاحب نے آپ سے کچھ نہیں کہا؟"

پھر میں نے انکار کیا، "جاوید صاحب سے تو صرف دفتری اور کاروباری معاملات پہ بات ہوئی تھی، لیکن تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

شاہدہ نے جواب دیا، "بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں، آپ مہربانی کرکے ذرا جلد آجایئے آج، اور اس وقت تک اگر جاوید صاحب آجائیں تو انھیں ساتھ لانا ہرگز نہ بھولئے گا، بہت اہم معاملہ ہے۔"

میں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا "میں تو ابھی آسکتا ہوں، لیکن اگر جاوید کا ساتھ لانا ضروری ہے تو انتظار کرتا ہوں جب وہ آجائے گا، اسے لے کر حاضر خدمت ہوں گا، ——— اور کوئی خدمت ———؟"

ٹیلیفون بند ہو گیا، اور میں سوچنے لگا، شاہدہ کو رخسانہ کے جانے کا حال کس طرح معلوم ہوا؟ کیا وہ اسے بتا کر گئی ہے؟ ممکن ہے جاوید اصل بات چھپا جائے، لیکن اسنے شاہدہ سے جو کچھ بتایا ہوگا، اس سے صحیح واقعات علم میں آجائیں گے،

میں جانتا تھا، جاوید دفتر واپس نہیں آئے گا، فاروقی صاحب کے ہاں سے فارغ ہو کر، یا اگر کہیں اور جانا ہوا تو وہاں سے نپٹ کر، سیدھا میرے گھر ہی پہ آئے گا، پھر بھی چلتے وقت میں نے تاکید کر دی کہ اگر جاوید صاحب

آجائیں، تو تاکید کر دینا کہ فوراً میرے پاس پہنچیں، پھر میں وقت مقررہ پہ دفتر سے اٹھا، اور بازار سے کچھ ضروری چیزیں ——— شاہدہ کی فرمائشیں ——— خریدتا ہوا، "ندیم منزل" پہنچ گیا!

(۱۵)

جب گھر پہنچا، تو شاہدہ میری منتظر تھی، آج خلاف معمول چار کے بجائے لان پر صرف تین کرسیاں بچھی تھیں، میز پر کچھ اخبارات پڑے تھے، شاہدہ بے کلی کے عالم میں ٹہل رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ بڑھ کر میری طرف آئی، اور فوراً سوال کیا،

"اور جاوید صاحب، کیا وہ نہیں آئے؟"

"میں نے کہا، دیکھ تو رہی ہو اکیلا آیا ہوں،"!"

"شاہدہ اس جواب سے اور بھڑک اٹھی" لیکن میں نے تاکید جو کر دی تھی کہ انھیں ضرور ساتھ لائیے گا،!"

میں نے جواب دیا، "تمھاری تاکید میرے لیے حکم اور فرمان کی حیثیت رکھتی ہے، دوسروں کے لیے تو نہیں؟ میں نے بہت چاہا کہ وہ ساتھ آئیں لیکن کہنے لگے فاروقی صاحب کے ہاں ایک ضروری کام ہے، وہاں سے فارغ ہو کر آؤں گا، میں نے بھی اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا، لیکن بات کیا ہے؟"

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی،

آیئے پہلے چائے پی لیجیے، پھر باتیں ہوں گی،!"

میں نے سوال کیا، خدانخواستہ کوئی پریشان کن بات تو نہیں ہے، اب مجھے

تو تمھارا اترا ہُوا چہرہ دیکھ کر اختلاج ہونے لگا ہے ؟''

اس نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، اور کہنے لگی، نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے، اس کا تعلق جاوید صاحب سے ہے، لیکن اچھا ہی ہُوا وہ آپ کے ساتھ نہیں آئے، پہلے ہم لوگ باتیں کر لیں، پھر ان سے آخری اور فیصلہ کُن بات ہوگی،

اتنے میں چائے آگئی، ہم دونوں نے اطمینان سے بیٹھ کر اس کار ضروری سے فراغت کی، پھر میں نے سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے کہا،

''ہاں بھئی اب بتاؤ کیا ماجرا ہے؟''

شاہدہ نے مغموم لب و لہجہ میں کہا،

''رخسانہ چلی گئی،!''

میں نے یہ سنکر حیرت ظاہر کی، اور پوچھا،

''رخسانہ چلی گئی، ؟ کہاں ؟ کیوں ؟ کب ؟ ——— بظاہر تو کوئی پروگرام نہیں تھا کہیں آنے جانے کا، ایک بیک سوجھی کیا اسے ؟''

شاہدہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا،

''کیا پوچھتے ہیں آپ ؟ ——— واقعہ یہ ہے کہ عورت کی زندگی کانٹوں کی سیج ہے، اسے ایک لمحہ بھی سکون اور راحت کا بہت مشکل سے میسر آتا ہے، وہ خوشی ڈھونڈھتی ہے، مگر نہیں ملتی، وہ سکھ تلاش کرتی ہے، مگر نہیں ملتا، وہ اپنی ساری زندگی، خدمت اطاعت اور پاس وفا میں گزار دیتی ہے، لیکن اس کا صلہ ملتا ہے، بے وفائی سے، رعونت سے، خود غرضی سے، وہ کسی کی بن جانے کے لیے اپنا ہر چیز قربان کر دیتی ہے، مگر اس قربانی کا انعام اسے یہ ملتا ہے کہ

وہ ٹھکرا دی جاتی ہے، دھتکار دی جاتی ہے، اس کی بات بھی نہیں پوچھی جاتی، اس کی دل شکنی کی جاتی ہے، اس کے سینہ پر کودوں دلی جاتی ہے، اسے جلایا جاتا ہے کڑھایا جاتا ہے، اس کی زندگی اجیرن کر دی جاتی ہے ——————"

شاہدہ شاید اپنی تقریر ابھی جاری رکھتی، لیکن میں نے مداخلت کر کے سلسلہ منقطع کر دیا،

"لیکن یہ تقریر کس موضوع کی تمہید ہے یہ بھی تو بتاؤ، ——————

رخسانہ پہ کون سا ایسا ظلم ہوا ہے جس پہ یوں ٹھنڈی آہیں بھر رہی ہو؟ جاوید سے کون سی خطا سرزد ہوئی ہے جو یوں اس سے لڑنے کے لیے تیار ہو رہی ہو؟ کچھ معلوم بھی تو ہونا چاہیئے۔"

شاہدہ نے ایک خط میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا،

"اسے پڑھ لیجئے، سب کچھ معلوم ہو جائے گا!"

شاہدہ کے ہاتھ سے میں نے خط لے لیا، اور پڑھنا شروع کیا،

"پیاری شاہدہ! ا

جاوید صاحب میرے گلے منڈھے گئے تھے۔ میں نے ان سے محبت نہیں کی تھی، شادی سے پہلے میں نے ان کے روئے زیبا کی زیارت بھی نہیں کی تھی، ان کی مالی حالت مجھ سے بہتر نہ تھی کہ روپے کا لالچ مجھے ان سے عہد وفا نباہ دینے پر مجبور کر دیتا۔ ماں باپ نے اپنی مرضی سے فیصلہ کیا، اور انھیں میری زندگی کا مالک بنا دیا، میں نے اس فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، اور پوری دیانت و شرافت کے ساتھ جاوید صاحب کو اپنا سرتاج، اپنی زندگی کا مالک سمجھنے لگی،

جاوید صاحب کی بیوی بنکر کئی باتیں میرے علم میں آئیں، مجھے معلوم ہوا یہ

شراب پیتے ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ بازاری عورتوں کے رسیا ہیں، یہ بھی پتہ چلا کہ ریس سے جنون کی حد تک تعلق خاطر ہے، یہ راز بھی منکشف ہوا کہ جوا کھیلتے ہیں، اور خوب کھیلتے ہیں، اور اس کھیل میں جیتے کم ہیں ہارتے زیادہ ہیں، یہ تمام باتیں بم و گولہ کی طرح مجھ پہ اثر انداز ہوئیں، چاہئے تھا میں ان سے نفرت کرنے لگتی، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا، کچھ اس لیے کہ اس زمانہ میں والد ایک عرصہ سے فالج میں مبتلا چلے آرہے تھے، ان کے کانوں تک یہ خوش خبری پہنچا کر، ان کی قبل از وقت موت کا سبب بننا میں نے پسند نہ کیا، حالانکہ میں انھیں موت سے بچا نہ سکی۔ والدہ ہمیشہ سے اختلاج کی مریض تھیں، انھیں ان حالات سے باخبر کرکے ایک نیا روگ ان کی جان کو لگانا میں نے پسند نہیں کیا، حالانکہ وہ بیچاری بھی میرے غم خاموش کی تاب نہ لاکر اس دنیا سے رخصت ہوگئیں، آخرکار اور کچھ اس لیے ضبط و صبر سے کام لیا کہ سوچا اب شادی ہوچکی اب جگ ہنسائی سے کیا حاصل ؟ لوگ، مجھ سے ہمدردی کریں یا ان سے نفرت، بہرحال رسوائی ہم دونوں کی ہوگی، بدنامی ہم دونوں کے حصہ میں آئے گی، پھر یہ خیال بھی آیا کہ ایک مقدس رشتہ ہم دونوں نے خدا کو گواہ کرکے قائم کیا ہے، اسے اس قدر آسانی سے توڑنا نہیں چاہئے، غلطی آدمی سے ہوتی ہے، ٹھوکر آدمی کھاتا ہے، کوشش کی جائے تو یہ ضرور سدھر جائیں گے، میری وفا، میری خدمت، میری محبت میں کچھ تو اثر ہوگا،

لیکن شاہدہ میری وفا رائیگاں گئی،

میری خدمت نے کوئی اثر نہ کیا،

میری محبت ایک ہاتھ کی تالی بنی رہی !!

میں نے سوچا اب کیا کروں ؟ کیا مایوس ہوجاؤں ؟ کیا ہتھیار ڈال دوں ! کیا شکست قبول کرلوں ؟ کیا اپنے رفیق زندگی کو تباہی کے غار میں گر جانے دوں ؟

مٹ جانے دوں؟ نہیں اب نہیں ہونا چاہیے، مجھے ہر کوشش اصلاح احوال کی کرنی چاہیے،

یہ سوچ کر میں نے، وہ چالیس ہزار روپے جو والد کی آخری پونجی تھی، اور جو انھوں نے مجھے دے دی تھی، جاوید صاحب کے حوالہ کر دی،

اتنی بڑی رقم دیکھ کر ان پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی،!

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دولت کونین مل گئی ہے،

بے انتہا ممنون نظروں سے مجھے دیکھا، ان نظروں میں پہلی مرتبہ میں نے سختی درشتی، بے وفائی، اور بے پروائی کے بجائے محبت کی روشنی دیکھی، میرا دل خوش ہو گیا، میں نے سب کچھ فراموش کر دیا، میں نے معاف کر دیا،

جاوید صاحب نے لرزتی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا،

"رخسانہ، یہ دولت بے حساب تم مجھے دے رہی ہو؟"

میں نے بے نیازی کی شان سے جواب دیا،

"اگر، میرے پاس ساری دُنیا کا خزانہ ہوتا تو وہ بھی لا کر آپ کے قدموں پر ڈال دیتی"،

یہ سنکر خوش ہو گئے، کہنے لگے،

"کوئی بیوی ایسی بھی ہو سکتی ہے اس دُنیا میں، یہ آج مجھے معلوم ہوا؟ —— —— رخسانہ تم نے مجھے خرید لیا ہے،!"

میں شرمندہ ہو گئی، میں نے کہا،

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے، —————— میں چاہتی ہوں، آپ کی زندگی سدھر جائے، میری زندگی آپ کی زندگی ہے، آپ کی زندگی میری زندگی ہے، ایک تباہ ہو گا تو دوسرا سلامت نہ رہے گا، آپ ترقی کریں گے، عروج

حاصل کریں گے، دولت کمائیں گے، تو کیا اس میں میرا حصّہ نہ ہوگا؟"

بڑی سیر چشمی اور اولوالعزمی کے ساتھ جاوید صاحب نے فرمایا،

"کیوں نہیں ہوگا، سب کچھ تمھارا ہوگا، !"

میں نے پوچھا، "پھر آپ شکریہ کیوں ادا کر رہے ہیں!!"

کہنے لگے، "انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے، کیا اتنے بڑے احسان کو میں زندگی بھر بھول سکتا ہوں'، واقعہ یہ ہے کہ تم نے بیڑا پار لگا دیا، تم میری کشتی کی ناخدا ثابت ہوئیں"

بڑی دیر تک اسی طرح کے قصیدے پڑھتے رہے میری شان میں، پھر میں نے سوال کیا،

"اب بتایئے اس روپیہ کا کیا کریں گے آپ؟"

میرے اس سوال پر ذرا چیں بہ جبیں ہو گئے، لیکن فوراً ہی پیکرِ اخلاق بن کر فرمایا،

"جو تم کہو، ——— روپیہ تمھارا ہے، تمھارے ہی مشورہ اور ہدایت کے مطابق صرف کیا جائے گا، !"

میں نے کہا، "ایسا نہ کہیے، میں بھی آپ کی ہوں، روپیہ بھی آپ کا ہے، میں صرف ایک بات چاہتی ہوں، ———!"

انھوں نے پوچھا، "وہ بات بھی کہہ دو، میں بڑے شوق سے سن رہا ہوں، اور وعدہ کرتا ہوں کہ اس پر عمل بھی کروں گا، ضرور کروں گا، ؟"

میں نے بہت نرم اور ملائم لہجہ میں کہا، "میری خواہش اور تمنّا یہ ہے کہ، یہ روپیہ اس طرح صرف کیجئے کہ ضائع نہ ہو، آیا لب گور ہیں، یہی آخری پونجی ہے، اگر یہ برباد ہو گئی، تو مجھے اپنی فکر نہیں ہے، میں تو فاقے بھی کر سکتی ہوں، اور روکھی سوکھی کھا

بھی گزارا کر سکتی ہوں، آپ کیا کریں گے ؟ اس وقت آپ کی زندگی ایک شہزادے کی زندگی ہے، ضرورت کی ہر چیز مہیا ہے، اگر خدانخواستہ آپ کو تکلیف کا، فقر و فاقہ کا، مفلسی کا منہ دیکھنا پڑا، تو یہ برداشت نہ کر سکوں گی، بے موت مر جاؤں گی!ــــ

ــــ میری خواہش یہ ہے کہ آپ ندیم بھائی کے ساتھ مل کر کوئی کاروبار شروع کریں، وہ خدا کے فضل سے ہم سے کہیں مالدار ہیں، اس روپے پہ ان کی نیت ڈانوا ڈول نہیں ہو سکتی، آپ دونوں برابر کے شریک ہو کر کسی کاروبار کا آغاز کریں، انشاء اللہ معقول آمدنی ہو گی، اور ندیم بھائی کے پاس رہ کر آپ جان لیں گے کہ شریفانہ زندگی، عیاشی، فضول خرچی، جوئے بازی، اور شراب خوری کے بغیر بھی بسر کی جا سکتی ہے!"

یہ سُن کر ایک قہقہہ لگایا اور پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا،

"آخر ٹھیکہ دار کی لڑکی ہو، ــــــــ لیکن یہ تجارت کی اسکیم مجھے پسند ہے، اگر ندیم صاحب کو اعتراض نہ ہو، تو میں ان کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں!"

پھر میں انھیں گھسیٹ کر تمھارے ہاں لائی، تم سے اپنا دکھ درد اشاروں اشاروں میں بیان کیا، ندیم بھائی کچھ اپنی طبعی شرافت سے کچھ تمھاری ہدایت سے مان گئے، اور کاروبار شروع ہو گیا،

خدا کا شکر ہے کاروبار توقع سے زیادہ کامیاب ہوا، میں خوش تھی کہ اب ادبار کا دور گیا، لیکن میرا یہ خیال غلط تھا!

شاہدہ، وہ اب بھی شراب پیتے ہیں، اب بھی جوا کھیلتے ہیں، اب بھی عیاشیوں میں وقت صرف کرتے ہیں، رات میں نے انھیں بہت سمجھایا، لیکن، الٹا وہ مجھ سے لڑنے کو، بلکہ اگر میں خاموش نہ ہو جاتی تو مارنے کو تیار ہو گئے، ان حالات

ہیں، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دوں، مجھے اپنے روپیہ کا غم نہیں ہے، لیکن میں ان کی تباہی نہیں دیکھ سکتی، چنانچہ میں قادر آباد میں اپنی خالہ زاد بہن کے ہاں جا رہی ہوں، وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے، خدمت کر کے وہیں زندگی گزار دوں گی، مگر اب اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی، ———

——— بدنصیب!

رخسانہ

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے خط شاہدہ کو واپس دے دیا، اس خط پر ابھی ہم دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہونے پائی تھی کہ جاوید صاحب گنگناتے ہوئے تشریف لاتے نظر آئے، گویا ان پر رخسانہ کے چلے جانے کا کوئی اثر نہیں تھا، ——— ان کے لیے پھر چائے منگائی گئی، اور ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں!

(۱۶)

کئی ہفتے گزر گئے، مگر رخسانہ، کچھ ایسی روٹھی کہ واپس نہ آئی، شاہدہ نے کئی خط لکھے، مگر ہر خط کے جواب میں اس نے معذرت کر دی، آخر میں نے خود اس معاملہ کو ہاتھ میں لیا، رخسانہ کو ایک خط لکھ کر نشیب فراز سمجھائے، میں نے لکھا تھا، اپنی زندگی اور مستقبل پر ظلم نہ کرو، جاوید کو بھیجتا ہوں وہ تمھیں منانے آرہا ہے، ضرور اس کے ساتھ چلی آؤ،

خط لکھنے کے دوسرے دن میں نے، زبردستی جاوید کو قادر پور بھیجا کہ جس طرح بنے رخسانہ کو ساتھ لے آؤ،

جاوید کو گئے چار دن ہو چکے تھے کہ شام کی ڈاک سے مجھے رخسانہ کا خط ملا، بہت مختصر سا، اس نے لکھا تھا،

"کاش میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کر سکتی، اگر آپ نے صرف خط لکھا ہوتا اور جاوید صاحب کو نہ بھیجا ہوتا، تو ضرور اپنی مرضی کے خلاف چلی آتی، اس لیے کہ آپ کا دل سے احترام کرتی ہوں، لیکن جاوید صاحب کے یہاں آنے سے میری آنکھیں کھل گئیں، ان میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے مجھ سے بڑھ کر دُنیا میں بد قسمت کون ہوگا کہ نہ انھیں خرید سکی، نہ جیت سکی، نہ میرا روپیہ انھیں قابو میں لا سکا، نہ میری محبت اور وفا، یہاں چند روز کے لیے مہمان بنکر آئے تھے،

لیکن یہاں بھی ان کے لچھنوں میں کوئی فرق نہیں آیا، ندیم بھائی معاف کیجئے ، میں نہیں آسکتی، میری زندگی اور مستقبل کے بارے میں امیدیں نہ قائم کیجئے ، میرا انجام بخیر ہو اس کی دعا کیجئے،

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے،،!

اس خط سے میری روح کو تکلیف پہنچی، مجھے رخسانہ سے ہمدردی تھی، اب وہ اور بڑھ گئی، گھر گیا، تو جاوید صاحب تشریف لا چکے تھے، لان میں وہ اور شاہدہ بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے، میں نے رخسانہ کے خط کا ذکر نہیں کیا، پوچھا،

"رخسانہ کہاں ہے؟ ——— کیا وہ نہیں آئی؟"

جاوید نے بے نیازی اور بے پروائی کے ساتھ جواب دیا،

"میں نے بہت کوشش کی، لیکن ان کا دماغ عرش معلی پر ہے، وہ چاہتی ہیں، میں خط غلامی لکھ دوں، تب آئیں گی،،

شاہدہ بیچ میں بول پڑی، جاوید صاحب سے جو باتیں ہوئیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ رخسانہ احساس برتری میں مبتلا ہے، چونکہ اس نے چالیس ہزار روپے دے دیئے اس لیے سمجھتی ہے کہ انھیں خرید لیا، رخسانہ کی یہ بات مجھے بری لگی، اسے ایسا نہ کہنا چاہئے تھا،!

میں نے جاوید سے کہا، "تم کیوں چپ بیٹھے ہو، کچھ تم بھی تو بولو،،

وہ کہنے لگا، "ندیم بھائی یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی،،

میں نے سوال کیا،" آخر کیوں؟ ——— کم از کم کوشش تو کرنی چاہئے، یا تو شادی نہ کرتے، یا شادی کر چکے ہو تو پھر اب اسے نباھنا بھی چاہئے،،

جاوید نے ایک آہ سرد کے ساتھ کہا" نبا ہنے کی کوشش کر رہا ہوں،

اور کرتا رہوں گا، لیکن ہم دونوں کے خیالات میں، انداز فکر میں، زندگی بسر کرنے کے طریقہ میں، ہر چیز میں اختلاف ہے کہ وہ رفع ہو سکے،!"

"تو پھر کیا ہوگا؟ کیا سوچا ہے؟ کیا ارادہ ہے؟" میں نے سوال کیا، "کیا تم دونوں کے تعلقات ہمیشہ کے لیے ختم؟"

"نہیں کم ازکم میری طرف سے تو ایسا نہیں ہو سکتا،!" جاوید نے کہا، "کیوں کہ میں ان کا مقروض بھی ہوں، جب تک پھر نہ ادا کر لوں، اور یہ رقم نہ واپس کر دوں، اس وقت تک تو جس طرح ہوگا یہ گاڑی چلاؤں گا، لیکن اس کے بعد ——"

"اس کے بعد کیا؟" میں نے سوال کیا، "طلاق دے دینے کا ارادہ ہے کیا؟"

"ندیم بھائی اس موضوع پر کم ازکم اس وقت گفتگو نہ کیجیے،!" جاوید نے بڑی بے بسی کے ساتھ کہا، "میں جس ذہنی کشمکش سے گزر رہا ہوں آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے،!"

شاہدہ اٹھ کھڑی ہوئی، مجھ سے مخاطب ہو کر بولی،

"جاوید صاحب واقعی بہت پریشان ہیں، آنے کے بعد سے اب تک کئی مرتبہ رو چکے ہیں، چلئے انھیں کہیں سیر کرا لائیں،!"

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر شاہدہ کپڑے بدلنے چلی گئی، اور میں سوچنے لگا، یہ تو عجیب لاینحل مسئلہ بنتا جا رہا ہے، رخسانہ کا خط پڑھتا ہوں، تو وہ مظلوم نظر آتی ہے، جاوید صاحب کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ جب سے آئے ہیں کئی مرتبہ رو چکے ہیں، آخر ان دونوں میں سچا کون ہے؟ آنسو بھی خواہ مخواہ تو نہیں نکل سکتے، اور کوئی عورت خواہ مخواہ شوہر کو چھوڑ بھی نہیں سکتی، کیا جاوید کے آنسو بھی سچے ہیں؟ اور رخسانہ کی داستان درد بھی ——— نہیں

یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ دونوں میں سے کوئی ایک ضرور فریب کار ہے، لیکن کون؟ اور کیوں؟"

اتنے میں شاہدہ تیار ہو کر آ گئی، اس نے ہم دونوں کو حکم دیا، چلئے سینما چلیں گے، میں بھی ذہنی طور پر رخسانہ کا خط پا کر، اور جاوید کو ملکر اتنا تھک چکا تھا کہ سینما کی دعوت نعمت غیر مترقبہ نظر آئی، فوراً آمادہ ہو گیا، سوچا، اس مسئلہ پر اطمینان سے یا تو رات کو کھانے کے بعد باتیں ہوں گی، یا پھر دو ایک دن کے بعد، تاکہ یہ تاثرات ذرا مدہم پڑ جائیں،

"لیکن جاوید اب تک یوں ہی بیٹھا ہوا تھا، میں نے کہا، سوچ کیا رہے ہو چلو ورنہ دیر ہو جائے گی، !"

"اس نے، بیٹھے بیٹھے جواب دیا، آپ لوگ ہو آیئے، میں یہیں ٹھیک ہوں،!"

میں نے جاوید کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور زبردستی لے جا کر اسے موٹر میں بٹھا دیا! ٭

(۱۷)

سینما میں بھی جاوید چپ چپ رہا، کوئی خاص دلچسپی نہیں لی، اس کے اضمحلال کا اثر، مجھ پر اور شاہدہ پر بھی پڑا، افسردہ دل افسردہ کند انجمن را، واپسی پر تھوڑی دیر وہ ہمارے پاس بیٹھا پھر اپنے کمرہ میں سونے کے لیے چلا گیا، اس کے جانے کے بعد شاہدہ نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا،

"بیچارے جاوید صاحب بہت دلگیر، اور غمگین ہیں"! "

میں نے اس گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا، بھئی یہ تو سچ ہے کہ جاوید صاحب خاصے دلگیر اور غمگین نظر آرہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے، ؟"

"صرف رخسانہ پر"! شاہدہ نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا"

"وہ کس طرح ؟" میں نے سوال کیا، "رخسانہ نے جو سلوک، جاوید کے ساتھ کیا ہے، وہ ہر بیوی نہیں کر سکتی، !"

"جی ہاں نہیں کر سکتی"! شاہدہ نے کچھ چڑتے ہوئے کہا، "آپ تو اس کی طرف داری کریں گے"! "

"بہت خوب"! میں نے ہنستے ہوئے کہا "جاوید اور رخسانہ بر طرف، اصل مجرم پکڑ لیا گیا، یعنی میں ؟"

" اور کیا؟" شاہدہ نے بگڑتے ہوئے موڈ میں کہا، میں جانتی ہوں آپ کو رخسانہ کے ساتھ ہمدردی ہے، لیکن، ایک کے ساتھ ہمدردی کر کے دوسرے پر ظلم تو نہ کرنا چاہیے، !"

" مجھے تو دونوں سے ہمدردی ہے!" میں نے شاہدہ کی غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، " لیکن دونوں کچھ اس طرح الجھ چکے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے؟"

" میں اب تک جاوید صاحب کو غلطی پہ سمجھتی تھی، شاہدہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، " لیکن جب سے ان کی باتیں سنی ہیں، ہمدردی ہو گئی ہے ان سے، ذرا سوچیے تو سہی، مرد بہرحال مرد ہوتا ہے، جاوید نے اگر رخسانہ کے روپیہ سے کاروبار شروع کیا، تو اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ ہر وقت انھیں طعنے دیے جاتے، ذلیل کیا جاتا، ان کی توہین کی جاتی، بیوی مالدار ہو، شوہر غریب ہو تو بھی، وہ اپنی ذلت تو نہیں گوارا کر سکتا، جس احترام کا وہ مستحق ہے وہ تو ملنا چاہیے اسے!"

" ضرور، !" میں نے شاہدہ کی تائید کی، " لیکن سوال یہ ہے کہ رخسانہ کا بیان کچھ اور ہے، وہ جاوید پر الزام لگاتی ہے کہ یہ شراب پیتا ہے، تماشبینی کرتا ہے، ریس سے شوق رکھتا ہے، جوا کھیلتا ہے، اور اس کے ساتھ اتنا سخت برتاؤ کرتا ہے کہ کبھی کبھی مارنے تک پر تیار ہو جاتا ہے، !"

" جھوٹ، بالکل جھوٹ، !" شاہدہ بولی، " اتنے دنوں سے جاوید صاحب ہمارے ہاں رہ رہے ہیں، اگر کبھی شراب پیتے تو چھپ نہیں سکتے تھے، آپ کے ساتھ دفتر جاتے ہیں، اور اکثر ساتھ ہی واپس آتے ہیں، پھر ریس کھیلنے اور تماشبینی کرنے، اور جوئے سے شوق کرنے کا وقت کہاں سے نکالتے ہیں؟"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے"، میں نے اپنے آپ کو شاہدہ کی تائید پر مجبور پایا، "جب سے جاوید نے یہاں رہنا شروع کیا ہے، میں نے اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں پائی ——————— لیکن ممکن ہے رخسانہ کے ساتھ جب رہتا تھا تب یہ حرکتیں کرتا رہتا ہو!"

"یہ میں کس طرح مان لوں!" شاہدہ بولی، "شراب جوئے، اور ریس کی عادتیں اس طرح نہیں چھوٹتیں کہ جب چاہا چھوڑ دیا، کوئی مذاق ہے ان لتوں کا چھوڑ دینا، اصل بات یہ ہے کہ جاوید صاحب تماشبین نہیں ہیں بلکہ ———"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو شاہدہ؟" میں نے ذرا پریشان ہو کر پوچھا، "کیا رخسانہ پر کوئی الزام لگانا چاہتی ہو؟"

"مجھے کیا پڑی ہے کسی پر الزام لگانے کی!" شاہدہ نے بے پروائی سے کہا، "جو جیسا ہوگا ویسا ہی کہا جائے گا!"

"لیکن وہ کیسی ہے؟" میں نے اور زیادہ پریشان اور مضطرب ہو کر سوال کیا "کیا تم اس کے اخلاق پر الزام لگانا چاہتی ہو؟"

"میں نہیں جاوید صاحب!" شاہدہ گویا ہوئی، "جاوید صاحب کا خیال ہے کہ رخسانہ کا چال چلن اچھا نہیں ہے!"

"نہیں بھائی!" میں نے شک وشبہ کے انداز میں کہا "اس بات کا ماننا بہت مشکل ہے!"

"آپ کو قائل کرنا واقعی بہت مشکل ہے" شاہدہ ذرا جھنجھلا کر بولی "سوال یہ ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کا اس درجہ ممنون ہو جیسے جاوید صاحب رخسانہ کے ہیں، پھر بھی وہ اتنا بیزار اور متنفر ہو سکتا ہے اپنی بیوی سے؟ اسے تو اس کے پاؤں دھو دھو کر پینا چاہئیں، کلمہ پڑھنا چاہیے اس کا!"

"بے شک!" میں نے پرجوش انداز میں تائید کرتے ہوئے کہا، "وہ بالکل ٹھیک کہتی ہو!"

"مگر یہ سب کچھ کرنے کے بجائے جاوید صاحب، کیوں اس فکر میں مبتلا ہوئے جا رہے ہیں کہ کہیں سے روپیہ کا انتظام ہو جائے تو ایک ایک پائی بیباق کر کے فوراً طلاق دے دیں رخسانہ کو!"

"واقعی؟" میں نے سوال کیا "جاوید یہ چاہتا ہے؟"

"ہاں!" شاہدہ نے اقرار کرتے ہوئے کہا، "آج آپ کے آنے سے پہلے بھی کہہ رہے تھے، وہ تو رو بھی رہے تھے، کیا آپ نے ان کی آنکھوں میں آنسو چھلکے ہوئے نہیں دیکھے تھے!"

"ہاں دیکھے تو تھے!" مجھے یاد آ گیا "لیکن اس میں رونے کی کیا بات تھی؟"

"کیوں نہیں تھی؟" شاہدہ نے بتایا "وہ بیچارے کہہ رہے تھے: میں نے رخسانہ سے شادی روپیہ کے لیے نہیں کی تھی، اس کے روپ پیسے، اس کی شخصیت پر، اس کے انداز و اطوار پر فدا ہو کر کی تھی، لیکن، شادی کے بعد کچھ ہی عرصہ بعد یہ حقیقت مجھ پر روشن ہو گئی کہ جسے میں سونا سمجھ رہا تھا وہ پیتل ہے، بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی، میری حرکت قلب بند ہو جائے گی، رخسانہ نے مجھے روپے دیے، میں یہ سمجھا کہ وہ ایک وفادار بیوی کی حیثیت سے اس طرح اپنا اور میرا مستقبل تعمیر کرنا چاہتی ہے، لیکن بعد میں معلوم ہوا یہ اعانت نہیں تھی، رشوت تھی!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"رشوت؟" میں چونک پڑا، "رشوت کیسی؟"

"خدا ہی جانتا ہے واقعہ کیا ہے؟" شاہدہ نے کہا، "لیکن جاوید صاحب بتا رہے تھے رخسانہ نے یہ رقم اس لیے دی کہ میں اس کی کمزوریوں

سے واقف ہونے کے بعد اس کا پردہ فاش نہ کردں، جس رقم کو میں نے بڑے شوق اور چاؤ سے لیکر کاروبار میں لگایا تھا، یہ معلوم کرنے کے بعد، وہ میرے لیے سانپ اور بچھو سے زیادہ زہریلی بن گئی ہے، اس رشوت کا قبول کرنا میری مردانہ غیرت کے خلاف ہے، رخسانہ یہاں رہے، یا قادر آباد میں، لیکن جب تک میں اس کا مقروض ہوں، اس وقت تک زندگی میرے لیے تلخ ہے، یہ رشوت کی رقم جلد از جلد واپس کر کے، میں اسے آزاد کر دینا چاہتا ہوں،!!"

"کمال ہے بھئی،!" میں نے متحیر ہو کر کہا، "معاملات یہاں تک پہنچ جائیں گے اس کا تو وہم و گمان بھی نہیں تھا،!"

"دیکھتے جائیے،!" شاہدہ بولی، "بلکہ جاوید صاحب تو کہہ رہے تھے، میں نے طے کر لیا ہے کہ ہر مہینہ جو رقم منافع کی ہم آپس میں تقسیم کرتے ہیں، اب اگلے ماہ سے میں ایک پیسہ بھی اس میں سے نہیں لوں گا!"

"کیا مطلب؟" یہ ایک اور عجیب بات سن کر میں نے کہا، "پھر کیا ارادہ ہے،!"

"کہہ رہے تھے،!" شاہدہ نے بتایا، "جب چالیس ہزار روپے جمع ہو جائیں گے تو رخسانہ کو ادا کر کے پھر سے شروع کریں گے،!"

"کمال ہے،!" میں نے گویا خود اپنے آپ سے کہا، "یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

"وہ بیچارے یہ بھی کہہ رہے تھے!" شاہدہ نے انکشاف کیا، "اب ناخواندہ مہمان کی طرح آپ لوگوں کے ہاں آ کر ٹھہر ہی گیا ہوں، اس کا حساب، رخسانہ کا حساب چکا دینے کے بعد ——————"

"لاحول ولا قوۃ،" میں نے بگڑتے ہوئے کہا، "بڑا واہیات آدمی ہے، کیا میں اس سے کھانے پینے کے پیسے لوں گا،!"

"میں نے بھی یہی کہا تھا!" شاہدہ بولی، میں نے کہا، اس طرح آپ میری، اور ندیم صاحب کی توہین کر رہے ہیں!"

"بالکل ٹھیک،!" میں نے کہا، "اگر میرے سامنے اس طرح کی باتیں اس نے کہیں تو وہ خبر لوں گا کہ یاد کریں گے حضرت، ——— !"

شاہدہ ہنسنے لگی، پھر کہنے لگی،

"بہرحال جاوید صاحب کی حالت ہے قابلِ رحم،!"

میں نے اتنی دیر میں ایک رائے قائم کر لی تھی،

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جاوید جو رقم رخسانہ کو دینا چاہتا ہے، وہ میں اپنے پاس سے بطور قرض دے دوں، پھر رفتہ رفتہ کر کے وہ ادا کر دیں اس طرح اس ذہنی کوفت سے تو نجات مل جائے گی اسے، جس نے اسے گویا بیمار ڈال دیا ہے آج میں اس کی حالت دیکھ کر بہت متاثر ہوا،،

شاہدہ نے، میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا،

"ہاں ہو تو سکتا ہے یہ، بہرحال آپ خود ہی ان سے اس معاملہ پر مفصل گفتگو کر لیجئے، پھر جیسا طے پا جائے، وہ کیجئے،!"

اس کے بعد تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کر کے ہم دونوں خواب راحت کے مزے لینے لگے،! ——— نیند فوراً آ گئی، لیکن خواب بھی، جاوید اور رخسانہ ہی کے واقعات پر وہ فلم کی طرح بار بار آنکھوں کے سامنے آتے رہے!●

---

(18)

میں نے جاوید کو روپے دے دیے، اس نے پرنم آنکھوں سے مجھے دیکھا، یہی اس کا شکریہ تھا، میں نے کہا: میری خواہش تھی کہ رخسانہ سے تمہاری صلح ہو جاتی، تم دونوں نے جو عہد وفا باندھا تھا اسے نباہتے، لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر، دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ شرافت کے ساتھ علیحدہ ہو جائیں، رخسانہ کے روپے واپس کر دو، میں ان روپوں کا کبھی تقاضا نہیں کروں گا، جب چاہنا اپنی سہولت کے مطابق ادا کر دینا،

اس واقعہ کے بعد جاوید سے میرے تعلقات اور زیادہ گہرے ہو گئے، اب وہ ایک بھائی کی طرح میرے ساتھ رہ رہا تھا، کھانا پینا، رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا سب ساتھ تھا، ہر چیز مشترک تھی، دوئی، غیریت، اور بیگانگی کا کہیں نام و نشان نہ تھا، ہر مہینہ زبردستی جیب خرچ کے لیے میں پانچ سو روپے اسے دے دیتا تھا، لیکن اس رقم کا بڑا حصہ وہ مجھ پر یا شاہدہ پر صرف کر دیتا تھا، کبھی میرے لیے کوئی چیز لیے چلا آ رہا ہے، کبھی شاہدہ کے لیے، جب کبھی شاہدہ کے لیے کوئی چیز لاتا، تو وہ میرا مذاق ضرور اڑاتی، ایک آپ ہیں کہ زیادہ سے زیادہ روپے خرچ کر کے بے ہنگم سی چیزیں خریدتے ہیں، ایک جاوید صاحب ہیں جو کم سے کم قیمت میں بہتر سے بہتر چیز خرید لاتے ہیں،

بہت دن اسی طرح گزر گئے، شاید ایک سال سے بھی زیادہ، ایک روز میں دفتر سے آیا تو شاہدہ باہر جانے کے لیے تیار تھی، میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا،

"اے جانِ قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج؟"

وہ بولی، ذرا شاپنگ کرنے جا رہی ہوں،

میں نے پوچھا کیا تنہا جاؤ گی؟

کہنے لگی، کیوں تنہا جانے میں کیا حرج ہے؟ کیا کبھی گئی نہیں ہوں؟ ویسے اس وقت تو جاوید صاحب ساتھ جا رہے ہیں، وہ اچھا سودا پسند کرتے ہیں، اور دام بھی مناسب طے کر لیتے ہیں، میں دوکانداروں سے جھک جھک پسند نہیں کرتی چائے کے لیے میں نے صغرا سے کہہ دیا ہے، وہ لے آئے گی ———

اتنے میں جاوید صاحب بھی اپنے کمرہ سے صاحب بہادر بنے ہوئے نکلے، میں نے جاوید کی طرف دیکھ کر شاہدہ سے کہا، تو یہ ہیں خضرِ طریقت،

شاہدہ ہنستی ہوئی جاوید کے ساتھ چلی گئی،

تھوڑی دیر کے بعد صغرا چائے لے کر آ گئی، جب میں چائے پی چکا، تو بجائے اس کے کہ برتن لے جاتی، صورتِ سوال بنکر سامنے کھڑی ہو گئی، میں نے پوچھا، کیا بات ہے صغرا، کوئی کام ہے؟ کچھ کہنا چاہتی ہو؟

میرے اس سوال پر کچھ دیر تک وہ گم صم کھڑی رہی، پھر کہنے لگی،

"بھیا بُرا نہ مانو ایک بات کہوں؟"

میں نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور کہا، "بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟ اگر والدہ مرحومہ کی کسی بات کا بُرا مان سکتا تھا، تو تمہاری بات کا بھی مان سکتا ہوں، میں تو تمہیں ماں کی طرح سمجھتا ہوں، تمہاری گود میں کھیلا ہوں، پروان چڑھا ہوں، تمہارے کپڑوں پر پیشاب کیا ہے، رات رات بھر جب مچل گیا ہوں تمہیں سونے نہیں دیا ہے،

صغرا کی آنکھیں بھر آئیں، ہونٹ کانپنے لگے، لرزتی ہوئی آواز میں وہ گویا ہوئی،
"میرے بچے، میں بھی تو تجھے اپنے جگر کا ٹکڑا سمجھتی ہوں، نہ کم، نہ زیادہ"
اس دعوے میں ذرا بھی مبالغہ نہ تھا، میں نے تسلیم کر لیا، "ہاں کیا کچھ جھوٹ ہے یہ؟ لیکن یہ تو بتاؤ کیا کہہ رہی تھیں تم ابھی؟"

صغرا نے پھر سکوت سے کام لیا، اس کے اس معنی خیز سکوت سے مجھے وحشت ہونے لگی، میں نے کہا، "بتاؤ تو سہی کیا کہنا چاہتی ہو؟"

اب وہ خاموش نہ رہ سکی، اس نے کہا، "بیٹے، ایک بڑی دل دکھانے والی بات ہے، لیکن اس گھر کا نمک کھایا ہے، خدا بخشے تمہاری ماں نے سارا گھر مجھے سونپ رکھا تھا، ——"

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، "شاید شاہدہ نے تمہارے اختیارات کچھ کم کر دیے ہیں؟ کچھ پابندیاں عائد کر دی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اطمینان رکھو، شاہدہ کو اپنے احکام واپس لینے پڑیں گے، وہ مجھ پر حکومت کر سکتی ہے لیکن تم پر نہیں، —— —— اس گھر میں تم پر کوئی بھی حکومت نہیں کر سکتا،"

صغرا کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھے اور کہا، نہیں بیٹے ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں بوڑھی ہوئی، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں، آج مری کل دوسرا دن، اب اختیارات لے کر کیا کروں گی، دولہن جس طرح چاہیں اپنا گھر چلائیں، مجھے ایک گلاس پانی اور دو سوکھی روٹیاں ہی ملتی رہیں تو شکر کروں گی، لیکن بات کچھ اور ہے"!

اس مبہم اور پر اسرار طرز گفتگو سے میری پریشانی بڑھنے لگی، میں نے اکتاتے ہوئے لہجہ میں کہا،
"لیکن وہ کچھ اور بات کیا ہے، یہ بھی تو معلوم ہو؟!"

صغرا نے اپنی ہمت مجتمع کی اور کہا، "بیٹے میری رائے یہ ہے کہ جاوید میاں کو نہیں رہنا چاہئے اس گھر میں ——————"

یہ سُن کر میں اچھل پڑا، بات کی تہ تک پہنچے بغیر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، میں نے پوچھا،

"یہ کیوں؟ اگر میں انھیں یہاں نہ رہنے دوں تو اس کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہئے، آخر کیا کہوں ان سے؟"

صغرا نے میری باتیں توجہ سے سنیں، پھر بڑے بوڑھوں کے انداز میں نصیحت کرتے ہوئے کہا،

"بیٹے ایک غیر آدمی کا اس گھر میں کیا کام ہے؟"

"میں نے صغرا کو سمجھاتے ہوئے بتایا، جاوید غیر نہیں ہے، میرا دوست ہے، میرا بھائی ہے، میرا قوت بازو ہے، میرا شریک کار ہے، سارا کام اس نے سنبھال رکھا ہے میں تو صرف دفتر کی سیر کر کے چلا آتا رہوں، وہ غیر کیسے ہو گیا؟"

صغرا نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

"اگر میری بات تم آج نہیں مانتے تو کل مانو گے، آج مان لو تو پچھتانا نہیں پڑے گا، کل مانو گے، تو پشیمان بھی ہو گے، ابھی وقت ہے، !، کچھ نہیں بگڑا؟"

ان الفاظ کا مطلب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا تھا، میں نے کسی حد تک برہمی کے ساتھ بلند آواز سے کہا،

"آخر تمھارا مقصد کیا ہے ان باتوں سے؟ —————— کیا تم کوئی الزام لگانا چاہتی ہو اس بچہ پر؟"

صغرا نے بے تامل جواب دیا، ہاں بیٹے، میں جاوید میاں پر بھی الزام لگاتی ہوں اور دولہن پر بھی، جس گھر کا میں نے نمک کھایا ہے، اس کی بے آبروئی، اور

رسوائی میں نہیں دیکھ سکتی، یہ دونوں جس طرح ملتے ہیں، وہ قابل اعتراض ہے، شرع کی نظر میں بھی، اور خلقت کی نظر میں بھی، ان دونوں میں جو باتیں ہوتی ہیں، وہ شریف لوگوں کے منہ سے نہیں نکل سکتیں، میں پوچھتی ہوں، جاوید کو، جیسے تم اپنا دوست بھائی، عزیز، ساتھی اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہو، کیا دولہن سے عشق کرنے کا حق ہے؟ میں پوچھتی ہوں کہ دولہن کو جسے تم جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہو، جس کے لیے تم نے باپ کی خفگی مول لی، ماں سے لڑے، کنبہ میں بدنام ہوئے، عزیزوں کے اعتراض سہے، یہ زیبا ہے کہ وہ ایک غیر مرد کے عشق کو قبول کریں؟ ——

——"

میرے بدن میں سنسنی ہونے لگی، میری روح ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی، ایسا معلوم ہوا جیسے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی، میں نے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا،

"یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

"صغرا نے، جس کا چہرہ اب سرخ ہو رہا تھا، اور جو ہر طرح کے ادب اور تکلف کو بالائے طاق رکھ چکی تھی، سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا،

بیٹے میں غلط نہیں کہتی، اپنے ناموس کی خبر لو، پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے، یہ لوگ سمجھتے ہیں میں اندھی ہوں، بے وقوف ہوں، ان کی آنکھوں میں جو پاپ ناچ رہا ہے وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہے، ان کی باتیں خدا کے سوا کوئی نہیں سنتا، ان کی حرکتیں میری سمجھ سے باہر ہیں، لیکن میں نے بھی دھوپ میں بال سفید نہیں کیے ہیں، میں نے بھی دنیا دیکھی ہے، یہ لوگ جو سوانگ رچاتے رہتے ہیں، میں اس سے خوب واقف ہوں، میرے سامنے زیادہ تر انگریزی میں باتیں ہوتی ہیں، اور واقعی میں انگریزی نہیں جانتی، لیکن انگریزی میں باتیں کرنا ہی ثابت کرتا ہے کہ

ان کے دل میں چور ہے، ادھر میں آگئی، ادھر اسلوبہ میں باتیں کرتے کرتے انگریزی بولنے لگے، اچھا مان لیا میں انگریزی نہیں جانتی، لیکن آنکھوں کی زبان تو جاہل ہونے کے باوجود پڑھ لیتی ہوں، بہت دن تک میں اپنے آپ کو ملامت کرتی رہی، کہ جو کچھ میرا خیال ہے وہ غلط ہے، لیکن ادھر کچھ دنوں سے تو معاملہ انجام تک پہنچ گیا ہے کہ ——————"

"میں اب سب کچھ سننے کے لیے آمادہ ہو چکا تھا، میں نے کہا جو کچھ تم کہنا چاہتی ہو سب کچھ کہہ دو"!

"وہ بولی" میں تو کئی مہینے سے تاک میں ہوں کہ موقع ملے تو کہوں، اللہ نے آج موقع دے دیا، —————— بیٹے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جاوید نے دولہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اسے آنکھوں سے لگایا، اور چوم لیا، میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ وہ اسی صوفے پر اسی جگہ جہاں تم بیٹھے ہو بیٹھے چائے پی رہے تھے اور کہہ رہے تھے "وشاہدہ یہ زندگی اب تمہاری ہو چکی، روپیہ رخسانہ لے گئی، لیکن دل میں نے بچا لیا، وہ تمہاری نذر کرتا ہوں، چاہو قبول کرو، چاہو ٹھکرا دو، قبول کر لوگی، تو ایک ناشاد کی زندگی بنا دوگی، ٹھکرا دوگی، تو —————— جان سے ہم بھی گزر جائیں گے سوچا ہے یہی" یہ سن کر دولہن جیسے کانپ گئیں، انھوں نے بڑے پیار بھرے انداز میں جاوید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور اسے سہلاتی ہوئی بولیں، "جان سے جانے کا نام نہ لیجئے، اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہوا، تو کیا میں زندہ رہوں گی؟ پھر اس زندگی میں میرے لیے کچھ کشش باقی رہ جائے گی؟ اس پہ جاوید نے کہا، اگر میری محبت کو تم قبول کرتی ہو، تو پھر، ہمیں اپنی زندگی از سر نو تعمیر کرنا پڑے گی، یہ سنکر وہ بولیں، یہ تو ٹھیک ہے لیکن کیوں کر؟ کس

طرح ؟ آپ ہیں نہ جانے کیا جادو ہے کہ میں آپ کی خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دینے پر تیار ہوں، لیکن سوچتی ہوں، ندیم صاحب کا برتاؤ میرے ساتھ اب تک بہت اچھا رہا ہے، انھوں نے کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ میرے لیے کافی ایثار کر چکے ہیں، کئی مرتبہ انھوں نے بڑے نازک موقعوں پر میرے والد کی مالی مدد بھی کی ہے، ہمارا مکان گرو تھا انھوں نے اسے چھڑایا، والد کی بیماری میں پانی کی طرح روپیہ بہایا، والد کے انتقال کے بعد، والدہ جب تک زندہ رہیں برابر انھیں دو سو روپیہ ماہانہ دیتے رہے، جب یہ سوچتی ہوں کہ اب میرے اور آپ کے معاملات اس درجہ تک پہنچ چکے ہیں کہ ندیم صاحب کو ضرور بیچ سے ہٹ جانا چاہیے، ارادہ کرتی ہوں کہ ندیم صاحب کو صاف صاف کہہ دوں گی، اب ہمارے درمیان وہ تعلق قائم نہیں رہ سکتا، جو اب تک رہتا چلا آیا ہے، تو، تو یہ الفاظ زبان تک آکر رک جاتے ہیں، ان کی صورت دیکھتے ہی، دل ملامت کرنے لگتا ہے، بدقسمتی سے وہ میرے عاشق اور شوہر ہی نہیں ہیں، محسن بھی ہیں، اس مشکل کا بھی کوئی حل ہے آپ کے پاس،؟" جاوید نے ہنستے ہوئے کہا، "یہ کوئی مشکل ہی نہیں جس کا حل تلاش کیا جائے، اگر تم ندیم سے بات کرتے جھجکتی ہو، تو بھی یہ معاملہ حل ہو سکتا ہے" دولہن نے پوچھا وہ کس طرح؟ کوئی ایسی ترکیب اگر نکل آئے کہ مجھے کچھ نہ کہنا پڑے اور وہ خود ہمارے راستے سے ہٹ جائیں تو کیا کہنا، اس طرح سانپ بھی مر جائے گا، اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی،" جاوید نے کہا، "کمپنی میں، میرا، اور ندیم کا برابر کا حصہ ہے، کسی بات کی آڑ لے کر میں علیحدگی اختیار کر لوں گا، یا تو انھیں ستر اسی ہزار روپیہ مجھے دینا پڑے گا، ورنہ کمپنی میرے حوالہ کر دینا پڑے گی،" اس پر دولہن نے کہا، "لیکن آپ تو خود ان کے مقروض ہیں؟" اس پر جاوید نے ایک قہقہہ لگایا اور بڑے فخر سے

کہا معترض، "اچھی کہی یہ بھی، یہ کمپنی میرے نام سے قائم ہے، سارا کام میں کرتا ہوں، ندیم نے صرف روپیہ لگایا ہے، میں نے چار چاند لگائے ہیں، کیا میری محنت کی، میری قابلیت کی، میری سوجھ بوجھ کی، جس نے کمپنی کو کمپنی بنایا کوئی قیمت نہیں ہے، میں تو کہتا ہوں حساب کیا جائے تو میرا اسّی ہزار روپیہ نکلے گا، یہ روپیہ لے کر میں الگ ہو جاؤں گا، اور پھر کسی دن تم مجھے پہلے سے طے کی ہوئی کسی جگہ ملو گی، وہاں سے ہم کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے، کہیے شاہدہ بیگم کیسی تجویز ہے یہ؟" دولہن ہنسنے لگیں، اور بولیں "تجویز تو قبول ہے، لیکن جوہری کے ہاں میرے کئی قیمتی جڑاؤ زیور پڑے ہیں، وہ لے آنا چاہتی ہوں وہاں سے"

صغرا یہ کہہ رہی تھی اور میرے ذہن میں جوہری کا وہ بل گھوم رہا تھا، ابھی کل ہی جس کی رقم میں نے ادا کی تھی، اور جو غالباً سولہ ہزار تھی، صغرا بدستور باتیں کیے جا رہی تھی۔

یہ سن کر جاوید میاں کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا، کہنے لگے "ضرور لے آؤ، بلکہ جتنا نقد روپیہ ممکن ہو سکے وہ بھی ساتھ لے لینا، آخر ہمیں نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کرنی ہے، یہ روپیہ پھر کے حساب میں محسوب ہو جائے گا،" دولہن نے اس پر سوال کیا، "اور اگر، انھوں نے پولیس میں رپورٹ کر دی تو کیا ہوگا؟" جاوید نے اطمینان دلایا، "میں ندیم کی طبیعت سے واقف ہوں، وہ ہرگز ایسی حماقت نہیں کر سکتا، اگر کی تو ہمارے پاس بھی ہزاروں جواب تیار ہیں، پھر عدالت میں اس کے فرضی ظلم و ستم کی ایسی لرزہ خیز داستان تمھیں بیان کرنا پڑے گی کہ ساری دنیا تھوکے گی ندیم صاحب کے نام پر، بیسیوں اٹھ گئی، تو لٹھ گئی، اور اگر اس نے خاموشی سے کام لیا، چپ چاپ تمھیں طلاق دے دی، تو ہم بھی اس کے سینہ پر مونگ دلیں گے، یعنی اسی شہر میں بسیرا رہے گا!! ـــــــــ"

میں نے صغرا سے سوال کیا "یہ واقعہ کب کا ہے؟"

صغرا نے جواب دیا۔ "آج کا، تمہارے آنے سے گھنٹہ بھر پہلے کا"!

اتنے میں شاہدہ کا چہرہ نظر آیا، وہ بازار سے لدی پھندی واپس آگئی تھی، جاوید اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا، ان دونوں کو آتا دیکھ کر صغرا نے ٹرے اٹھائی اور کھسک گئی، شاہدہ نے اس سے تو کچھ نہ کہا، مجھ سے پوچھا،

"ارے اب چائے پی ہے آپ نے اتنی دیر میں؟"

میں نے جواب دیا "پی تو اسی وقت لی تھی، برتن لینے اب آئی تھی، کسی کام میں الجھ گئی ہوگی،"

(۱۹)

آج میں نے بالکل پہلی مرتبہ، جاوید، اور شاہدہ کو نئی نظر سے دیکھا،!

جس شاہدہ کے چہرے میں معصومیت، تقدس، شرافت، پاکبازی اور پاک دامانی کے سوا اب تک مجھے کچھ نظر نہ آیا تھا آج وہ چہرہ، گنہگار، گھناؤنا اور قابل نفرت نظر آرہا تھا،!

جس ندیم کو، اس کی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں کے باوجود، دوست، مخلص ساتھی، بھائی اور جاں نثار رفیق سمجھا کرتا تھا، آج وہ غدار، فریب کار، اور بد باطن نظر آرہا تھا،!

میرے لیے یہ بڑا کٹھن وقت تھا، فی الحال اپنے تاثرات کسی طرح بھی، ان دونوں پر، یا ان دونوں میں سے کسی ایک پر، ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا، صغرا نے جو کچھ کہا تھا، اور جس تفصیل سے کہا تھا، اور خود اپنے کانوں سے سنا ہوا اور آنکھوں سے دیکھا ہوا کہا تھا، اس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، پھر بھی، ابھی میں خاموش رہنا چاہتا تھا، ابھی مزید یقین کرنا چاہتا تھا، اگر میں سب کچھ ان کے سامنے اگل دیتا یا کسی طرح بھی اپنے طور طریقے سے انھیں مشکوک کر دیتا، تو میرے معلومات تشنہ اور نامکمل رہ جاتے،!

دل میں شعلے اٹھ رہے تھے، لیکن چہرے کو ہشاش بشاش بنائے رکھے

پہ مجبور تھا، میں نے شاہدہ سے پوچھا،
"کہو بھئی کیا کیا خریدلائیں؟"
وہ مسکراتی ہوئی بولی "کوئی خاص چیز تو نہیں لائی، بس ایک ساری خریدی ہے ـــــــــ"

اب میں جاوید سے مخاطب ہوا، "کیوں حضرت آپ خالی ہاتھ گئے، اور خالی ہاتھ واپس آگئے، ؟"
جاوید نے جواب دیا، "ندیم بھائی ہماری نہ پوچھئے، دنیا میں جب آئے، تو خالی ہاتھ تھے، جب جائیں گے خالی ہاتھ جائیں گے"
شاہدہ نے تڑپ کر کہا، "آخر ہر وقت دنیا سے جانے کا ذکر کیوں کیا کرتے ہیں آپ ؟"
میں نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، "جب کہ رہنا ہمیشہ ہے، !"
شاہدہ خاموش ہوگئی، اتنے میں کھانا میز پہ لگ گیا، ہم لوگ، ڈائننگ روم میں پہنچے کھانے کے دوران میں بھی یہ لوگ خاموش نہ رہے باتیں کرتے رہے، باتوں باتوں میں ایک مشترک دوست، شاکر کا ذکر چل نکلا، جاوید نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا، "کچھ اور بھی سنا آپ نے؟ شاکر صاحب نے اب مس عالیہ سے عشق شروع کر دیا ہے، اور معلوم ہونا چاہئے کہ یہ اس سال کا ساتواں عشق ہے، !"
شاہدہ نے ہنستے ہوئے سوال کیا، "اس سال کا ساتواں عشق، ؟"
جاوید نے بتایا "جی ہاں، شاکر صاحب ہر سال کئی مرتبہ عشق فرماتے ہیں، کسی سال دس، کسی سال بارہ، کسی سال پندرہ، گزشتہ سال تو ۱۹ مرتبہ یہ زحمت انھوں نے گوارا فرمائی تھی، اس سال یہ ساتواں نمبر ہے سال ختم ہوتے ہوتے دیکھئے یہ تعداد کہاں تک پہنچتی ہے، ممکن ہے سال گذشتہ کا ریکارڈ توڑ دیں"

شاہدہ ہنسنے لگی، "یہ بھی اچھی رہی، عشق نہ ہُوا کھیل ہُوا، ہر سال عشق، وہ بھی درجنوں بار، لیکن یہ تو دھوکا ہُوا، کہیں اس طرح بار بار بھی کوئی عشق کر سکتا ہے؟

جاوید نے کہا "ہاں یہی سوال میں نے بھی ایک مرتبہ شاکر صاحب سے کیا تھا،!"

شاہدہ نے اشتیاق کے ساتھ دریافت کیا" پھر انھوں نے کیا جواب دیا؟

جاوید نے بتایا" وہ نہایت سنجیدگی اور معصومیت سے کہنے لگے، سب لوگ اس پر متفق ہیں کہ عشق ایک مرض ہے، فرض کیجئے، ایک شخص کو بار بار ملیریا ہوتا ہے یا کوئی آدمی اکثر زکام میں مبتلا رہتا ہے، تو کیا آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں کہ تمہیں بار بار ملیریا کیوں ہوتا ہے، اور جب دیکھو جب زکام میں کیوں مبتلا ہو جاتے ہو؟"

شاہدہ ہنسنے لگی، پھر اس نے کہا، شاکر صاحب نے لاجواب کر دیا آپ کو،

جاوید نے اقرار کر لیا، جی ہاں، میں نے کہا، شاکر دوست وہ بات تم نے کہی ہے کہ ہم بھی قائل ہو گئے ——————— لیکن حال یہ ہے کہ عشق کا مرض اس شخص کو اتنی شدت سے ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس غم میں گھل گھل مر جائے گا، لیکن، جب یہ دورہ ختم ہوتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے عشق نامراد کے مرض میں یہ نہیں کوئی اور شخص مبتلا ہوا تھا،"

میں اب تک خاموش بیٹھا یہ باتیں سن رہا تھا، اب میں نے بھی لب کشائی کی، میں نے کہا، واقعی فنکار، فنکار ہی ہوتا ہے،

جاوید نے میری بات پکڑ لی "قسم خدا کی کیا بات کہی ہے"

میں نے کہا، لیکن تمہارے بارے میں نہیں کہی ہے "

وہ چونک سا پڑا" اس نے مشتبہ نظروں سے مجھے دیکھا، لیکن شاید جلد اپنی غلط فہمی محسوس کر لی، ہنسنے لگا، اور گویا ہُوا،

"ندیم بھائی میں نے تو اس کوچہ میں کبھی قدم بھی نہیں رکھا"

"شاہدہ نے سوال کیا، "تو کیا آپ کو رخسانہ سے محبت نہیں تھی ؟"
جاوید نے صاف انکار کر دیا، "کیا محبت کے لیے وہی رہ گئی تھی، بلکہ سچ تو
یہ ہے کہ رخسانہ نے مجھے محبت سے نفرت کرنا سکھا دیا، شاید اب میں زندگی بھر محبت
نہیں کر سکوں گا کسی سے ! "
شاہدہ یہ جواب سنکر بہت مسرور نظر آئی، کہنے لگی، "جو لوگ محبت سے بھاگتے ہیں،
وہی بری طرح جکڑے جاتے ہیں، خدا سے ڈریئے بڑا بول نہ بولئے ! "
جیسے جاوید سہم سا گیا، کچھ سوچتا ہوا بولا، "اگر قسمت میں وہ دن آنا لکھا ہی ہے
جب میں کسی سے محبت کرنے پر مجبور ہوں گا، تو نوشتۂ تقدیر کو کون مٹا سکتا ہے ؟
دیکھا جائے گا"
میں پھر بیچ میں بول پڑا، میں نے پوچھا، نوشتۂ تقدیر کوئی چیز نہیں، انسان
خود ہی اپنی تقدیر بناتا یا بگاڑتا ہے، جب تم نے رخسانہ سے شادی کی تھی، جب
اسے طلاق دے دی، جب کسی سے محبت کرو گے، یہ سب تمہارے ذہنی مدارج
ہیں، تقدیر کو بدنام کرنا، یا اس کے سر سہرا باندھنا، دانشمندوں کا شیوہ نہیں"
اور ویسے بھی تمہارا شمار کم از کم میرے نزدیک دانشمندوں میں نہیں،
جاوید ہنسنے لگا۔ "تو کیا آپ اس خاکسار کو بے وقوف سمجھتے ہیں؟"
میں نے جواب میں ایک سوال کیا، "کیا ان دونوں کے بین بین کچھ نہیں ہوتا ؟"
شاہدہ ہنسنے لگی، جاوید کو بھی کھلکھلانے کا موقع مل گیا، اتنے میں گھڑی کا سے
گیارہ بجائے، میں جمائی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا،
"بھئی اب نیند آرہی ہے، چلئے ! "
اور پھر اپنے کمرہ میں آگیا، کوئی پندرہ منٹ کے بعد شاہدہ بھی آگئی، اس نے
آتے ہی مجھ سے پوچھا،

"کیا سو گئے آپ؟"

میں جاگ رہا تھا، لیکن اس طرح خاموش رہا، جیسے سو رہا ہوں، وہ بھی اپنے بستر پر لیٹ گئی، اور غالباً فوراً ہی سو گئی، لیکن میں کروٹیں بدلتا رہا، جاگتا رہا، ثمینہ میں اور مجھ میں اتنا ہی فاصلہ تھا، جتنا جاوید میں اور رخسانہ میں، جتنا مجھ میں اور جاوید میں، ———— چند لمحوں کے اندر یہ کتنا بڑا انقلاب ہو گیا تھا، کیسا ہولناک انقلاب!!

جو میری زندگی تھی، روح تھی، جان تھی، جسے دیکھ کر میں جیتا تھا، جسے دیکھ کر میرے دل میں محبت کی لہریں اٹھنے لگیں تھیں، جس کی آواز سن کر میں اپنا ہر غم، ہر دکھ بھول جایا کرتا تھا، وہ چند قدم کے فاصلہ پر لیٹی تھی، اور اسے دیکھ کر میں اتنی وحشت اور نفرت محسوس کر رہا تھا، جیسے کسی آدمی کو، ایک ایسے کمرہ میں بند کر دیا جائے، جہاں سانپ، بچھو، اور دوسرے زہریلے جانور کلبلا رہے ہوں جہاں غلاظت کا ڈھیر اور انبار لگا ہو، جی چاہتا تھا، یہاں سے بھاگ جاؤں، اس گھر سے چلا جاؤں، یہ شہر چھوڑ دوں ———— نہیں ابھی نہیں، مجھے یہ سب کچھ کرنا ہے، لیکن کچھ مدت کے بعد!

میرے کمرہ سے ذرا فاصلہ پر، جاوید کا کمرہ تھا، اس کی روشنی بھی گل ہو چکی تھی، وہ بھی شاید بستر راحت پر دراز تھا، ! ———— اور اسے بستر راحت پر دراز ہونے کا حق بھی تھا، کون سی نعمت تھی جو اسے حاصل نہیں تھی؟ جس گھر میں وہ جہاں بنکر آیا تھا، کتنے سکون، کتنے اطمینان، اور کتنی بے فکری کے ساتھ وہاں ڈاکہ ڈال رہا تھا، پاؤں پھیلا کر سونے کا حق اگر اسے نہ تھا تو کیا مجھے تھا، جس کی ساری پونجی آنکھوں کے سامنے لوٹی جا رہی تھی، اور جو بے بسی کے ساتھ یہ جگہ خراش منظر دیکھ رہا تھا، ؟ ؟

مگر یہ کہوں تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ ساری رات ایک پل کے لیے بھی نیند نہیں آئی، بار بار میں نے سونے کی کوشش کی، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں میں سوئیاں چبھ رہی ہیں جیسے یہ بستر کانٹوں کی سیج ہے، کبھی جی چاہتا کہ اٹھوں اور ہاتھ پکڑ کر شاہدہ کو اٹھاؤں، اور اس سے پوچھوں کیا شرط وفا یہی تھی جو تم کر رہی ہو؟ کیا میری محبت کا جواب اسی طرح دیا جا سکتا تھا جس طرح تم دے رہی ہو؟ کبھی خیال آتا جاؤں، اور جاوید کو بیدار کر دوں، اور اسی سے دریافت کروں کیا شرافت، انسانیت اور معقولیت کا ثبوت اسی طرح دیا جا سکتا ہے؟ کیا میری دوستی کی یہی قیمت ہو سکتی تھی جو تم نے ادا کی ہے،؟ کیا میرے اخلاص، محبت اور اپنایت کا جواب اسی طرح دیا جانا چاہیے تھا؟

پھر خیال آیا، یہ سب باتیں بیکار ہیں، اب بحث و گفتگو، اور افہام و تفہیم کا موقع نہیں، کام کا موقع ہے، کچھ کرنے اور کر دکھانے کا موقع ہے، پستول میرے پاس موجود ہے، اور بھرا ہوا ہے، ایک گولی شاہدہ کے لیے کافی ہے، ایک جاوید کے لیے، اور ——— ایک میرے لیے،

یہ سوچ کر آنکھیں ملتا ہوا میں بستر سے اٹھ بیٹھا، اور سیدھا میز کے پاس پہنچا، جس کی دراز میں بھرا ہوا پستول ہر وقت رکھا رہتا تھا، کنجی ——— سے دراز

کھولی، پستول نکالا، اسے ہاتھ میں لیا، ایک مرتبہ اس کا جائزہ لیا، سب گولیاں اپنی جگہ فٹ تھیں،!

پستول میرے ہاتھ میں تھا، مجھ سے اور میری قوت ارادی سے جنگ ہو رہی تھی اب صبح ہو چکی تھی، چڑیاں چہچہا رہی تھیں، سورج کی کرنیں پھوٹنے لگیں تھیں، یک بیک شاہدہ کی آنکھ کھل گئی، وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی، پہلے اس کی نظر میرے بستر پر گئی، وہاں مجھے موجود نہ پاکر، اس نے مجھے میز کے پاس پستول ہاتھ میں لیے کھڑا دیکھا اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ گیا، شاید مجرم نے سمجھ لیا تھا کہ وقت آخر قریب آ گیا، بھاگنے کا کوئی راستہ نہ تھا، کیونکہ دروازہ میرے قریب ہی تھا، وہ چند لمحوں تک سراپا اضطراب بنی مجھے گھورتی رہی، پھر اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا،

ندیم صاحب، یہ آپ کیا کر رہے ہیں، ؟ ———— کیا آپ سوئے نہیں ؟ آپ کی آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں ؟ آپ کا چہرہ بدلا ہوا کیوں ہے ؟

پستول پر سے میری گرفت ڈھیلی ہو گئی، شاہدہ میرے سامنے تھی، اس کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی، ایک سکنڈ میں یہ آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو سکتی تھی، ایک سکنڈ میں، یہ باغ و بہار جسم بے جان ہو سکتا تھا،

لیکن میرے دل نے مجھے ملامت کی ،

کیا اسے مار ڈالوں جس سے محبت کرتا تھا ؟

کیا اس کی جان لے لوں جسے دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا تھا ؟

کیا اس کی آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں، جو میرے صدائے مسیحا کا حکم رکھتی تھی ؟،

اسے چھیڑتے ہوئے کہا، "ڈر گئیں؟"

وہ اسی طرح سہمے ہوئے انداز میں بولی،

"ڈرنے کی بات ہی تھی، ———— آخر صبح صبح پستول سے شغل کرنے کی کیا سوجھی تھی آپ کو؟"

ایسا معلوم ہوا، اب اس کے دم میں دم آیا ہے، اب ذرا دہشت کم ہوئی ہے، میں نے کہا،

"رات ڈائننگ روم سے آتے ہی میں سو گیا، پھر صبح سے ذرا پہلے آنکھ کھلی تو مجھے چھت پر کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی، میں نے خیال کیا، شاید چور ہو، اور اتر کر سیدھا کمرہ میں آ جائے، تجوری اسی کمرہ میں رہتی ہے، اس میں تمھارے زیورات بھی ہیں، اور نقد روپیہ بھی، لہٰذا، پستول نکالا، اور چور صاحب کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا، لیکن وہ نہیں تشریف لائے، کچھ دیر انتظار کے بعد، میں باہر نکلا، چھت پر بھی گیا، مگر یا تو میرا وہم تھا، یا وہ تشریف ہی نہیں لائے تھے، واپس آ کر ایک مرتبہ پھر میں اس کا جائزہ لے رہا تھا کہ صبح ہو گئی، اور تمھاری آنکھ کھل گئی، ————"

اتنے میں نتھا بیڈ ٹی لے کر آ گیا، شاہدہ نے پیالی ہاتھ میں پکڑی تو میں نے دیکھا اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، شاید میری افسانہ طرازی کا اسے یقین نہیں آیا، اور ایسا ہونا کچھ تعجب خیز بھی نہیں، اس کوچہ میں آج پہلی مرتبہ میں نے قدم رکھا تھا، یعنی پہلی مرتبہ جھوٹ بولا تھا، لہٰذا اگر میرے الفاظ نے، یا میرے لب و لہجہ نے غمازی کر دی ہو کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے تو کچھ بعید نہیں، •

"نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا!"

"یہ تو انتقام ہوا"

اور محبت کی نزاکت انتقام کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی، شاید شاہدہ مجھ سے کبھی محبت نہیں کرتی تھی، وہ میری دولت سے، میری عزت سے، میری خاندانی وجاہت سے محبت کرتی تھی، اگر وہ مجھ سے محبت کرتی ہوتی، تو بے وفائی نہیں کر سکتی تھی، ——— لیکن میں تو اس سے محبت کرتا تھا، اس کے پاس روپیہ نہ تھا کہ اس سے محبت کرتا، اور مجھے روپیہ کی ضرورت ہی کیا تھی، ؟ اس کی خاندانی وجاہت میرے سامنے کیا حیثیت رکھتی تھی؟ یا اس کے خاندان کو کون سی عزت حاصل تھی کہ میرے لیے باعث فخر و ناز ہو سکتی؟ میں تو صرف اسی سے محبت کرتا تھا، شاہدہ سے، صرف شاہدہ سے، کیا میری محبت انتقام کی جو یا ہو سکتی ہے؟

بجلی کی سی تیزی سے یہ خیالات میرے دماغ میں آئے، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، شاہدہ سامنے بے حس و حرکت سہمی سہمی سی، بستر پر بیٹھی تھی، وہی شاہدہ، جو میرے لیے سب کچھ تھی، میں نے سوچا، محبت اب تک میں جس کے ساتھ کرتا رہا ہوں، اس کی کچھ قیمت ہونی چاہیے ——— اور وہ معافی ہی ہو سکتی ہے!

"مجھے اسے معاف کر دینا چاہیے!"

میں نہیں جانتا میری آنکھیں سرخ تھیں یا نہیں؟ مجھے یہ بھی نہیں معلوم میرا چہرا بدلا ہوا نظر آ رہا تھا یا نہیں؟ کیونکہ شاہدہ نے مجھے دیکھا تھا، میں نے اپنے آپ کو نہیں دیکھا، لیکن میں مسکرانے لگا، پستول، پھر اپنے کیس اور وہاں سے میز کی دراز میں واپس پہنچ گیا، کنجی لگا کر میں آیا، اور اپنے بستر پر بیٹھ گیا، میں نے گویا

بیڈٹی سے فارغ ہوکر وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے صبح کے اخبارات دیکھے، پھر غسل کرنے چلا گیا، غسل کرکے اور حسب معمول لباس تبدیل کرکے واپس آیا، تو شاہدہ کمرہ میں نہیں تھی، میں وہاں سے سیدھا، ڈائننگ روم پہنچا، ناشتہ لگایا جا چکا تھا، جاوید اور شاہدہ موجود تھے، لیکن جاوید کا رنگ بھی کچھ اڑا اڑا رہا تھا، اور شاہدہ کے چہرے پر بھی اب تک ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں، دونوں کی اس کیفیت کو نظر انداز کرکے میں نے جاوید سے پوچھا،

"شاہدہ نے میری بہادری کا قصہ تمھیں بتایا یا نہیں؟"

"وہ توس پر مکھن لگاتا ہوا بولا، بتایا لیکن یہاں چور کیسے آسکتا ہے؟"

میں نے سمجھ لیا، اس مدت میں شاہدہ اور جاوید کے مابین آج کے عجیب اور حیرت انگیز واقعہ پر تبادلہ خیال ہو چکا ہے، اور جب تبادلہ خیال ہو چکا ہے، تو غالباً کوئی راہ عمل بھی متعین ہو چکی ہو گی، لیکن اپنے تاثرات کو میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا اور بے تکلفانہ لہجہ میں جواب دیا،

"یہ نہ کہو بھئی، چور کہاں نہیں پہنچ سکتا، یہ آنکھوں سے کاجل یا سرمہ اڑا لینے کی جو کہاوت مشہور ہے، وہ چوری کے لیے تو ہے، تو جب اس فن شریف کے ماہر آنکھوں سے کاجل یا سرمہ اڑا سکتے ہیں، تو کسی کے گھر کی چھت پر نہیں چڑھ

سکتے ؟ ———— حد ہوگئی حسن ظن کی، !،

جاوید نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن شاہدہ نے فکرمند لہجہ میں کہا، "پھر کسی پہرے دار کا بندوبست کر لیجئے"،

میں ہنسنے لگا، میں نے کہا، "پہرے دار خود بھی تو چور ہو سکتا ہے"، !،،

یہ الفاظ بغیر کسی مقصد کے میرے منہ سے نکل گئے تھے، لیکن ان کا اثر بہت حیرت انگیز ہوا، یعنی، جاوید کا رنگ رخ بھی بدل گیا، اور شاہدہ بھی سٹ پٹا گئی، میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا،

"دنیا میں جتنی چوریاں ہوتی ہیں، ڈاکے پڑتے ہیں، ان کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا، یونہی یک بیک ایسا نہیں ہوتا، میرا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوتا کہ چور کسی راستے سے گزر رہا ہے کوئی اچھا سا گھر نظر آیا اور اسنے دل میں سوچا، چلو ذرا چوری کرتے چلیں، یہ کام منصوبہ بندی کے ماتحت ہوتے ہیں، ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق، سازش کی مدد سے، فرض کرو، آج رات واقعی چور آیا تھا، اسے کیا معلوم کہ میں کس کمرہ میں رہتا ہوں؟ تجوری کس کمرہ میں ہے؟ زیورات کہاں رکھے جاتے ہیں؟ نقدی کس جگہ ہے؟ چور کسی گھر میں قدم معلومات ضروری حاصل کرنے کے بعد ہی رکھتا ہے، ————"

جاوید کی حالت اس وقت دیدنی تھی، گرگٹ کی طرح، اس کے چہرے کا رنگ لمحہ بلمحہ بدل رہا تھا، اس نے حیل کو، کسی قدر طنز کے ساتھ کہا،

"اس سلسلہ میں آپ کے معلومات بہت وسیع ہیں، !"

میں نے ایک قہقہہ لگایا، اور بولا،

"ہاں صرف معلومات وسیع ہیں، لیکن تجربہ ذرا بھی نہیں ہے، اناڑی ہوں بالکل ———— کتابی معلومات دوسری چیز ہیں، اور عملی تجربہ ایک بالکل الگ چیز، !،،"

الفاظ بم کے گولہ کی طرح شاہدہ اور جاوید پہ اثر انداز ہوئے، !

"میرا مقصد ان باتوں سے صرف یہ تھا کہ انھیں کسی حد تک اپنی طرف سے مشتبہ کر دوں، تاکہ جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں، جو کچھ ہونے والا ہے، وہ جلد ہو جائے، اور میں اپنے اس مقصد میں توقع سے زیادہ کامیاب ہو رہا تھا، میرے ان الفاظ نے، شاہدہ اور جاوید دونوں کو حواس باختہ کر دیا تھا، ان کے دل میں طوفان اٹھ رہا تھا، لیکن خاموش رہنے پر مجبور تھے، یا سخت سے سخت جواب دینا چاہتے تھے لیکن جواب دے کر کھیل بگاڑنا نہیں چاہتے تھے، ان کی بے بسی سے، میں لطف لے رہا تھا، !

ذرا دیر تک خاموشی طاری رہی، شاہدہ اور جاوید، با دل نخواستہ ناشتہ میں مشغول تھے، لیکن میری ساری تکان رفع ہو چکی تھی، رات بھر جاگنے کا سارا خمار دور ہو چکا تھا، ان دونوں کو یوں سہما ہوا اور دبکا ہوا دیکھ کر میں اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا، میں نے جاوید کو چھیڑا،

"آج تمہارا منہ اس قدر سست کیوں چل رہا ہے؟ کیا دفتر جانے کا ارادہ نہیں ہے، ؟"

موضوع گفتگو کی اس تبدیلی نے بڑا خوشگوار اثر کیا، جاوید کہنے لگا،

"کچھ طبیعت مضمحل ہے، سوچتا ہوں آج غوطہ لگا جاؤں، !"

میں نے اس رائے کی تائید نہیں کی،

"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، ہم دونوں میں سے کسی کو تو دفتر میں بہر حال موجود رہنا چاہیے، !"

جاوید نے حیرت سے میری طرف دیکھا، اور پوچھا،

"تو کیا آپ بھی نہیں جانا چاہتے آج؟"

میں نے کچھ پریشان سا ہو کر کہا،

"نہیں بھائی، میں آج نہیں جا سکوں گا،!"

جاوید نے سوال کیا،

"کس لیے؟ —— آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے،!"

میں نے جواب دیا،

"ہاں —— اسی لیے تو نہیں جا رہا ہوں، —— بات یہ ہے کہ آج اختر مرزا کے ساتھ شکار کا پروگرام ہے، شام تک واپسی ہو گی، ——"

شاہدہ نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے، اور درحقیقت اپنے اضطراب پنہاں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

"مجھے بڑی نفرت ہے شکار بازی سے،!"

میں نے ملائمت اور ملاطفت کے ساتھ سوال کیا،

نفرت تو جب ہوتی، کہ میں شکاری ہوتا، کبھی کبھی شکار کرنے سے آدمی شکاری تو نہیں بن جاتا،!"

ایک مرتبہ پھر دونوں کا رنگ رخ شکاری کا لفظ سن کر بدل گیا، میں نے اس کیفیت سے خاص لطف لیا، شاہدہ نہیں چاہتی تھی کہ میں وہ محسوس کر دں جو محسوس کر رہا تھا، واقعہ یہ ہے کہ عورت سے بڑھ کر مدبر، معاملہ فہم اور دور اندیش کوئی نہیں ہوتا، جس بات کو ہم گھنٹوں اور پہردں سوچتے ہیں وہ آن کی آن میں اس کا فیصلہ کر لیتی ہے، اس نے اصل موضوع پر پھر، نہایت سادگی سے آتے ہوئے کہا،

"آخر بے گناہ اور معصوم پرند ے خدا نے اس لیے تو نہیں بنائے

ہیں کہ خواہ مخواہ محض اپنا شوق پورا کرنے کے لیے ان کی جان لی جائے، ——

—— کیا یہ ظلم نہیں ہے، ؟!

میں نے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ زیادہ دیر تک جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھا،

"یہ تو ٹھیک ہے، —— اگر کہو تو نہ جاؤں'!"

وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہوئی گویا میرے چہرے اور دل کو پڑھنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی،

"پروگرام بن چکا ہے تو چلے جائیے، میں روکتی بھی نہیں،!"

میں اٹھ کھڑا ہوا، پھر میں نے جاوید سے پوچھا،

"تو تم دفتر جاؤ گے؟"

اس نے مضمحل لہجہ میں جواب دیا،

جانا ہی پڑے گا،!"

میں نے اور زیادہ اپنایت کے ساتھ سوال کیا،

"تمھیں کیا چیز مرغوب ہے؟ اسے لیتا آؤں؟"

جاوید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا،

"کچھ نہیں، —— یوں جو کچھ آپ لیتے آئیں گے اسے کھانے میں انشاء اللہ آپ سے پیچھے نہیں رہوں گا! ——"

شاہدہ ہنسنے لگی،

"واہ آپ تو سب سے اچھے رہے، —— شکار کوئی کرے، اور مزے کوئی اڑائے ——"

میں نے چلتے چلتے کہا،

"اس دنیا میں ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا، ——— "

اور پھر ان دونوں کی طرف دیکھے بغیر میں باہر آ گیا"!

میں نے ایک مصرعۂ طرح عرض کر دیا تھا، اور ان دونوں کو طبع آزمائی کی دعوت دے آیا تھا، میرے رخصت ہونے کے بعد، یقیناً میرے اس حکیمانہ قول پر، دونوں سر جوڑ کر غور کرنے بیٹھ گئے ہوں گے کہ یہ الفاظ یونہی آمد محض میں میری زبان سے نکل گئے تھے یا ان کا کوئی خاص مطلب ہے؟ ۞

(۲۴)

کئی دن سکون سے گزر گئے، لیکن یہ وہی سکون تھا جو طوفان سے پہلے سمندر میں نظر آتا ہے'!

ہم میں سے ہر شخص دل ہی دل میں کچھ بے چینی سی محسوس کرتا تھا، ایک مبہم سی خلش، ایک مبہم سا اضطراب، ایک مبہم سی بے کلی، اور، ———— کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو بتا بھی نہ سکے'!'

ہم میں سے ہر کوئی ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھ رہا تھا، لیکن یہ شبہ کیوں تھا؟ اس بدگمانی کی بنیاد کیا تھی'؟ یہ انجانا سا اضطراب کس لیے تھا، اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل تھا'!

کوئی ایسی بات نہیں تھی جو گرفت میں آسکے، لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے سکون اور اطمینان کی دنیا درہم برہم کر رکھی تھی'!

اب شاہدہ کے چہرے پر وہ رعنائی نہ تھی، جس نے اسے رشک گلستاں بنا رکھا تھا، اب جاوید کے رخ پر وہ تازگی نہیں تھی جس نے اسے مطلوب جواناں بنا رکھا تھا،

دونوں بجھے بجھے سے، خاموش خاموش سے نظر آرہے تھے'!

میں سب کچھ سمجھ رہا تھا، سب کچھ جان رہا تھا، لیکن انجان بنا ہوا تھا'! ————

اب مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنا ضبط کہاں سے آگیا تھا مجھ میں،!

جن باتوں پہ پہلے کبھی میں نے غور نہیں کیا تھا اب خود بخود، وہ نظروں کے سامنے آجاتیں، اور ان میں ایک گنج معنی پوشیدہ ہوتا، ہم لوگ ہمیشہ ساتھ ساتھ ناشتہ کرتے تھے، کھانا کھاتے تھے، اگر کبھی کوئی کسی وجہ سے دیر میں آیا، تو اس کا انتظار کرتے تھے، اور جب تک وہ نہ آجائے انتظار کرتے رہتے تھے، لیکن یہ میں نے کبھی نہیں محسوس کیا تھا کہ، ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر بھی، کسی کا انتظار چھپے ہوئے اشتیاق اور اضطراب سے کرتے ہیں، اب میں دیکھتا کہ اگر، شاہدہ کو کسی وجہ سے آنے میں کچھ دیر ہو جاتی، تو جاوید کی نگاہیں بار بار دروازے سے اور وہ گزرے ٹکرا ٹکرا کر واپس آتیں، یہی کیفیت شاہدہ کی بھی تھی، وہ بھی جب تک جاوید نہ آجاتا پہلو بدلتی رہتی، اور دروازے کو تکتی رہتی، یہ تماشہ دیکھ دیکھ کر مجھے بہت غصہ آتا، لیکن خاموش رہتا، ضبط سے کام لیتا، ایک روز حسب معمول ہم ناشتہ پہ بیٹھ چکے تھے، مگر جاوید اب تک نہیں آیا تھا، کافی دیر گزر گئی، میں نے منجھے سے کہا،

"جاوید صاحب اب تک نہیں آئے جا انھیں بلا لا،!"

وہ ذرا دیر میں واپس آیا، اس نے کہا،

"وہ کہتے ہیں مجھے بخار ہے، میں ناشتہ نہیں کروں گا،!"

میں نے دزدیدہ نظروں سے شاہدہ کی طرف دیکھا، اس کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا، بس ہوتا، تو فوراً جاتی، لیکن میں سنگ راہ کی طرح موجود تھا، نہ جا سکی، میں نے ناشتہ شروع کرتے ہوئے کہا،

"جاؤ دیکھ آؤ ذرا، واقعی بخار ہے یا بن رہا ہے،!"

شاہدہ اس طرح اٹھی، جیسے وہ تیار ہی بیٹھی تھی، میں ناشتہ کرتا رہا، میں ناشتہ کر چکا، میں نے سگریٹ جلایا، اور وہ ختم ہو گیا، پھر دوسرا سگریٹ سلگایا، تب وہ آئی

لیکن اس طرح آہستہ آہستہ قدم رکھتی جیسے نصیب دشمناں خود بیمار ہو، میں نے پوچھا،

"کیا خبر لائیں؟ واقعی بخار ہے' یا آرام کی سوجھی ہے'؟"

کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا،

"بخار ہے تو، ——— میں نے خود ٹمپریچر لیا، ۱۰۰ تھا'!"

میں نے بے پروائی سے کہا، او ہو [illegible] بخار ہے؟ گھنٹہ دو گھنٹہ میں اتر جائے گا، تم ناشتہ تو کرو، ٹھنڈا ہو رہا ہے، اس نے چائے بناتے ہوئے ننھے سے کہا،

"دیکھو جاوید صاحب کے لیے جلدی سے دلیہ تیار کر کے لے آؤ'،

ننھے تعمیل حکم کے لیے چلا گیا، میں نے دیکھا، شاہدہ اب تک پیالی سے کھیل رہی ہے، میں نے خود چائے بنائی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، 'دیپو! سوچ کیا رہی ہو؟ کہیں تمہاری بھی تو کچھ طبیعت نہیں خراب ہے'!؟"

وہ سنبھل گئی، جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، جلدی سے پیالی اپنی طرف بڑھالی، اور ایک گھونٹ پیتے ہوئے بولی، "واہ، میری طبیعت کیوں خراب ہونے لگی، اچھی ہوں آپ تو چاہتے ہیں، میں بیمار پڑ جاؤں، مر جاؤں'!"

ان الفاظ میں طنز بھی تھا، اور عشوہ بھی، اگر میں اعتراض کروں تو عشوہ نہ سمجھوں تو طنز، میں نے کہا،

"بجا فرمایا، ——— بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہو، ———

اتنے میں ننھے دلیہ لے کر ادھر سے گزرا، شاہدہ نے کہا،

"ادھر لا پہلے مجھے تو دکھا دے'،

ننھے نے لا کر دلیہ سامنے رکھ دیا، شاہدہ نے اسے دیکھا، پھر برا سا منہ بنا کر بولی،

"بڑے کام چور ہو تم ماں بیٹے، شکر تو ہے ہی نہیں'!"

ننھے خاموش رہا، شاہدہ نے شکر ڈالنا شروع کی، ایک، دو، تین ا ——
میں نے ٹوکا، "کہاں تک شکر ڈالتی چلی جاؤ گی؟" ویسے میں شکر ڈال رہی ہو،
یا شکر میں دلیہ؟
اس نے چوتھا چمچہ ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا،
"آپ کے جاوید صاحب کو تو شکر کا ہو گا ہے، چلتے چلتے تاکید کر دی تھی کہ
شکر کافی ہونی چاہیے!!"
میں سمجھ گیا، شاہدہ بیگم نے صرف عیادت ہی پہ اکتفا نہیں کیا، بلکہ ضروری
ہدایات بھی غذا اور ناشتہ کے سلسلہ میں لے کر آئی ہیں، میں نے کہا،
"بہت ہو گیا اب بس کرو!!"
شاہدہ نے دلیہ ننھے کی طرف بڑھا دیا۔ وہ لے کر چلا گیا!!
کتنا جی چاہ رہا تھا بیچاری کا کہ خود اپنے ہاتھ سے لے جا کر کھلاتی، لیکن ایک
منحوس آدمی، یعنی میں سامنے بیٹھا تھا، آخر یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی،
تھوڑی دیر کے بعد، ننھے دلیہ کی پلیٹ لے کر واپس جا رہا تھا کہ شاہدہ نے
اسے بلایا، پہلے پلیٹ کا معائنہ کیا، گویا دیکھ رہی تھی کہ کھایا بھی یا نہیں؛ لیکن پلیٹ
خالی دیکھ کر دل محزون کو سکون ملا، پھر اس نے کہا،
"صغرا سے کہہ دینا، جاوید صاحب کے لیے شوربا پکالے دوپہر کو!"
میں نے پھر ٹوکا، "کیا غضب کرتی ہو، کیا جان لینے کا ارادہ ہے غریب کی؟"
وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی، میں نے ایک طبیب حاذق
کی طرح بتایا:
"بخار میں فاقہ کرنا، بہترین علاج ہے، آج جاوید صاحب نہ دوپہر کو کچھ کھائیں
گے، نہ رات کو، صبح دیکھ لینا نہ بخار ہو گا، نہ بیماری،"

شاہدہ نے میری باتوں کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی، اس نے نجمے سے پوچھا، سن لیا، کیا کہہ رہی ہوں؟ اس نے گردن ہلا کر اقرار کیا، شاہدہ نے کہا، بس جاؤ"!

اس کے جانے کے بعد، کچھ دیر تک مختلف قسم کی باتیں میں کرتا رہا، لیکن میں نے محسوس کیا، کافی پریشان ہے، میری باتوں کا جواب تو ہوں ہاں کرکے دے دیتی ہے، لیکن خود سے کوئی بات نہیں کرتی، پھر میں اٹھا، میں نے کہا جاؤں ذرا جاوید صاحب کا معائنہ بھی کر لوں، وہ بھی میرے ساتھ ساتھ اٹھی، ہم دونوں جاوید کے کمرے میں گئے، وہ چپ چاپ بستر پر پڑا تھا، میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، تو واقعی بخار تھا، اور غالباً ۱۰۰ ہی ہوگا، میں نے پوچھا،

"یہ کیسا روگ پال لیا؟"

وہ خاموش رہا، میں نے نصیحت کرتے ہوئے کہا،

"بیماری خود سے کبھی نہیں آتی، بلائی جاتی ہے، تو فوراً آجاتی ہے، ضرور کوئی بد پرہیزی کی ہے تم نے، بسیار خوری تمہاری عادت بن چکی ہے، اسے چھوڑ دو، اچھے ہو جاؤ گے، میں نے شاہدہ کو تاکید کر دی ہے کہ خیر دلیے تک تو مضائقہ نہیں لیکن آج تمہیں کٹا کے کا فاقہ دیا جائے، یعنی دوپہر اور رات کا کھانا بند، شاہدہ بہرحال عورت ہے اور عورت کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ زندگی اور کھانے میں بڑا گہرا ربط ہے، لیکن تم عقلمند ہو، وہ اگر کھلائے بھی تو نہ کھانا"!

جاوید نے بہت مختصر سا جواب دیا،

"نہیں کھاؤں گا، ——— مجھے خود بھوک نہیں ہے"!

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا بے ساختہ منہ سے نکل گیا،

"اسی لیے دلیہ واپس کر دیا، ———"

جاوید مسکرانے لگا، اور بولا" آپ کو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے، میں واقعی بیمار ہوں"!

میں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا، اچھے ہو جاؤ گے شام تک، گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ! ——— اب تم آرام کرو، میں دفتر جاتا ہوں، ! ،

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، شاہدہ اور جاوید نے میرے اس اعلان کا خاموش گرم جوشی سے خیر مقدم کیا، ! •

---

(۲۳)

گھر سے میں سیدھا دفتر پہنچا، اور ضروری کاموں میں منہمک ہو گیا، عام طور پر ایک بجے کے قریب، یعنی ٹھیک لنچ کے وقت گھر واپس جایا کرتا تھا، آج نہ جانے کیوں، ٹھیک ۱۲ بجے طبیعت میں لہر آئی کہ گھر چلنا چاہیے، اور اس طرح جانا چاہیے جیسے چور کسی پرائے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ یہ خیال جیسے ہی دل میں آیا، فوراً اس پر عمل بھی شروع کر دیا، دفتر سے اٹھ کر میں گھر پہنچا، سب سے پہلے اپنے کمرہ میں گیا، وہ خالی تھا، خالی ہونا ہی چاہیے تھا، شاہدہ نہیں تھی، اسے ہونا بھی نہیں چاہیے تھا، پھر دبے پاؤں جاوید کے کمرے کی طرف بڑھا، دروازہ بھڑا ہوا تھا، ذرا سا پٹ کھلا تھا، میں یک بیک اندر داخل ہو گیا، جاوید بدستور بستر پہ لیٹا تھا، شاہدہ اس کے پاس ہی مسہری کی پٹی پہ بیٹھی تھی، مجھے یوں یک بیک آتے دیکھ کر دونوں گھبرا گئے، لیکن شاہدہ کی حاضر دماغی کی تعریف کرنا پڑتی ہے، اس نے مجھے دیکھ چکنے کے باوجود میری طرف نہیں دیکھا، اور جاوید سے گویا سلسلۂ کلام جاری رکھا،

"ہاتھ ادھر لائیے نبض تو دیکھنے دیجئے!!"

یہ کہہ چکنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا، اور، اس طرح جیسے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، مجھے مخاطب کرتی ہوئی بولی:

"آپ کے جاوید صاحب نے تو پریشان کر دیا ہے نبض بھی نہیں دیکھنے دیتے، !"

یہ کہہ کر وہ اٹھی، اور پاس ہی جو کرسی پڑی تھی اس پہ آکر بیٹھ گئی، میں وہاں جاکر بیٹھ گیا، جہاں شاہدہ بیٹھی تھی، میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جاوید سے کہا "لاؤ میں دیکھوں نبض"!

ایک بے بس معمول کی طرح، جاوید نے ہاتھ میری طرف بڑھا دیا، نبض کی رفتار تیز تھی، ——— لیکن بخار کی وجہ سے نہیں، میری ناوقت اور دفعتہً آمد کی وجہ سے، اگر شاہدہ کی نبض دیکھ سکتا تو وہ شاید اس سے بھی زیادہ تیز نظر آتی، کمرہ میں دروازے بند ہونے کی وجہ سے تقریباً اندھیرا تھا، اور میں چونکہ دھوپ میں چلکر آرہا تھا اس لیے یہ اندھیرا مجھے اور زیادہ محسوس ہو رہا تھا، میں نے دونوں کے چہرے پڑھنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا،

نبض دیکھنے کے بعد، میں نے ماتھے پہ ہاتھ رکھا، پھر شاہدہ سے کہا، ذرا تھرمامیٹر تو لانا، وہ جلدی سے اٹھی، اور تھرمامیٹر لاکر میرے ہاتھ میں دے دیا، جاوید نے بہت ہیں نہیں کی، لیکن میں نے منہ میں لگا ہی دیا، اب بخار ۹۹ سے کچھ کم تھا، میں نے شاہدہ سے کہا،

"مبارک، ———"

وہ دہل گئی، اور مجھے دیکھنے لگی، میں نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا،

"بخار صاحب تشریف لے گئے ——— اب میں اپنے سابقہ احکام واپس لیتا ہوں، جاوید کھائے گا، اور ڈٹ کر کھائے گا، اور وہ سب کچھ کھائے گا، جو ہم زہر مار کریں گے، !"

پھر میں نے جاوید سے پوچھا، !

"یہ تو بتاؤ بھوک بھی ہے یا نہیں؟ نہ ہو تو نہ سہی"!!

وہ کہنے لگا "بھوک ہی نے بخار کو بھگایا ہے"! نہ ہونے کی خوب رہی!

اس جواب پر شاہدہ ہنسنے لگی، مجھے بھی ہنسنا پڑا، وہ بولی، واقعی جاوید صاحب آپ کی کمزوری بھوک ہے"!

میں نے لقمہ دیا "بھوک نہیں ——————— جاوید صاحب کی کمزوری کھانا"!

"جاوید کے حواس اب بجا ہوئے" اس نے پوچھا "خلاف معمول جلد کیوں آ گئے آپ؟"

میں نے بات بنائی "تم بستر علالت پر دراز تھے، وہاں میرا جی کس طرح لگتا، اتنی دیر بیٹھا یہی کمال ہے"

کچھ بے چینی سی محسوس کی میں نے جاوید کے انداز میں، پھر میں شاہدہ سے مخاطب ہوا،

"کیا کرتے رہے یہ حضرت اب تک؟"

میرے اس سوال پر وہ کچھ گھبرا سی گئی، لیکن جلد ہی اپنی کیفیت پر غالب آگئی، کہنے لگی،

"میں تو ابھی آئی ہوں سوتے رہے ہوں گے"!

میں نے جاوید سے سوال کیا "کیوں جی سو رہے تھے تم؟ آنکھیں تو تارا سی چمک رہی ہیں، خدا کا کہیں کالے کوسوں پتہ نہیں"

وہ بھی میری اس جرح پر سٹ پٹا گیا، کہنے لگا، "نیند کہاں آتی ہے اس حالت میں، پڑا کروٹیں بدل رہا تھا"!

اتنے میں صغرا آگئی، اس کے ہاتھ میں ایک پیالہ تھا، میں نے کہا،

"یہ قدح بھر کر کیا لائی ہو؟ ہمارے جاوید صاحب حکیموں کی دوا نہیں پیتے لے جاؤ اسے"!

صغرا نے بتایا "بیٹے دوا نہیں یخنی ہے"!

ظاہر ہے یہ فرمائش جاوید کی نہیں ہوگی، خود شاہدہ نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ حکم دیا ہوگا، جاوید یخنی پینے لگا، مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے اس پیالے میں یخنی نہیں، میری آرزوؤں اور حسرتوں کا خون ہے"! ——— وہ یخنی پی رہا تھا، اور میں زہر کے گھونٹ"!

یخنی پی کر، جب جاوید صاحب نے پیالہ واپس کیا، تو صغرا نے شاہدہ سے کہا،

"دولہن اخبار والا آیا ہے، بل مانگ رہا ہے"!

شاہدہ نے جواب دیا، "بل تو تم نے مجھے نہیں دیا"

صغرا نے یاد دلایا، "بیٹی وہ تو بہت دیر ہوئی (میری طرف اشارہ کر کے) جب یہ دفتر گئے ہیں، اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں یہیں آکر تمھیں دے گئی تھی"!

ابھی ابھی شاہدہ نے مجھے بتایا تھا کہ ذرا دیر ہوئی ہے اسے یہاں آئے ہوئے اب اس کے منہ پر، اور میرے سامنے صغرا کھڑی کہہ رہی تھی کہ بڑی دیر ہوئی، یعنی میرے دفتر جانے کے بعد ہی وہ بل لاکر یہیں دے گئی تھی، تردید کا موقع نہ تھا، کیونکہ بات بڑھ جاتی، خاموشی ہی مصلحت تھی، لیکن میں نے دزدیدہ نظروں سے دیکھ لیا کہ صغرا کی اس حق گوئی نے جاوید اور شاہدہ دونوں کو حواس باختہ کر دیا، بہرحال بات ٹالنے کے لیے اس نے کہا،

"ہوگا، مجھے یاد نہیں، کہدو پھر آجائے کسی وقت"!

میں نے کہا "بیچارہ غریب آدمی ہے کیوں بار بار چکر لگائے"!

"پھر میں نے صغرا سے کہا، پوچھ آؤ، کتنے کا بل تھا؟"

صغرا نے ذرا دیر میں آ کر "بتایا، بارہ روپے بارہ آنے کا"

میں نے جیب سے روپے نکالے اور صغرا کو دے دیے، صغرا چلی گئی، لیکن اپنے پیچھے، ایک عجیب دہشت انگیز منظر چھوڑ گئی، جاوید کو بھی چپ لگ گئی تھی، اور شاہدہ بھی گم صم بیٹھی تھی، ——— ہائے مجبوریاں محبت کی''!!

میں نے اس فضا کو بدلنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا، جاوید تو ویسے ہی چپ چپ تھا، شاہدہ بھی بالکل خاموش ہو گئی، اور سچ یہ ہے کہ مجھے بھی خاموش ہی ہو جانا پڑا، موقعہ ہی کچھ ایسا تھا،

تھوڑی دیر کے بعد، صغرا کا پیامبر نیچے آیا، اس نے اطلاع دی کھانا تیار ہے، میں نے کہا وہ چھوٹی میز لا کر یہیں بچھا دو، یہیں کھائیں گے، ذرا دیر میں میز لگ گئی اور کھانا شروع ہو گیا ——— لیکن واقعہ یہ ہے کہ صرف میں کھا رہا تھا، جاوید اور شاہدہ سے کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا تھا،!

(۲۴)

بظاہر میں خوش تھا، مسرور تھا، ہشاش بشاش تھا، اپنے تمام معمولات پر عمل کرتا تھا، ناشتہ، کھانا، سیر، تفریح، دفتر، بات چیت، کسی چیز میں فرق نہیں آیا تھا،!

لیکن کیا واقعی میں خوش تھا؟

"کیا واقعی میں مسرور، اور ہشاش بشاش تھا؟

نہیں، امر واقعہ یہ نہیں تھا،!

امر واقعہ یہ تھا کہ میرا دل کوہ آتش فشاں بنا ہُوا تھا، جس میں آگ ہی آگ تھی" اور، ہر وقت اس کا آتش ریز، آتش افروز، اور آتش انگن لاوا پھوٹ کر نکل سکتا تھا،!

مگر میں ضبط سے کام لے رہا تھا،!

میرے داہنے بائیں، دو نہایت زہریلے سانپ مسلط تھے، جو ہر وقت مجھے ڈستے رہتے تھے، جن کا زہر میری رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا،!

لیکن میں اف بھی نہیں کرتا تھا،!

کیا میں بے غیرت تھا؟ بے حیا تھا کہ اپنی آنکھوں کے سامنے، جاوید اور شاہدہ کا رومان پروان چڑھتے دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا؟

کیا میں بے وقوف تھا کہ اتنا ہولناک واقعہ میرے گھر میں میرے سامنے ہو رہا تھا، اور میرے لب بند ہے ہوئے تھے؟

کیا میں دیوانہ تھا کہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا تھا، مگر سمجھتا کچھ نہیں تھا؟
نہیں، یہ کچھ نہیں تھا، نہ میں بے غیرت تھا، نہ بے حیا، نہ بے وقوف نہ دیوانہ!
میرے ہوش و حواس قائم تھے، میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں، میرے کان سن رہے تھے، میرا دماغ سوچ رہا تھا، پھر بھی اگر میں خاموش تھا، تو اس کی کوئی وجہ تھی، اس کا کوئی سبب تھا!

میں جب چاہتا، کان پکڑ کر جاوید کو اپنے گھر سے نکال سکتا تھا، دفتر کے دروازے اس کے لیے بند کر سکتا تھا، اسے اپنی ہوشیاری اور فراست پر ناز تھا، لیکن ان چند دنوں میں، اس کے استنے اور ایسے فراڈ چیکے میں نے پکڑے تھے کہ جب چاہتا اسے بآسانی جیل بھیج سکتا تھا، اور جیل جانے کے بعد وہ ضمانت پر بھی نہیں رہا ہو سکتا تھا، میں اسے مچھر کی طرح مسل سکتا تھا، میں اسے سنگ راہ کی طرح کچل سکتا تھا، یہ سب کچھ میرے اختیار میں تھا، بس میں تھا،

اسی طرح میں جب چاہتا، شاہدہ کا فیصلہ بھی کر سکتا تھا!

اس کی میرے سامنے بساط کیا تھی، ؟ میرے سامنے وہ زبان نہیں کھول سکتی تھی، وہ میرے اوپر کوئی الزام عائد نہیں کر سکتی تھی، اس کی جان ناتواں میرے ہاتھ میں تھی میری مٹھی میں تھی، میں اگر چاہتا اسے طلاق دے دیتا، کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیتا، سارا زیور چھین لیتا، جتنی بیش قیمت چیزیں اسے دی تھیں سب واپس لے لیتا، وہ چوں بھی نہیں کر سکتی تھی، ————— چوں کرنے کے لیے ہمت چاہیے تھی، اور میں چاہتا تھا، ایک فریب کار عورت کے پاس یہ جنس نہیں ہے!!

لیکن میں جاوید کو بھی ڈھیل دے رہا تھا، اور شاہدہ کو بھی!

میں اس ڈرامے کو کلائمکس تک پہنچانا چاہتا تھا۔

ڈوری میرے ہاتھ میں تھی، جب چاہوں ڈھیل دے دوں، جب چاہوں کھینچ لوں

شاہدہ نے میرے دل کو وہ صدمہ پہنچایا تھا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے، جاوید نے میرے اعتماد کو شکست کر دیا تھا، ان دونوں سے میں نفرت کرنے لگا تھا، ان کی صورت دیکھنا بھی مجھے گوارا نہ تھا،

پھر بھی میں خاموش تھا، پھر بھی میں ضبط سے کام لے رہا تھا، پھر بھی میں ڈھیل دے رہا تھا،!

کیوں؟ کس لیے؟

صرف اس لیے کہ یہ دلدل میں اتنے دھنس جائیں کہ پھر نہ نکل سکیں، جب تک بچ جانے کی، نکل سکنے کی ذرا بھی گنجائش تھی، میں خاموش رہنے پہ مجبور تھا، جس لمحے یہ امکان ختم ہو جائے، جس روز یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اتنے دھنس چکے ہیں کہ اب دنیا کی کوئی طاقت انہیں نہیں نکال سکتی،!

وہ دن ہوگا میرے عمل کا،! ——— وہ دن ہوگا میرے انتقام کا،!،

میں اپنے آپ کو ایک نہایت معمولی آدمی سمجھا کرتا تھا، ویسا ہی آدمی، جیسے ہر وقت سڑکوں پہ چلتے اور گھومتے نظر آتے ہیں، یہ معمولی قسم کے آدمی ہوتے ہیں، ان میں کوئی بڑائی نہیں ہوتی، عظمت نہیں ہوتی، رفعت نہیں ہوتی،

مجھ میں بھی کوئی بڑائی نہیں تھی، کوئی عظمت نہیں تھی، کوئی رفعت نہیں تھی،!

لیکن اس واقعہ نے، ——— شاہدہ کی بے وفائی نے جاوید کی غداری نے مجھے بہت بڑا آدمی بنا دیا، ——— کم از کم میری نظر میں،!

میں خود اپنی عزت کرنے لگا،!

میں خود اپنی عظمت کے سامنے سر بہ سجدہ ہوگیا، !

کوئی شخص بھی، یہ معلوم کرنے کے بعد، کہ اس کی بیوی بے وفا ہے، اور مسلسل بے وفائی کا ارتکاب کر رہی ہے، خاموش نہیں رہ سکتا، وہ یا تو اسے مار ڈالے گا، یا خودکشی کر لے گا، یا دونوں کام کر گزرے گا،

اسی طرح کوئی شخص بھی جب اپنے کسی دوست کے بارے میں یہ معلوم کر لے کہ یہ مار آستین ہے، دغا باز ہے، غدار ہے، اس کی بیوی کو ورغلا کر، اسے بے وفا بنا چکا ہے تو اس کا وجود نہیں برداشت کر سکتا، اس کے لیے بھی اس کا طرز عمل یہی ہوگا کہ مار ڈالے گا، یا خودکشی کر لے گا، یا دونوں کام انجام دے ڈالے گا،

یہ اتنی قدرتی اور فطری بات ہے کہ ہر روز اس طرح کے واقعات اخبارات میں آتے رہتے ہیں، اور جب ایسے لوگ ماخوذ ہوتے ہیں، عدالت بھی ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ رعایت کرتی ہے، !

لیکن میں نے بے وفا بیوی اور غدار دوست کو مار ڈالنا تو کجا، ایک لفظ تک نہیں کہا، گھر سے نکال دینا تو کجا، ان کے ساتھ اس مہر و التفات کا برتاؤ رکھا، جو میری سرشت بن چکا تھا، !

کیا یہ معمولی کارنامہ ہے؟ —————— کیا ہر شخص اس دل گردہ کا ہوتا ہے کہ اتنا بڑا طوفان خاموش، لب تک ہلائے بغیر جھیل لے جائے؟

نہیں اب نہیں ہوتا، !

لیکن میں نے اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا، !

میں اسی گھر میں رہتا رہا، جس میں یہ دونوں رہتے تھے۔ میں نے ان دونوں کو اسی گھر میں رکھا، جس میں خود رہتا تھا، !

اور کبھی اپنے چہرے بشرے سے اس نفرت کا اظہار نہیں ہونے دیا، جو میرے

دل و دماغ کو جلا کر خاکستر کر چکی تھی، اب نہ میرے پاس دل تھا، نہ دماغ، ——

اب میں تھا، اور ماتم یک شہر آرزو،!

ایک روز کا واقعہ ہے کہ شاہدہ نے مجھ سے کہا،

"میں ذرا نغمہ کے ہاں جا رہی ہوں،!"

میں نے پوچھا، یہ کون صاحبہ ہیں؟ یہ نام تو کبھی سننے میں نہیں آیا؟"

شاہدہ نے بتایا، نغمہ میری سہیلی ہے، کالج میں میرے ساتھ پڑھتی تھی، پھر اس کی شادی ہوگئی، اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک دوسرے شہر میں چلی گئی، آج کل چندروز کے لیے آئی ہوئی ہے، شاید اس کے ساتھ سینما بھی جانا پڑے، ممکن ہے، ۹ بجے شب تک واپسی ہو،!

میں نے کہا، "شوق سے جا سکتی ہو،!"

وہ چلی گئی، اور میں بھی اس کے تعاقب کا پروگرام بنا کر چل کھڑا ہوا، صغرا نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آج ریگل میں، ایک انگریزی فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا ہے دونوں نے، کچھ دیر ادھر ادھر گشت کرنے کے بعد، میں ریگل میں پہنچ گیا، میں عمداً دیر سے پہنچا تھا، یعنی پکچر شروع ہونے کے بعد، میں جانتا تھا، یہ لوگ گیلری میں بیٹھیں گے، میں نے بھی وہیں کا ٹکٹ لیا، اور گیٹ کیپر کی رہنمائی میں ٹارچ کی روشنی سے کرسیاں نانگھتا پھلانگتا، اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا،!

فلموں سے ویسے بھی مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے، اور اگر کچھ تھی بھی تو آج وہ مبدل بہ نفرت ہوگئی تھی،!

مجھے کچھ پتہ نہیں اسکرین پر کیا کیا دکھایا جاتا رہا،

اور دفعتہً یہ تاریک ہال بقعہ نور بن گیا،!

میری نگاہ کو ادھر ادھر جائزہ لینے، اور شاہدہ و جاوید کو تلاش کرنے کی زحمت

نہیں برداشت کرنا پڑی،!

دونوں مجرم، میرے بالکل آگے، اور سامنے کی نشست پر متمکن تھے،!

جاوید نے نہ جانے کیوں پیچھے مڑ کر دیکھا، تو مجھ سے آنکھیں چار ہو گئیں، میں

نے کسی طرح تعجب کیے بغیر بیٹھے بیٹھے کہا،

"ارے تم،؟ ———— وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو یہاں آجاؤ،

یہ کرسی خالی ہے،!"

شاہدہ اس کے پاس بیٹھی تھی، اب تک اس کی پیٹھ تھی میری طرف، میری آواز

سن کر شاید بلا ارادہ اس کی گردن بھی مڑ گئی، اور ہم دونوں کی آنکھیں بھی چار ہو گئیں،!

میں نے اپنا سابقہ موڈ قائم رکھا، ذرا جو ظاہر ہونے دیا، ہو کر چوری پکڑی گئی

ہے، اس سے بھی میں نے کہا،

"ارے تم بھی ادھر آجاؤ، ———— !"

کس میں مجال تھی کہ میرے اس حکم کی تعمیل سے انکار کرتا؟ جاوید اور شاہدہ

دونوں کچے دھاگے میں بندھے ہوئے چپ چاپ چلے آئے، شاہدہ میرے

پاس آکر بیٹھ گئی، جاوید میرے بائیں ہاتھ پر بیٹھ گیا، دونوں کے بیچ میں خاکسار،!

میں نے اس طرح گویا، نہ کوئی قابل اعتراض بات کی ہے، نہ میں نے کچھ محسوس کیا

ہے، شاہدہ سے پوچھا،

"نغمہ کہاں رہ گئیں؟ ————"

شاہدہ اور جاوید دونوں کے چہرے پر اس وقت مردنی چھائی ہوئی تھی، جیسے پھانسی

کی سزا مل چکی ہو، اور جلاد مقتل کی طرف لے چلنے کے لیے آرہا ہو،

میرے اس سوال کے جواب میں شاہدہ نے پھر ایک مرتبہ حاضر دماغی کا ثبوت

دیا، اس نے کہا،

"میں تو نجمہ اور اس کے شوہر ہی کے ساتھ آئی تھی، لیکن، یہاں آکر اس کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی، بیٹا ہے سب ہے، شوہر گھبرا گئے، اور فوراً اپنے ساتھ لے گئے، کہ کہیں درد نہ شروع ہو جائیں، ــــــــــــ"

وہیں نے اس عذر کو بغیر کسی عذر کے تسلیم کر لیا،

"اچھا یہ بات ہے، ــــــــــــ تمہارے جانے کے بعد کچھ ایسی طبیعت گھبرائی کہ گھر کاٹنے کو دوڑنے لگا، سوچا کیوں نہ میں بھی سینما کی سیر کر آؤں، بہت دن سے دیکھا بھی نہیں تھا، یہاں چلا آیا، اور بے گمان گمان تم سے اور جاوید صاحب سے مڈبھیڑ ہو گئی، ہا ہا"

اتنے میں انٹرول ختم ہوا، اور کھیل پھر شروع ہو گیا، ٭

(۲۵)

چند روز کے بعد ————

دفتر سے میں چلنے لگا تو جاوید نہیں تھا، معلوم ہوا کہیں کام سے گیا ہے، میں نے بھی انتظار نہیں کیا، اور گھر آ گیا، یہاں شاہدہ میرا انتظار کر رہی تھی، آج غیر معمولی طور پر تپاک اور گرم جوشی سے اس نے میرا استقبال کیا، اس تپاک میں تصنع صاف نمایاں تھا میں سمجھ گیا، کوئی خاص بات ہے، میں نے بھی اس تپاک اور گرم جوشی کا کچھ زیادہ ہی جوش وخروش سے جواب دیا، چائے سے فارغ ہو کر اس نے بڑے اپنائیت کے لہجہ میں شکایت کی،

"آج کل آپ کچھ اکھڑے اکھڑے سے نظر آتے ہیں، جیسے خفا ہوں ہم سے"!"

میرے جواب سے اس کی غلط فہمی خدا جانے رفع ہوئی یا بڑھ گئی، میں نے کہا، "نہیں شاہدہ ایسی کوئی بات نہیں ہے، خدا کی طرف سے ہمیں چند روزہ زندگی ملتی ہے اور یہ مختصر سی زندگی، ہزاروں حادثوں، جذبوں، کیفیتوں، اور تجربوں کا حامل ہوتی ہے، جو خوش گوار بھی ہوتے ہیں، اور ناخوشگوار بھی، یہی چیزیں انسان کو کبھی خوش کر دیتی ہیں، کبھی رنجیدہ، ———— آج کل انکم ٹیکس والوں نے پریشان کر رکھا ہے"!"

انکم ٹیکس کا ذکر، میں نے خاص طور پر ارادۃً کیا تھا، اس لیے کہ اس سلسلہ میں جاوید اور شاہدہ کے مابین جو اسکیم طے پائی تھی، اس کی کچھ بھنک مجھے مل چکی تھی،

خدا بھلا کرے، صغرا کا، وہ ایک ایک بات مجھے بتاتی تھی، اور واقعات اسے صحیح ثابت کر دیتے تھے، انکم ٹیکس کا ذکر میں نے محض ٹوہ لینے اور ٹٹولنے کے لیے کیا تھا کہ دفعتہً بلی بورے سے باہر آگئی، شاہدہ نے بہت ہمدرد بنکر کہا،

"یہ لوگ تو ہماری ساری کمائی اڑالیں گے،!"

میں نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا،

کیا کیا جائے کچھ سمجھ میں نہیں آتا، عاجز کر دیا ہے ان لوگوں نے،

جیسے دفعتہً شاہدہ کو ایک بات یاد آگئی، اس نے کہا،

"کل جاوید صاحب بھی بہت پریشانی کا اظہار کر رہے تھے، لیکن آدمی بڑے ذہین ہیں ایک بعد کی کوڑی لائے ہیں،!"

"میں نے بالکل انجان بنتے ہوئے سوال کیا، کچھ کہہ رہا تھا اس سلسلہ میں جاوید؟ اس نے واقعی معقول تجویز سوچ لی ہوگی،!"

شاہدہ مسکرانے لگی، پھر، "ابھی آئی" کہہ کر اپنے کمرہ میں گئی، اور ایک کاغذ نکال لائی، میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی،

"دیکھ لیجئے، ان کی تجویز یہ ہے،!"

تجویز کا مجھے علم تھا، پھر بھی میں نے اس کا ایک ایک حرف پڑھا، پھر شاہدہ پر ایک نظر ڈالی، وہ امید و بیم کے عالم میں میری طرف تک رہی تھی کہ دیکھا چاہیے کیا فیصلہ صادر کرتا ہوں، یہ فیصلہ اس کے مستقبل کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن زیادہ دیر تک میں نے اسے دبدھے میں نہیں رکھا، فاؤنٹن پن نکالا، اور دستخط کر کے کاغذ اس کے حوالہ کر دیا، اور کہا،

"تعجب ہے اتنی سادہ سی بات میرے ذہن میں نہیں آئی،!!"

شاہدہ وفور مسرت سے بے حال ہو رہی تھی، اس نے جلدی سے کاغذ پر قبضہ کیا

کہ کہیں میں واپس نہ لے لوں، پھر ایک برق پاش تبسم کے ساتھ گویا ہوئی،

"اب سب ٹھیک ہو جائے گا، !"

میں نے برجستہ کہا،

ہاں، ــــــــــ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری،

شاہدہ نے چونک کر مجھے دیکھا کہ ان الفاظ میں جو طنز اس نے محسوس کیا تھا، گویا اس کی تصدیق کرنا چاہتی تھی، لیکن میں نے اسے تذبذب کی حالت سے نکال دیا،

"اب دیکھوں گا انکم ٹیکس والے کیا کر لیتے ہیں، ؟"

وہ مطمئن ہو گئی، کہنے لگی،

"منہ دیکھ کر رہ جائیں گے، !"

پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی، میں نے اسے اور زیادہ خوش کر دیا،

"اب تم جانو اور انکم ٹیکس والے، !"

جس کاغذ پر میں نے دستخط کیے تھے اس کی رو سے، اب میرے بجائے شاہدہ کمپنی کی پارٹنر بن گئی تھی، میں نے اپنا حصہ دین مہر میں اس کے نام منتقل کر دیا تھا، سودہ کسی قابل وکیل نے لکھا تھا، اتنا کسا ہوا کہ کہیں سے کوئی رخنہ باقی نہیں رہا تھا، بعد میں لاکھ سر پٹکوں مگر اب میرے ہاتھ کٹ چکے تھے، مگر بیچاری شاہدہ اور جاوید کو کیا معلوم کہ میں نے خود ہی اپنے ہاتھ کاٹے تھے،

شاہدہ مجھ سے ہنس ہنس کر، اور مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی کہ جاوید آ گیا، اسے دیکھتے ہی وہ اور زیادہ خوش ہو گئی، زبان سے کچھ کہے بغیر، وہ کاغذ اس نے جاوید کی طرف بڑھا دیا، "لیجیے" !

جاوید نے، میرے دستخط دیکھے اور جیب میں رکھ لیا، "اچھا تو ندیم بھائی نے

دستخط کر دیے ،، ٹھیک ہے، اب سارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا، !"

میں نے پھر ہلکی سی چسکی لی،

" بہت اچھی طرح اور شاید امید سے زیادہ ٹھیک ہو جائے گا، !"

جاوید بھی چکر میں پڑ گیا کہ میرا یہ طنز اس پہ ہے یا محکمۂ انکم ٹیکس پر، مگر میں نے اسے بھی مطمئن کر دیا،

" اب اگر انکم ٹیکس والوں نے مجھ سے بات کی تو مزاج درست کر دوں گا، !"

جاوید نے ایک قہقہہ لگایا،

" اب کوئی کچھ نہیں پوچھے گا، !"

میں نے جاوید اور شاہدہ کو اور زیادہ مطمئن کرنے کے لیے کہا،

" لیکن یہ بات اس طرح ہونی چاہیے کہ انکم ٹیکس والوں کو ہماری نیت پہ شبہ نہ ہو، !"

" جاوید نے سوال کیا، اس کی کیا ترکیب ہے ؟ "

میں نے بتایا، اس کی ترکیب یہ ہے کہ مجھے دفتر میں آمدورفت بند کر دینی چاہیے، ویسے بھی سارے کام تم ہی کرتے ہو، میں وہاں جا کر سوائے اس کے کہ سگریٹ پیتا رہوں، یا آنے جانے والوں سے گپ شپ کرتا رہوں اور کرتا ہی کیا ہوں، شاہدہ سے تم ایک مختار نامہ پہ دستخط کرا لو، اور منیجنگ پارٹنر کی حیثیت سے تم ہی کام کرو، بینک میں بھی اطلاع دے دی جائے گی میرے بجائے چیکوں پہ شاہدہ کے دستخط ہوا کریں گے، !"

میری اس تجویز پہ جاوید پھر ٹھٹک گیا، " ندیم بھائی، بڑی معقول بات سوچی ہے آپ نے، جس وکیل نے اس معاہدہ کا جس پہ آپ نے دستخط کیے ہیں

مسودہ تیار کیا تھا، اسکی بھی یہی رائے تھی، بلکہ مختار نامہ کا مسودہ بھی، اسی نے تیار کر دیا تھا، ——————— شاید میری جیب ہی میں پڑا ہوگا، (ٹٹولتے ہوئے) دیکھئے یہ رہا، !

میں نے اسے پڑھا، پھر شاہدہ کی طرف بڑھا دیا،

"اب آپ کی باری ہے، ——— دستخط کیجئے، !

شاہدہ نے مسودہ پڑھے بغیر دستخط کر دیے، جاوید نے اعتراض کیا،

یہ ٹھیک بات نہیں، کاروبار بہرحال کاروبار ہے، بغیر پڑھے کسی کاغذ پہ دستخط مت کیا کیجئے،

شاہدہ ہنسنے لگی، "پڑھ لیا، !"

میں نے کہا، یہ احتیاطیں وہاں ہوتی ہیں، جہاں بے اعتمادی ہو، تمھارا جہاں تک تعلق ہے، بے اعتمادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، میں تو ہمیشہ سے تمھیں استاد مانتا ہوں، اور اب شاہدہ بھی ماننے لگیں گی، !"

استاد کے لفظ پہ دونوں اور خاص طور پر جاوید صاحب ذرا چونکے، لیکن بات اتنے دوستانہ اور بے تکلفانہ ماحول میں ہو رہی تھی کہ اندیشہ ہائے دور دراز کو زیادہ پنپنے کا موقع نہیں ملا،

جاوید نے مختار نامہ اسی لیے چھپا رکھا تھا کہ اگر میں کمپنی کا حصہ شاہدہ کے نام منتقل نہ کروں، تو اسے پھاڑ کر پھینک دے گا، اور کر دوں تو پھر اس پر دستخط لازمی تھے، ساتھ نہ آنے کی وجہ بھی یہ تھی کہ شاہدہ اکیلے میں زیادہ اطمینان کے ساتھ اس نازک موضوع پہ گفتگو کر سکے، بہرحال اس واقعہ نے، ہر شخص کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ اس نے دوسرے کو بے وقوف بنایا ہے، جاوید اور شاہدہ کا خیال تھا کہ ان دونوں نے مجھے بے وقوف بنایا ہے، شاہدہ سمجھ رہی تھی کہ جاوید نے

اس کے لیے بہت بڑا کارنامہ انجام دے ڈالا، اور جاوید یہ سمجھ رہا تھا کہ مختار نامہ پر دستخط کرا کے اس نے شاہدہ کو بھی بے وقوف بنا لیا!

کوٹھی کے لان میں اس وقت تین آدمی بیٹھے تھے، ——————— اور یہ تینوں بے وقوف تھے!

---

(۲۷)

چند روز بعد ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا، ناشتہ کے بعد جاوید نے کہا،

"اکبر اسٹریٹ پر ایک اچھا سا فلیٹ مل گیا ہے، سوچتا ہوں، آج یا کل وہاں منتقل ہو جاؤں، بہت دنوں تک بار بنا رہا ہوں آپ پر!"

میں نے سگرٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا، "بھئی مجھ سے کیا پوچھتے ہو، شاہدہ سے پوچھو، تمہیں یہاں لانے کے بعد، میں تو بالکل ہی بے تعلق ہو گیا، میزبانی کا سارا بار شاہدہ نے اپنے دوش نازک پر اٹھا کر مجھے اور زیادہ بے فکر کر دیا اگر تم بار بنتے تو ان پر، ویسے مجھے ان کے اخلاق سے امید تو نہیں ہے کہ آسانی سے تمہاری بات مان لیں گی، ——— کیوں شاہدہ!؟"

شاہدہ بے چینی کے ساتھ پہلو بدلتے ہوئے بولی،

"مجھ سے کیا پوچھتے ہیں، آپ دونوں دوست ہیں، خود ہی فیصلہ کر لیجئے!"

میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا، "پھر بھی تمہاری رائے کیا ہے؟ کچھ تم بھی تو کہو!"

وہ بولی، "میری رائے کا جہاں تک تعلق ہے، جاوید صاحب اگر رہیں تو سر آنکھوں پر، ان کے رہنے سے دلچسپی تھی، رونق تھی، وقت اچھا کٹ جاتا تھا، لیکن اگر جانا چاہیں تو جانے والے کو، روک کون سکا ہے'؟"

بات یہ ہے کہ جاوید میرے گھر میں رہ کر مجھ سے لڑ نہیں سکتا تھا، اور اب وقت آگیا تھا کہ لڑائی ہو، کہ بغیر اس کے اصل اسکیم بر سر نہیں ہو سکتی تھی، میں نے جاوید سے کہا، "جب شاہدہ نے اجازت دے دی تو میں بھی نہیں روک سکتا، —— کیا آج ہی چلے جاؤ گے؟"

وہ کہنے لگا، "جب جانا ہی ٹھہرا، تو کیا آج، کیا کل؟ —— آج ہی چلا جاؤں گا، مکان خالی پڑا رہے اور کرایہ چڑھتا رہے اس سے کیا فائدہ؟"

"میں نے کہا، "فائدے کا کیا سوال یہ تو سراسر نقصان ہے، اچھا بھائی تو آج ہی سہی، لیکن آتے تو رہو گے؟"

"اس نے جذباتی لہجہ میں جواب دیا، "بھلا یہ آستانہ مجھ سے چھوٹ بھی سکتا ہے'؟ روز آتا رہوں گا'!"

میں نے کہا، ہاں بھئی، روز آتے رہو، بات یہ ہے کہ دفتر میں تو میرا آنا جانا بالکل چھوٹ گیا ہے، کبھی کبھار شاہدہ چلی جاتی ہیں چیکوں پر دستخط کرنے اور انکم ٹیکس والوں کو دھوکہ دینے کے لیے، لیکن میری افتاد طبع کچھ ایسی ہے کہ جو سنگ در چھوڑا، تو پھر چھوڑ دیا، لہٰذا جب بھی ملاقات ہوگی یہیں ہوگی'!"

جاوید نے جیسے ایک بھولی بسری بات یاد دلائی، "جمخانہ کلب کے ممبر بھی تو ہیں آپ وہاں بھی ملاقات ہو سکتی ہے'!"

میں نے کہا، "کیوں نہیں ہو سکتی، لیکن گھر کی ملاقات چیز ہی کچھ اور ہے'!"

میں اسے بار بار اسی راستے پر لا رہا تھا کہ میرے گھر آنے کا سلسلہ کم نہ ہونے

پائے، کیونکہ صغرا ان گن لے کے جو کچھ معلوم کو لیتی تھی، وہ کسی اور ذریعہ سے انہیں معلوم ہو سکتا تھا، ! " اور میں نے اس کے گرد جو گھیرا ڈالا تھا، اسے تنگ کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا،

جاوید کو میری دعوت قبول کرنے کا بہانہ مل گیا، اس نے کہا، " ہاں صاحب گھر کی بات ہی اور ہے، ہر وقت نہیں بنا رہوں گا، چلئے اب تو خوش ہوئے آپ ؟ "

میں نے بظاہر بہت زیادہ خوش ہوتے ہوئے کہا، " ہاں بھئی خوش ہو گیا، تم نے جتنا مجھے خوش کیا ہے کوئی دوست مشکل ہی سے کر سکے گا، ! واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے تم بے مثال اور یکتا ہو، کیا کہنا ہے تمھارا ! "

میرے ان الفاظ میں طنز بھی تھا اور دوستانہ بے تکلفی بھی، جس کا جو جی چاہے وہ مراد لے، میں نے دیکھا، جاوید رائے قائم کر رہا ہے مگر کر نہیں سکتا کہ ان الفاظ کو طنز پہ محمول کرے، یا دوستانہ بے تکلفی پہ ؟ اس کی اس ذہنی کشمکش سے میں نے پورا لطف لیا،

پھر اس طرح جیسے بلی چوہے کو مارنے سے پہلے کھلاتی ہے، میں نے کہا " کیوں بھئی جاوید، ایک بات تو بتاؤ، ———— تمھارے دل نے یہ گوارا کیسے کر لیا کہ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ، میں روکتا نہیں اور روکوں گا بھی نہیں، بلکہ روکنے بھی نہیں دوں گا، لیکن اس سوال کا جواب ملنا چاہئے ! ———— کیا مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہے ؟ "

وہ سہم کر بولا، " خطا آپ سے ؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟ "

" میری کوئی بات ناگوار گزری ہے تمھیں ؟ "

" استغفراللہ، اول تو ایسا ہوا نہیں، اور اگر ہو تو بھی، کیا آپ کی کسی بات کو ناگوار مان سکتا ہوں ؟ آپ کے میری ذات پہ کتنے احسانات ہیں، یہ میرا دل جانتا ہے ! "

"نہیں جاوید، ایسا نہ کہو، میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، اللہ اگر کیا بھی، تو تم نے سود در سود سمیت سارا حساب چکا دیا!"

"ذرا چونک کر کہا میں نے حساب چکا دیا یہ آپ نے کیا کہا؟"

"بھئی تم نے مجھے کاروبار کے راستہ پر ڈالا، کاروبار میں نفع بھی خوب اٹھایا، میرے لیے مشغولیت کا ایک سامان پیدا کر دیا، مجھے کاروبار کے وہ گر بتائے کہ اگر میں لندن کے "اسکول آف کامرس" میں دس برس پڑھتا تو بھی ان نکتوں سے بے بہرہ رہتا جنھوں نے کاروبار کو عروج کی انتہا تک پہنچا دیا ـــــــــــ کیا یہ احسان نہیں ہے؟ کیا میں اس کا اعتراف نہ کروں؟"

"دمطمئن ہو کر کہا نہیں ندیم بھائی اس طرح کی باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجئے، میری تو جان بھی اگر آپ کے کام آجائے تو اسے فخر سمجھوں گا اپنے لیے!!"

تھوڑی دیر کے بعد، جاوید دفتر چلا گیا، میں اور شاہدہ اکیلے رہ گئے، میں نے محسوس کیا، جب تک جاوید یہاں موجود تھا، وہ مطمئن تھی، لیکن اس کے جانے کے بعد بے کل سی نظر آنے لگی، وہ اب تنہائی میں میرے پاس بیٹھتے ہوئے، کچھ ہچکچاتی تھی، نہیں گھبراتی تھی، کوئی انجانا خوف اس پر مسلط ہو جاتا تھا، یہ بے کلی بھی اس طرح کی تھی، میں نے اسے مخاطب کیا،

"کیا سوچ رہی ہو شاہدہ؟"

وہ چونک پڑی، پھر مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی،

"کچھ نہیں! ـــــــــــ"

"میں اپنی بات پر مصر رہا، میں نے کہا، "ضرور کچھ سوچ رہی ہو، کیا مجھے نہ بتاؤ گی؟ کیا میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا!"

جیسے کوئی باحیا دوشیزہ، کسی اجنبی مرد کے ساتھ تنہائی میں بیٹھے، اور باتیں کرتے

وقت ہم سی جاتی ہے، اسی طرح وہ بھی اس وقت سہاس باختہ اور مضطرب نظر آ رہی تھی، لیکن بہرحال میری بیوی تھی، میرے سامنے سے اٹھ کر بھاگ تو نہیں سکتی تھی، ایک بے بس پنچھی کی طرح لاکھ پر پھڑ پھڑائے، لیکن اڑ تو نہیں سکتی تھی، آخر بڑی مشکل سے اپنی بدحواسی پر غالب آتی ہوئی اور بات بناتی ہوئی بولی،

"کئی دن سے کچھ طبیعت کسمندی سی رہتی ہے نہ جانے کیوں؟"

میں نے فوراً ہی تجویز پیش کر دی، "چلو ڈاکٹر سلیم کو دکھا لاؤں"؟"

مسکرانے لگی، "نہیں ڈاکٹر سلیم کے ہاں جا کر کیا کروں گی؟ خود ہی ایک آدھ روز میں ٹھیک ہو جاؤں گی، بات بات پہ ڈاکٹر کے ہاں جانا مجھے پسند نہیں"!"

"اچھا بھئی تم جانو"!" ———— یہ کہہ کر میں شاہدہ سے رخصت ہو کر اپنی لائبریری میں آ گیا، راستہ میں جاوید کا کمرہ پڑتا تھا، یہاں دروازے پر ایک کاغذ کا پرزہ نظر آیا، بے ساختہ میرے ہاتھ اس تک پہنچ گئے، بڑا دلچسپ کاغذ تھا!

"جان سے پیاری شاہدہ"!"

ایک مرتبہ پھر تمہیں میری دستگیری کرنی پڑے گی، صرف پانچ ہزار اور، پھر تکلیف نہ دوں گا، کچھ ذاتی الجھنیں ایسی ہیں کہ انہیں سلجھائے بغیر میں تمہارا نہیں بن سکتا، دفتر کے حساب سے اتنی رقم لینا غیر مناسب ہے، کیا اپنے جاوید کی خاطر یہ آخری ایثار گوارا کر لو گی؟ ندیم دفتر میں بیٹھا ہے، اور ابھی کم سے کم ایک گھنٹہ اور بیٹھے گا، یہ خط میرا معتمد ملازم لے کر آ رہا ہے، اسی کے ہاتھ رقم بھیج دو، کیونکہ اس کی ضرورت آج اور ابھی ہے"!"

جان و دل سے صرف تمہارا

جاوید،

اسی خط کی پشت پر دو سطریں اور لکھی تھیں،

"روپے حاضر ہیں"!"

جان دی ——— دی ہوئی اُسی کی تھی،

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا،

آپ کے لیے کیا نہیں کر سکتی ہوں، ——— چوری تک، یہ شاید تیسری چوری ہے جو آپ کے لیے کرنی پڑی، لیکن یاد رہے، اب تجوری خالی ہو چکی ہے،

صرف آپ کی

شاہدہ،

میں نے یہ "دستاویز" بڑی احتیاط سے جیب میں رکھ لی،

لائبریری میں بظاہر میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا، لیکن، اس خط، اور جواب خط نے میرے دل و دماغ پر، وہ اشتعال انگیز اثر کیا تھا، جو آج تک کسی بات نے نہیں کیا تھا،!

اگر میں حد سے زیادہ متحمل نہ ہوتا، تو شاید اسی وقت، ساری باتوں کا فیصلہ ہو جاتا،!

لیکن، عقل مجھے مجبور کر رہی تھی کہ چند روز، صرف چند روز اور انتظار کرنا چاہیئے،!

فیصلہ کا وقت آئے گا، ضرور آئے گا، لیکن آج نہیں، ——— ——— ایک ہفتہ کے بعد، دس دن کے بعد، ممکن ہے پندرہ دن لگ جائیں، جب تک وہ وقت نہیں آ جاتا، یہ باتیں کڑوے گھونٹ کی طرح مجھے پینی پڑیں گی،

لیکن جذبات اتنے بھڑک چکے تھے کہ میں نے کچھ دیر کے لیے

کچھ دیر تک ———— گھر سے باہر چلا جانا مناسب سمجھا، !
میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا، اور شاہدہ کا آمنا سامنا ہو، !

اگر میرا، اور شاہدہ کا آمنا سامنا ہوتا تو یہ ہماری ریاضت رائیگاں ہو جاتی جس ضبط و صبر اور تحمل کا میری طرف سے مظاہرہ ہو رہا تھا، اسے اگر ریاضت شاقہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ اور میں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے میری اس ریاضت پر حرف آئے۔

---

(۲۷)

کئی دن اور گزر گئے، !

میں اپنے کام سے غافل نہ تھا، اور جو کچھ کرنا تھا اسے آج ہی کر ڈالنا تھا، ! دل میں ایک اٹل فیصلہ کر کے کئی جگہوں سے ہوتا ہوا کوئی ۹ بجے شب کے قریب گھر پہنچا، ڈرائنگ روم میں روشنی ہو رہی تھی، سب سے پہلے میرے کانوں میں ہنسی کی آواز آئی، ——— یہ شاہدہ تھی، پھر میرے پردۂ گوش سے ایک بلند آہنگ قہقہہ ٹکرایا، یہ جاوید تھا، !

میں سیدھا ڈرائنگ روم میں پہنچا، مجھے دیکھ کر دونوں سنبھل گئے، شاہدہ نے کہا، "بڑی دیر لگا دی آپ نے، کھانا بھی ٹھنڈا ہو گیا ہو گا، !" جاوید نے شکوہ کیا "بھوک سے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں، !" میں نے کہا، "میں بھی بھوکا ہوں، میں بھی پیاسا ہوں، !" یہ الفاظ کچھ ایسے تیور سے میں نے ادا کیے کہ دونوں حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے،

میں جاوید کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا، شاہدہ نے پوچھا، "کھانا منگواؤں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا، "یہ بھی اور پوچھ پوچھ، !؟"

شاہدہ نے نغمے سے کہا، صغرا سے کہدو کھانے کے لیے، !

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی، "آخر اتنی دیر تک کہاں رہے آپ؟"

میں نے مختصر سا جواب دیا، "ایک بہت ضروری کام سے گیا تھا، کوئی خاص بات تو نہیں؟ کیا میری ضرورت محسوس کر رہی تھیں تم؟"

جاوید نے اس کی طرف سے جواب دیا، "اتنی دیر تو آپ کبھی باہر نہیں رہا کرتے تھے!!"

شاہدہ کو جیسے شکایت کرنے کا موقع مل گیا، "نہ جانے کہاں کہاں گھوما کرتے ہیں، اب تو ایسا ہی ہونے لگا ہے کہ رات کا کھانا کھا کر نکل جاتے ہیں، اور پھر میرے جاگنے تک تو آتے نہیں، ——— آخر کون سی نئی مشغولیت پیدا کر لی ہے آپ نے؟"

میں نے جواب دیا، "کبھی تھیٹر چلا جاتا ہوں، کبھی سینما، کبھی کلب، کبھی کبھی مس نسیم کا گانا سننے بھی چلا جاتا ہوں ان کے عشرت کدے تک،،"

ایسی باتیں کسی دشمن سے بھی شاہدہ نے میرے بارے میں نہیں سنی تھیں، نہ کہ میں خود بیٹھا اعتراف گناہ کر رہا تھا اور وہ بھی بڑی سنجیدگی سے، وہ ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھنے لگی، پھر بولی، "نہ جانے کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں آپ!!"

جاوید کو بھی میرے اعترافات کا یقین نہیں آیا، اس نے کہا "تھیٹر اور آپ یا سینما اور جناب؟ کلب اور سرکار، مس نسیم کا عشرت کدہ اور ندیم بھائی؟ ——— ——— پھر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، اور ہنستے ہنستے بے قابو ہو گیا،

آج پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ جاوید شراب پیے ہوئے ہے، شراب کی بھبک صاف محسوس ہو رہی تھی، کم از کم شراب کی حد تک عالی ظرف تھا، کیا مجال ہے آنکھوں سے یا باتوں سے اندازہ ہو جائے کہ پیے ہوئے ہے، آج ہی میں نے محسوس کیا، یہ ہمیشہ پیتا رہا ہے، لیکن غایت درجہ احتیاط کے ساتھ،

چوری صرف آج پکڑی گئی ہے، میں نے یوں ہی فوراً چھیڑنے کے لیے مسکراتے ہوئے کہا، "معلوم ہوتا ہے شراب پی کر بیٹھے ہو!"

یہ سنتے ہی جاوید کا رنگ رُخ بدل گیا، شاہدہ کے لیے بھی شاید یہ نئی اطلاع تھی، اس کا منہ بھی سفید پڑ گیا، میں نے شہ رگ پہ حملہ کیا تھا، انکار ناممکن تھا، مجھ سے ذرا پرے ہٹتے ہوئے اس نے کہا، "کیا کروں ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق تھوڑی سی پینی ہی پڑتی ہے، لیکن بہت تھوڑی، آپ نے کبھی مجھے نشہ میں نہ دیکھا ہوگا، ؟"

میں نے جواب دیا، "نشہ میں تو پیے ہوئے بھی رہتے ہو، لیکن شراب پیے ہوئے میں نے آج ہی دیکھا ہے، مگر تعجب ہے، ہمیشہ سے پیتے ہو، مگر اقرار آج کر رہے ہو؟"

وہ نادم ہوتا ہوا بولا، "ندیم بھائی، یہ کون سی ایسی قابلِ فخر چیز تھی جس کا ڈھنڈورا پیٹتا، جانتا ہوں، بُری بات ہے، بری چیز ہے، لیکن دوا کی طرح پینے پہ مجبور ہوں، !"

میں نے ایک چٹکی اور لی، "کم از کم رخسانہ کی ایک بات تو تمہارے متعلق صحیح نکلی، خدا کرے دوسری باتیں غلط ہی نکلیں، !"

یہ سنتے ہی جاوید کا رنگ پیلا پڑ گیا، اس نے کہا "ندیم بھائی میرے سامنے اس چڑیل کا نام نہ لیجئے، !"

میں نے کہا، "اچھا اس چڑیل کا نام نہ لوں، لیکن اگر کچھ اور چڑیلوں کا بھی تم سے واسطہ رہا ہو تو کیا ان کا ذکر بھی نہ کروں ؟"

میرے یہ الفاظ، جاوید اور شاہدہ دونوں کے لیے بم کا گولہ ثابت ہوئے، جاوید کا مجرم ضمیر دہشت زدہ ہوگیا، شاہدہ کے حسنِ ظن کا قلعہ ڈگمگانے لگا، لیکن جاوید